عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں

سلمیٰ اعوان

عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں

سلمیٰ اعوان

ترتیب

1۔	نزار قبانی	شام اور دنیائے عرب کی طاقتور، توانا، انقلابی، سیاسی اور رومانوی آواز
2۔	مونا عمیدی	شام کی حساس، منفرد اور نئی سوچ کی حامل شاعرہ، کہانی کار، ترجمہ نگار
3۔	بورس پاسترک	روس کا مایہ ناز نوبل ایوارڈ یافتہ ناول نگار، شاعر، موسیقار اور ترجمہ نگار
4۔	الیگزینڈر سرگیووچ پشکن	رُوس کا قومی شاعر
5۔	لیو ٹالسٹائی اور صوفیہ ٹالسٹائی	رُوسی ادب کا دیو
6۔	دوستووسکی اور اینا دوستووسکی	رُوس کا عظیم ناول نگار
7۔	مولانا جلال الدین رومی	ترکی کا ہیرا
8۔	یونس ایمرے	ترکوں کا محبوب شاعر
9۔	رابندر ناتھ ٹیگور	برصغیر کا نوبل انعام یافتہ عظیم شاعر، موسیقار، ڈرامہ رائٹر
10۔	کرونیرتن، ابی سکارا	سری لنکا کا خوبصورت شاعر، موسیقار، براڈ کاسٹر
11۔	سعدی یوسف	عراق کا مایہ ناز انقلابی شاعر
12۔	ابونواس	عراق کا عظیم کلاسیکل شاعر
13۔	جیرٹروڈ بیل	ایک عظیم لکھاری، دلیر سیاح اور ربانی عراق

14۔ جان کیٹس — پانیوں پر لکھے ہوئے نام والا شاعر روم میں

15۔ گوزیو کاردوسی — اٹلی کا پہلا نوبل انعام یافتہ شاعر، مایہ ناز نثر اور تنقید نگار

16۔ محمود درویش — فلسطین کی انسانیت کا پیغمبر

آپ کی توجہ کی طالب

بات ماضی بعید کی ہو، ماضی کی ہو یا حال کی ۔یہ تو طے ہے کہ زمانوں سے کہیں سینکڑوں، کہیں ہزاروں اور اب لاکھوں کو چھوتی دنیا بھر میں بولی اور پڑھی لکھی جانے والی زبانوں میں کتنے چھوٹے بڑے تخلیق کار پیدا ہوئے ۔جنہوں نے اپنے ماحول، اپنی ذات کے اندر اور باہر کے احساسات وجذبات اور تجربات کی کسی نہ کسی رنگ میں عکاسی کی۔

فطرت تخلیقی جوہر کی بانٹ میں ہمیشہ سے بڑی فیاض رہی ہے۔انسان کی پیدائش کے وقت سے وہ انسان کو اپنی اس دین ،اس عنایت سے نوازتی رہی ہے ۔اس میں زمانوں اور ان میں جینے والے معاشروں کے متمدن ،ترقی یافتہ یا پھر غیر متمدن ،غیر ترقی یافتہ، جاہل اور وحشی ہونے کی کوئی تخصیص نہیں ۔صدیوں سے ہیرے کانوں سے نکلتے رہے ہیں اور صدیوں سے ہی ان کی تراش خراش اور کانٹ چھانٹ کا عمل اُس اوپر والے کی مرضی ومنشا اور مخلوق کے کچھ اپنے رنگ ڈھنگ سے جاری وساری ہے۔تاریخ ایسے کرداروں سے بھری پڑی ہے۔

اب ایسے میں مجھ جیسی پرتو وہ ہی مثال صادق آتی ہے نا کہ کیاپدی اور کیاپدی کا شوربہ۔کیا میں اور کیا میری لکھنے کی اوقات اور کاوش۔پر کرتی کیا۔چھوٹا سا قلم تو اُس نے ہاتھ میں پکڑایا تھا اور ساتھ تھوڑے سے سفر بھی مقدر کر دیئے۔جب اُن اجنبی زمینوں پر گئی تو جانی کہ کیسے کیسے لعل وگوہر ان دھرتیوں نے ماضی قریب کے زمانوں میں پیدا کیے۔انہیں پروان چڑھایا۔دنیا کو اُن کی خوشبو سے مہکایا اور پھر کہیں اپنے اندر جذب کیا یا پھر کسی دوسری مٹی کو یہ اعزاز بخش دیا کہ وہ انہیں سنبھالیں۔

ہاں یہ بھی آپ سے کہنا ہے کہ میں ماضی کے چکروں میں نہیں پڑی سوائے دو تین

کے۔ بھئی اتنا سا بندہ اور وہ اس بحرِ بیکراں میں کیسے کود پڑے؟ جان سے ہی جائے گا نا۔ بس اپنے وقت کے قریب ہی رہی۔

اب یہ جن اور دیو سامنے ہیں۔ سچی بات ہے پنجابی زبان کی وہ کہاوت یاد آرہی ہے۔ پلّے نہ سیر آٹا تے گاوندی دا سنگھ پاٹا۔ تاہم اتنا سا کہنا ہے کہ میں نے اِن قد آور شخصیات کی بس ایک ہلکی سی جھلک ہی آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ اُن کے فن کے دریاؤں میں سے بس کنارے پر کھڑے چلّو بھر پانی نکال کر ہی اپنے اوپر ڈالا ہے۔ اللہ کرے میری یہ کاوش آپ کو پسند آجائے۔ تب سمجھوں گی کہ محنت وصول ہوگئی۔

سلمٰی اعوان

www.salmaawan.com

salma.awan@hotmail.com

اُن اجنبی سرزمینوں کے نام جنہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور اپنے
لعل و گوہر سے میرا تعارف کروایا۔

نزار قبانی

شام ، دنیائے عرب کی طاقتور ، توانا ، انقلابی اور رومانوی آواز

- شام، دنیائے عرب، بیسویں صدی اور عربی ادب کی ایک بے حد توانا، انقلابی، سیاسی اور رومانوی آواز نزار قبانی۔
- اس کی شاعری کے پہلے مجموعے قالت لی السمراء نے شام میں زلزلے جیسی کیفیت پیدا کردی تھی۔
- اے میرے غم زدہ وطن۔ بس ایک پل میں تو نے محبت کی نظمیں لکھنے والے شاعر کے ہاتھ میں خنجر تھما دیا ہے۔
- دہشت گردی پر اُس کی شہرہ آفاق سیاسی نظم دراصل اُن ملکوں کے منہ پر طمانچہ ہے جو دہشت گردی کی آڑ میں ملکوں پر تسلط جماتے اور معصوم لوگوں کو خون میں نہلاتے ہیں۔
- شاعری میں اُس کی چونتیس کتابوں کے علاوہ نثر میں بھی اس کا بڑا ٹھوس کام ہے۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں مطلق العنانی ہے

جہاں دانشوروں کو تختہ دار پر لٹکایا جاتا ہے

جہاں لکھاری بے دین، منکر اور مرتد سمجھے جاتے ہیں

جہاں کتابیں جلائی جاتی ہیں

جہاں سوال کرنا گناہ ہے

جہاں معاشروں میں رواداری اور برداشت نہیں

جہاں طاقت زبان اور سوچ پر پہرے لگاتی ہے

مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے بچوں کو یہ سکھاؤں

خدا نے انسانی روح اور جسم کو قتل سے منع کیا ہے

کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ دوسرے مسلمان کو ڈرائے دھمکائے اور قتل کرے

کیا آپ مجھے اجازت دیں گے

کہ میں اپنے بچوں کو بتاؤں

خدا عظیم ہے اور اس کے معیار مختلف ہیں

ان سے

جو مذہب کے تاجر ہیں

اور خدا کی جواب طلبی میں مہربانی ہے

اور وہ بہت رحیم اور کریم ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نزار قبانی

نزار قبانی سے میری پہلی شناسائی قاہرہ کی رعمیس سٹریٹ کی ایک بک شاپ پر ہوئی۔ باہر ہواؤں میں بہت تیزی اور خنکی تھی۔ قاہرہ کا آسمان بادلوں سے ڈھکا پڑا تھا اور اندر میں کتابوں کو دیکھنے اور اُن کی پھولا پھرولی میں مگن تھی۔ جب میں نے باہر سے کتابوں کے بنڈل اندر آتے دیکھے۔

یہ نجیب محفوظ کی ”ثرثرہ فوق النیل“ اور ”قالت لی السمراء“ نزار قبانی کی تھیں۔ اول الذکر نوبل انعام یافتہ نثر کی کتاب اور موخر الذکر شاعری کا مجموعہ تھی۔

کتاب ہاتھوں میں لی تو مالک جس نے مجھے پاکستانی جان کر خصوصی شفقت کا برتاؤ کیا تھا نے اِس پر نظر پڑتے ہی لطف ومحبت وسرشاری سے کہا۔

”ارے نزار قبانی کا مجموعہ کلام۔ کیا شاعر تھا۔ عرب دنیا کا عظیم انقلابی شاعر“۔

میں نے انگریزی ترجمے کا پوچھا۔ مالک نے ملازموں سے کہا۔ مگر اُن کی جانچ

پڑتال کے بعد پتہ چلا کہ ختم ہو گیا ہے۔

بہر حال میری لگن اور کوشش کچھ کام نہ آئی۔ کتاب مجھے اسکندریہ سے بھی نہ ملی۔

تاہم نیٹ سے "The Brunette told me" شام کے اس شاعر سے میرا پہلا تعارف روایات سے باغی اور رومانوی شاعر کے طور پر ہوا۔

اب کوئی تین سال بعد جب شام کی سیاحت کیلئے آئی ہوں۔ پہلے ہی دن ٹیکسی ڈرائیور نے اس کا گیت لگا کر اور مجھے بتا کر میری بھولی بسری یادوں کو تازہ کرنے کا سامان کر دیا۔ واہ کیا حسین اتفاق ہے۔ گیت سے میں نے لطف اٹھایا تھا۔

میری خاتون میں دوسرے چاہنے والوں کے ساتھ
اپنا مقابلہ نہیں کرتا مگر
اگر دوسرا تمہیں بادل دیتا ہے
تو میں تمہیں بارش دوں گا
اگر وہ تمہیں لالٹین دیتا ہے
میں تمہیں چاند دوں گا
وہ تمہیں اگر شاخیں دیتا ہے
تو میں تمہیں درخت دوں گا
اگر وہ تمہیں بحری جہاز دیتا ہے
تو میں تمہیں سفروں پہ لے جاؤں گا

شام کو زنبیہ واپس جاتے اور آج صبح پرانے دمشق آتے ہوئے شاعر سے مزید متعارف ہوئی۔

اس عظیم شاعر سے تفصیلی تعارف دمشق میں اس لڑکے کے توسط سے ہوا جو احمد

فاضل تھا اور مجھے دمشق سٹیڈیل Damascus Citadial کے میرے شہر لاہور کے دلی دروازے جیسی مشابہت رکھنے والے گلیارے میں ملا تھا۔محبت اور خلوص سے بھرا ہوا لڑکا۔میں اس دیوہیکل سے گلیارے کے ساتھ فٹ پاتھ پر کتابیں بکھیرے کھڑے بوڑھے شامی کے پاس رک کر کتابوں کو دیکھنے لگی کہ ناگہاں بھاگ دوڑ، سیٹیوں کی آوازیں، شور و غل نے حیرت زدہ کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے پر مجبور کیا۔

سامنے قدیم مگر شکستہ عمارتوں کی چھتوں پر لکن میٹی یا چور سپاہی کا کھیل جاری تھا۔ فائرنگ کا بڑا کھلا ڈلا تبادلہ ہو رہا تھا۔لوگ دائیں بائیں پناہ گاہوں کی تلاش میں تھے۔پہلے میں نے وہیں بیٹھے رہنے سے چمٹنا چاہا۔مگر وہاں پولیس کے کچھ لوگ آ گئے تھے۔ماحول میں عجیب سی دہشت اور سنسنی پھیل گئی تھی۔مجھے محسوس ہوا تھا کہ جہاں بیٹھی ہوں وہ جگہ تو سیدھی نشانے پر ہے۔

"چلو اگر دیس میں بچت ہو گئی تو اب یہاں مرنے کے لیے آ گئی ہوں۔"

اُٹھ کر بھاگی۔مگر فوراً ہی پلٹ آئی کہ لوگ گلیارے کے اندر پناہ گزین ہو رہے تھے۔میں بھی ڈری سہمی سی ان کے ساتھ وہیں گھس گئی۔اور یہیں اُس بے حد پیارے سے لڑکے سے ملاقات ہوئی جس کا نام احمد فاضل تھا۔جو انگریزی بہت اچھی بول سکتا تھا۔بینک میں ملازمت کا ابھی آغاز ہی کیا تھا۔اِس واقعے بارے بتایا کہ چوری ڈکیتی کا کوئی کیس ہو گا۔ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔کوئی فکر کی بات نہیں۔

آج لکھتے ہوئے سوچ رہی ہوں۔تب یہ کہیں معلوم تھا کہ یہاں چند ہی سالوں بعد قیامتیں ٹوٹنے والی ہیں۔یہ خوبصورت تہذیب و تمدن کا گہوارہ پر امن سا ملک بیرونی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں، اُن کے پروردہ غنڈوں پہلے القاعدہ بعد ازاں داعش کے ہاتھوں پور پور زخمی ہونے والا ہے۔

اس وقت اس چھوٹے سے واقعے نے ماحول کو ہراساں اور خوف زدہ کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی جیسے فلم کے کسی سین کی طرح سب کچھ غائب ہو گیا۔ لوگ باگ اپنے اپنے راستوں پر ہو لئے۔ تاہم میرا احمد فاضل سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ جس سے باتوں کا سلسلہ پھیلتے پھیلتے نزار قبانی تک چلا گیا۔ میری اُس سے محبت اور لگن دیکھ کر اس نے پیش کش کی وہ مجھے اپنے دوست جس نے نزار قبانی پر پی ایچ ڈی کی ہے ملانے لے جا سکتا ہے اگر میرے پاس وقت ہو تو۔ اس کا گھر یہیں پرانے دمشق میں ہی ہے۔

جی چاہتا تھا اُٹھ کے کی بلائیں لوں۔ لو بھئی یہ تو موجیں ہو گئیں۔

''میرے بچے میں تو تمہاری حد درجہ شکر گزار ہوں گی۔''

اُس نے اسی وقت فون ملایا۔ میری خوش قسمتی کہ فوراً رابطہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر دونوں میں بات ہوتی رہی۔ پھر موبائل بند کرتے ہوئے وہ میری طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

''زکریا محمد کبرت Kibrit اس وقت دمشق یونیورسٹی میں ہے۔ وہاں وہ پڑھاتا ہے۔ تھوڑی دیر تک گھر پہنچے گا۔ اگر آپ پسند کریں تو یہ وقت ان کے اہل خانہ کے ساتھ گزار سکتی ہیں۔

''ہائے کیسا بھاگوان دن ہے۔ کیسی خوبصورت پیشکش سے ابتدا ہوئی ہے۔ خدا بہت مہربان ہے اور یہ عنایت اس کا خاص الخاص تحفہ ہے کہ کسی مقامی گھر جانا اور وہاں کی تہذیبی زندگی کی جھلکیاں دیکھنا بھی تو لکھنے لکھانے کے لئے اہم ہے۔''

قدموں میں تیزی، دل میں خوشی و مسرت کا جل ترنگ اور نگاہوں میں دائیں بائیں اور ماحول کو دیکھنے اور جذب کرنے کی آتش شوق کا الاؤ۔ چمکتی دھوپ بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے میں نے اوپر والے کا شکریہ ادا کیا۔

تاہم جب میں راستے کے پُرسحر منظروں پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھتی

تھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرے دل کا حال بند پنجرے میں قید کسی نئے نویلے پرندے کے پھڑ پھڑانے جیسا ہی تھا کہ رومن کالموں اور امیہ مسجد کے پاس سے گزرتے بس ایک طائرانہ سی نظر ان پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جانا کیسا روح فرسا سا تھا۔ دل پاگل تو وہیں بیٹھنے اور ڈیرے ڈالنے کا خواہش مند تھا۔ پیاسی آنکھیں بھی ان کمال کے منظروں سے سیر ہونے کے لئے بیتاب تھیں۔ میں نے دونوں کی دلداری کی۔

احمد فاضل دو بار غلط گلیوں میں گھس گیا۔ اس کے سرعت سے پلٹنے اور میرے سُستی سے قدم اٹھانے میں میری نظر بندی ہی کے چکر تھے۔ طارق بن زیاد سٹریٹ پر کہیں آگے جا کر گھر تھا۔

گھر کچھ اُس محاورے کا عکاس تھا کہ صورت کے نہیں سیرت کے ہم غلام ہیں۔ مرکزی دروازے کا گیٹ چوبی تھا۔ ڈیزائن سے گھٹا ہوا۔ دو منزلہ گھر کی بالکونیاں چوبی تھیں۔ عام سی جسامت والے ستون بھی غالباً چوبی ہی تھے۔ ہمارے ہاں کی طرح بالکونیوں کے چھجے بڑے خوبصورت اور ڈیزائن دار تھے۔ بیل کی آواز پر دروازے کی چھوٹی کھڑکی کھلی جس میں سے جھک کر اندر داخل ہونا پڑا۔ یقیناً گھر میں اطلاع تھی کہ ایک نوعمر لڑکے نے احمد فاضل کو نشست گاہ کا راستہ دکھایا تھا۔

نشست گاہ یا گھر کا ڈرائنگ روم عربی کلچر میں دیوان مستطیل سی صورت کا تھا۔ گھر کے اندر ڈیوڑھی اور باہر کھلنے والے دروازوں اور کھڑکیوں کی پیشانیوں پر محرابی صورت بنی پٹی آرٹ کی میناکاری سے سجی کمرے کو انفرادیت دیتی تھی۔ چھت اونچی اور دو دیواروں میں بلندی کی سطح پر لمبوتری سی چار کھڑکیاں روشن دانوں کی طرز پر شیشوں سے روشنی آنے کا باعث تھیں۔ صوفے کا ایک سیٹ جدید وضع اور دوسرا قدیمی صورت لئے ہوئے تھا۔ کمرے میں دو الماریاں تھیں اور دونوں کے پٹ گتھی چوبی کندہ کاری سے مزین تھے۔

ابھی میں کمرے کے جائزے میں مصروف ہی تھی کہ جب کبرت اندر داخل ہوا۔

زکریا محمد کبرت اونچا لمبا خوبصورت نوجوان تھا۔محبت سے ملا۔ میں نے اُس کی چھاتی پر بوسہ دیا۔

میرے عین سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اُس نے میرا حال احوال پوچھا۔ پاکستان کے بارے مختصراً بات ہوئی۔پھر گفتگو کا رخ اپنے موضوع پر آ گیا۔اُس کے ایک سوال پر میں نے بے اختیار ہی کہا۔

''کبرت سچی بات ہے میں بڑی جذباتی سی کیفیت میں خود کو ڈوبا ہوا محسوس کرتی ہوں۔ڈیڑھ دن نے ہی مجھے بتا دیا ہے کہ شاعرِ دمشق کی ہر ٹیکسی، گاڑی میں گھسا بیٹھا ہے۔ ہر دل میں دھڑک رہا ہے۔ہر لب پر مچل رہا ہے۔ہم جیسے سیاح جنہیں عربی کی پوری سمجھ نہیں پوچھنے پر جانتے ہیں اور جب جذبات میں مانوسیت کے رنگ گھلتے ہیں تو مزہ آتا ہے۔''

زکریا محمد کبرت کھلکھلا کر ہنسا اور بولا۔

''آپ تو داستان گوئی میں بڑی ماہر لگتی ہیں۔''

میں ہنسی اور بولی۔

''لکھنے والی ہوں نا کبرت۔''

بیسویں صدی کی عرب دنیا میں ایک بھی ایسا نایاب ہیرا نہیں جس نے عربی شاعری کو اتنی جدت اور توانائی دی۔عورت کی محبت، اُس کے حسن، اس کے جسم کو موضوعِ سخن بنانے کی شاعرانہ روایت تو خیر صدیوں پرانی ہے۔مگر اسے اس کی ذات کے ادراک سے آگاہی دینا شاعر کا عزم تھا۔جوشیلی آگ کی مانند بھڑکتی اُس کی شاعری نے مسلسل ملکی، عرب دنیا اور اقوامِ عالم کے طاقتور لیڈروں کو تختۂ مشق بنایا۔

پیدائش پرانے دمشق میں ہوئی۔سال 1923ء اور پورا نام نزار توفیق قبانی تھا۔ خاندان کا تعلق ترکی کے مشہور شہر قونیہ سے اور خاندانی نام اک بیک(Ak Biyik) تھا۔ترکی زبان میں اس کا مطلب "ترکس کی مونچھ" ہے۔

دو بہنوں اور تین بھائیوں پر مشتمل یہ گھرانہ روایات کا اسیر ہونے کے ساتھ ساتھ انقلابی بھی تھا۔قبانی شامی تھا جبکہ ماں ترکی نژاد۔چاکلیٹ فیکٹری کا مالک باپ توفیق قبانی شام پر فرانسیسی تسلط کے خلاف لڑنے والوں کو نہ صرف اخلاقی بلکہ مالی مدد بھی کرتا تھا۔ یوں حکام کی نظروں میں رہتا تھا۔اکثر جیل بھی بھیجا جاتا۔

آبائی گھر میتھنہ ال شام Milthnah Alshahm میں تھا۔پرانے دمشق کے ہمسائے میں۔تعلیم بھی دمشق میں ہی ہوئی۔قانون کی تعلیم بھی دمشق یونیورسٹی سے حاصل کی جو کہ پہلے سیریا یونیورسٹی کے نام سے مشہور تھی۔

روایت سے بغاوت کا عنصر اس کے خمیر میں بچپن سے ہی تھا۔اس کا واضح عملی اظہار پندرہ سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔دس سالہ بڑی بہن "وصال" نے خودکشی کر لی تھی کہ وہ جس سے محبت کرتی تھی اُس سے شادی کی اجازت نہیں ملی۔چھوٹی بہن حیفہ کے گالوں پر زار زار بہتے آنسوؤں کو اُس نے اپنی پوروں سے صاف کیا اور بولا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں حیفہ تمہارے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔"

اولڈ دمشق کی گلیوں میں جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُس نے اپنے دوستوں سے کہا تھا۔

"میں اِن رسوم کے خلاف آواز اٹھاؤں گا۔میں شاعر بنوں گا۔عرب دنیا میں محبت کرنا جرم ہے۔عرب روح ایک بڑے سے قید خانے میں بند ہے میں اسے آزاد کروں گا۔"

اور اُس نے واقعی جو کہا تھا سچ کر دکھایا تھا۔

جب وہ ابھی کالج سٹوڈنٹ تھا اُس نے شعر کہنے شروع کر دیئے تھے اور پہلا مجموعہ بھی مرتب کر لیا۔ قالت لی السمراء The Brunette told me (براؤن بالوں والی گوری عورت نے مجھ سے کہا) یہ رومان اور جنس سے بھری شاعری تھی۔ایسی شاعری جس نے عورت کو اس تنگ نظر معاشرے کی گھٹن زدہ حالت کا احساس دلانے اور اسے اپنے لیے آواز اٹھانے کے حق سے متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ شام جیسے پرانے قدامت پسند ملک میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

یہ شاعری سوچ میں بنیادی تبدیلیوں کی عکاس تھی۔یہاں عورت مرکزی تقسیم کے طور پر نمایاں ہوئی تھی۔اس مجموعے نے بہت سارے مسائل پر قلم اٹھایا تھا۔مرد عورت کے تعلقات پر ہر زاویہ اور ہر رخ سے روشنی پڑی۔انسانی اور سماجی رویے،مذہب کی اندھی تقلید اور انسانی سوچ کی آزادی،بے باکی،معاشرے میں مرد اور عورت کا صحت مند تعلق اس کے بڑے موضوع تھے۔اس مجموعے کی ملک میں شدید مخالفت ہوئی۔یہ نظم پڑھیئے اور رتب کے مرد غالب معاشرے کے غصے اور اشتعال کا اندازہ لگایئے۔

تمہیں بدلنے کی میرے پاس طاقت اور اختیار نہیں
نہ ہی تمہارے طور طریقوں کے لئے وضاحت کی
کبھی مت سوچو کہ مرد عورت کو بدل سکتا ہے
جو ایسا کہتے ہیں وہ دغاباز ہیں
جو سوچتے ہیں
کہ انہوں نے عورت تخلیق کی
اپنی پسلیوں میں ایک سے

عورت مرد کی پسلی سے نہیں نکلی

کبھی نہیں

یہ وہ ہے جو اس کے رحم سے نکلا ہے

اُس مچھلی کی طرح جو پانیوں کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے

یہ وہ ہے جو اس کی آنکھوں کی روشنی کے دائروں میں

خود کو وہاں رکھنے کے خواب دیکھتا ہے

ایک اور جگہ دیکھیئے۔ اس کی سوچ کی گہرائی اور تجربے کا کیسا دلآویز اظہار، عورت کو بیدار کرنے کی خوبصورت کاوش اور عام فہم زبان اور قاری کو اپنے ساتھ لپٹا لینے کا فن۔

بہت گہری محبت مت کر

جب تک کہ تمہیں یقین نہ ہو جائے

کہ دوسرا ابھی تمہیں اسی گہرائی سے

پیار کرتا ہے

آج تمہاری محبت کی گہرائی

کل تمہارے زخم کا باعث بنے گی

اُس کی محبت کے جذبات سے لبریز نظموں نے اب سماں باندھ دیا تھا۔

میرا محبوب مجھ سے پوچھتا ہے

کہ میرے اور آسمان کے درمیان کیا فرق ہے

میرے محبوب فرق تو صرف یہی ہے

جب تم ہنستے ہو میں آسمان کو بھول جاتا ہوں

ذرا اسے سنیئے۔

چاند کو دیکھنا مجھے بہت پسند ہے

خاص طور پر تب

جب یہ ہلال کی صورت ہو

کیونکہ میں ہر اُس چیز سے پیار کرتا ہوں

جس کا کوئی مستقبل ہو

قبانی نے عورت کے متعلق جس انداز میں سوچا اور لکھا۔ ایسا پہلے بہت کم لکھا گیا۔ اس کی باغی سوچ نے عورت کو نئے راستوں اور نئی سوچوں سے آگاہ کیا۔ ریت روایت اور رواج میں لپٹی عورت کو اس نے اہمیت دی اور اُسے اس کے ہونے کا بھرپور احساس دلایا۔

اے میری محبت، اے میرے پیار

اگر تم میرے پاگل پن کے لیول پر آجاتیں

تم اپنے زیورات پھینک دیتیں

اپنے بریسلٹ بیچ دیتیں

اور میری آنکھوں میں سو جاتیں

ایک اور جگہ دیکھیے۔

کبھی ایک ایسی عورت سے ناطہ نہ توڑو

جو تمہاری بہت سی خامیوں کو جانتی ہے

اور پھر بھی تم سے پیار کرتی ہے

یہاں دیکھیے اس کا ایک اور منفرد انداز

وہ سب کتابیں لے لو

جو میں نے اپنے بچپن میں پڑھیں

میری نوٹ بکس بھی لے لو

لے لو میرے سارے چاک

اور سارے قلم بھی لے لو

اور تختہ سیاہ بھی

بس مجھے ایک نیا لفظ سکھا دو

جو کان کی بالی کی مانند جھولے

میری محبوبہ کے کانوں میں

اُس وقت ملک چونکہ فرانس کے زیر تسلط تھا۔ تاہم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں نے اسے بہت سراہا۔ ان سراہنے والوں میں ایک بڑا نام اُس وقت کے وزیر تعلیم کا تھا جو ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ملک کا ایک بڑا قومی لیڈر بھی تھا۔

چونکہ تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ دمشق کا سوداگر گھرانہ۔ اس لئے نہ مخالفت کی پرواہ تھی اور نہ موافقت نے کوئی اثر ڈالا۔ قانون کی تعلیم مکمل ہونے پر وہ وزارت خارجہ سے منسلک ہو گیا۔

1946ء میں شام فرانس کی غلامی سے بھی آزاد ہو گیا۔ کلچرل اتاشی کے طور پر وہ بیروت، قاہرہ، لندن، استنبول اور میڈرڈ وغیرہ کے ممالک میں سفارت کاری کے فرائض سرانجام دینے لگا۔ ڈپلومیٹک کیریئر نے اُس کے ذہنی افق کو بہت وسعت دی۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ نے شاعر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ شاعر جس نے 1956ء میں اپنی نظموں میں عام فوجیوں کو سراہا تھا۔ باوجودیکہ مصر جنگ ہارا تھا مگر اس نے

جنگ ہارنے کے باوجود جیت لی تھی۔لوگ خوش تھے۔ناصر کیلئے محبت کا طوفان تھا۔مگر 1967ء کی چھ روزہ جنگ شاعر کے اعصاب پر بجلی بن کر گری تھی۔

''دھوامش علی دفتر النکبتہ'' کے عنوان سے اُسنے اپنا کلیجہ نکال کر گلیوں بازاروں میں پھینک دیا تھا۔

اے میرے غم زدہ وطن
بس ایک لمحے میں
تو نے محبت کی نظمیں لکھنے والے شاعر کے ہاتھ میں
خنجر تھما دیا ہے

ذرا اِن اشعار کے اندر جھانکیے۔

ہم اپنے آباء کے دامن پر داغ ہیں
ہمارے صحراؤں کا تیل
آگ اور شعلوں کا خنجر بن سکتا تھا
مگر
ہمارا تیل فاحشاؤں کے قدموں میں پڑا ہے

بیس بندوں پر مشتمل اس طویل نظم جسے عرب قیادت کے لتے لیے۔جمال عبدالناصر کو رگیدا۔سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے اُسے لعن طعن کیا۔خفیہ پولیس،حکومتوں کے کارپردازوں کو صیغہ جمع متکلم ہم یعنی ذات کے دائرے میں گھسیٹتے ہوئے تنقید کی سان پر چڑھایا۔ذرا دیکھیے تو

اب اگر آسمانوں نے تمہاری ضمانت نہیں دی
تو اُسے کوسومت

حالات کو بھی لعن طعن مت کرو

خدا انہیں فتح دیتا ہے جنہیں وہ چاہتا ہے

خدا کوئی ہتھیار گھڑنے والا لوہار تو نہیں

یاد رکھو

جنگیں کبھی جیتی نہیں جاتی

طاؤس و رباب کے ساتھ

ہمارے دشمن ہماری سرحدوں میں رینگ کر نہیں آئے

وہ تو چیونٹیوں کی طرح

ہماری کمزوریوں کے ذریعے آئے ہیں

ذرا اور دیکھیے شاعر نے کیسے کلیجہ چیر دیا ہے۔

اگر اتفاق و اتحاد کو ہم دفن نہ کر چکے ہوتے

اس کے نوخیز بدن میں سنگین نہ اُتار چکے ہوتے

اور اگر اتحاد باقی ہوتا

تو دشمن یوں ہمارے خون سے ہولی نہ کھیلتا

ایک طوفانی نظم عرب دنیا میں ہواؤں کے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہر جگہ پہنچی اور ہر زبان پر تھرکی۔ حتیٰ کہ لوگ حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے کرتے اچانک ایک دوسرے سے کہتے۔

"ارے تم نے نظار قبانی کی نظم پڑھی۔"

طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا مصری حکومت نے ان کی تمام کتابوں کو بین کر دیا تھا۔ وہ تمام نظمیں جنہیں ام کلثوم نے گائی تھی جلا دی گئیں۔ جمال عبدالناصر سخت مشتعل تھا۔ شاعر

کے مصر میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ اردن کا اصرار تھا کہ قبانی پر مقدمہ چلایا جائے۔
کہیں دایاں بازو نکتہ چینی کر رہا تھا کہیں بایاں بازو۔ مگر شاعر کو کچھ پروا نہیں تھی۔
وہ اگر نشتر چلا رہا تھا تو ساتھ ہی مایوس لوگوں کے زخموں پر پھاہے رکھ رہا تھا۔ وہ ان کی دلی
کیفیات کی عکاسی کرتے ہوئے انہیں آس اور امید کی روشنی کا پیغام دے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا
مایوسی بے عملی پیدا کرتی ہے یا بے ادراک تشدد۔ اُس کی نظمیں نئی نسل سے مخاطب تھیں۔

ہمیں ایک ایسی ناراض نسل چاہیے
جو جوش وجذبے سے معمور ہو
جو آسمان میں تہلکہ مچانے پر قادر ہو
جو تاریخ کی بنیادوں کو ہلا دے
ہمیں ایک نئی نسل کی ضرورت ہے
جو غلطیوں کو برداشت نہ کرے
جو گھٹنوں کے بل نہ جُھکے
ہمیں جنوں جیسی نسل چاہیے
جو ہماری شکست پر غالب آسکے

عرب بچو
ساون کے قطرو
ہمارے بارے مت پڑھو
ہمارے نقشِ قدم پر مت چلو
ہم دغاباز اور تماشا گروں کی قوم ہیں

عرب بچو

آنے والے کل کو بتا دو

تم ہماری زنجیریں توڑ ڈالو گے

لکھنے پڑھنے کی نصف صدی پر پھیلا اُسکا کام شاعری کی چونتیس کتابوں کے علاوہ نثر میں بڑے اہم اور ٹھوس موضاعات پر ہوا، اخباروں میں مضامین کے ساتھ "الحیات" اخبار میں کالم نگاری بھی کی۔ پہلے بیروت میں ذاتی پبلشنگ ہاوس قائم کیا۔ پھر اُس کی شاخ لندن میں بھی قائم ہوئی۔ اُس کی زیادہ تر کتابیں یہیں سے چھپیں۔

شاعر نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی اس کی کزن تھی زہرہ اک بیک۔ ایک بیٹی حد بہ اور ایک بیٹا توفیق جو صرف بائیس سال کی عمر میں لندن میں ہارٹ اٹیک میں چل بسا بیٹے کی موت پر اُس کی نظم "دمشق کا چاند" بھی ایک شاہکار تھی۔

دوسری شادی اُسنے ایک عراقی ٹیچر بلقیس الروی سے کی جو اُسے بغداد کے ایک مشاعرے میں ملی تھی۔ بلقیس سے اُسے بہت محبت تھی۔ نظار قبانی بیروت میں تھا۔ یہ 1881ء کا زمانہ تھا جب لبنان سول وار کی لپیٹ میں تھا۔ وہ تو اخبار لینے کیلئے گھر سے نکلا جب عراقی سفارت خانے پر بم بلاسٹ ہوا۔ سفارت خانے سے قریب تر ہونے کی وجہ سے اُسکا گھر متاثر ہوا اور بلقیس تو عین موقع پر ہی دم توڑ گئی۔ یہ اُس کیلئے بہت بڑا صدمہ تھا۔ وہ بکھر گیا تھا۔ بلقیس سے اُسے بہت پیار تھا۔ اُس کی موت پر اُسنے جو شاعری کی وہ مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

کہیں اس نے بلقیس کو بابل کی ملکہ سے مخاطب کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ کہیں نینوا کی لچکیلی شاخ کہا۔ کہیں عراقی بلند ترین پام کے بوٹے سے تشبیہ دی۔ کہیں وہ کوئین اف شیبا تھی، کہیں میری بلونڈ جیسی۔ کہیں دجلہ کی کوئی نشیلی لہر، بہار کا پھول،

حسین میکلس، کہیں باوقار چال کے سلسلے موری اور افریقہ کی مادہ بارہ سنگا سے جڑتے۔
عرب کی ساری جغرافیائی اور ثقافتی تاریخ سے تشبیہوں اور استعاروں کے ڈھیر
لگاتے ہوئے اُس نے لکھا۔

شکریہ۔شکریہ میری بلقیس کو مارنے کا شکریہ
اب جاؤ اور جام نوش کرو
شہید کی قبر کنارے
میری نظم بھی قتل ہوگئی

اپنی محبت اور غم و درد کے سمندر میں اُتر کر اُسنے اپنے قاری کو کس کس انداز میں
اپنے احساسات میں شریک کیا۔

صرف چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

بلقیس

تم کیسے میرے شب و روز
اور میرے خوابوں کو اپنے ساتھ لے گئیں
تم نے سب خوبصورتیوں
اور سب موسموں سے کنارہ کشی کر لی
او میری زندگی میری جان، میرا پیار
میری نظمیں اور میری آنکھوں کی بصارت
تم نے کیسے مجھے چھوڑ دیا
ایک لفظ کہے بغیر

اس کے جذبات کے بہاؤ کو مثالوں کے احاطے میں لانا کتنا دشوار ہے۔ایک اور

جگہ اس اظہار کا رنگ دیکھیے۔

بلقیس تم میرا درد ہو
وہ درد جو نظم لکھتے ہوئے
مجھے اپنے دل اور انگوٹھے
میں محسوس ہوتا ہے

طوفان اٹھانے والی اُس کی ایک نظم ''کیا آپ مجھے اجازت دیں گے'' ہے۔ جس میں شاعر نے سُلجھے ہوئے خوبصورت انداز میں مذہب، ملا، خدا، معاشرے پر تنقید کی۔ نیم خواندہ مذہبی لوگوں نے کیسے ایک خوبصورت مذہب کو بے روح پریکٹس اور تنگ نظری کا مرقع بنادیا ہے۔ ذرا دیکھیے شاعر کا انداز۔

اگر ہم
اپنی دھرتی
اور حرمت خاک کی حفاظت کریں
اگر ہم
اپنے لوگوں سے ہونیوالی زیادتی
اپنے آپ سے ہونے والی زیادتی کے خلاف
بغاوت کریں
اگر ہم
اپنے صحراؤں میں کھڑے کھجور کے آخری درختوں کی حفاظت کریں
اپنے آسمان میں بچے آخری ستاروں کی حفاظت کریں
اپنی ناموس کے آخری حروف تہجی کی حفاظت کریں

اپنے ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کے آخری
قطروں کی حفاظت کریں
اگر یہی ہمارا گناہ ہے تو
واللہ کتنی خوب صورت ہے دہشت گردی؟
کیا آپ مجھے اجازت دیں گے
کہ میں اپنے بچوں کو بتاؤں
خدا عظیم ہے اور اس کے معیار مختلف ہیں
ان سے
جو مذہب کے تاجر ہیں
اور خدا کی جواب طلبی میں مہربانی ہے
اور وہ بہت رحیم و کریم ہے

''اوریروشلم'' اُس کی ایک ایسی نظم ہے جو اُس کے اندر کے دکھ کی عکاس ہے۔ جو مذاہب کے ٹھیکے داروں کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ جو ایک پکار ہے۔ ظلم کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ دکھ بھرا سوال ہے۔

اوریروشلم
افسردگیوں کے شہر تم ایسے ہو
جیسے آنکھ میں تیرتا پھرتا ایک بڑا آنسو
غصے اور اشتعال پر کون قابو پائے گا
تم جو مذاہب کے قیمتی موتی ہو
تمہاری خون آلود دیواریں کون دھوئے گا

انجیل کی حفاظت کون کرے گا

قرآن کا کون رکھوالا بنے گا

عیسیٰ کی کون حفاظت کرے گا

وہ جنہوں نے عیسیٰ کو مارا

اور

انسان کو کون بچائے گا

ایک اور نظم دیکھیے۔

ہماری آہ و بکا ہمارا چیخنا چلانا

ہمارے کاموں سے زیادہ بڑا ہے

ہماری تلواریں ہماری قامت سے

کہیں زیادہ لمبی ہیں

ہمارا المیہ یہی ہے

ہم جدید تہذیب کی قبا تو ضرور پہن لیتے ہیں

لیکن ہماری روحیں

پتھر کے زمانوں میں رہتی ہیں

When they will announce the death of Arabs

اُس کی ایک اور ہنگامہ خیز نظم ہے۔شاعر کیسے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

پچاس سالوں سے میں عرب ریاستوں کو دیکھ رہا ہوں

وہ بادلوں کی طرح گرجتے ہیں مگر برستے نہیں

وہ جنگیں لڑتے ہیں اور ہارتے ہیں
وہ فہم فراست کی بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں
مگر انہیں ہضم نہیں کرتے
میں تاریخ کی کتابوں میں تلاش کرتا ہوں
کوئی اسامہ ابن المنطق، کوئی عمرؓ او رحمزہؓ
کوئی خالد جو شام کو فتح کرنے جاتا ہو
کوئی معتصم باللہ جو عورتوں کو زیادتی اور آگ سے بچاتا ہو
1990 کی خلیجی جنگ پر اُس نے اپنی مشہور نظم میں کہا
شکست ہوئی
اس کے بعد ایک اور شکست
ہم کوئی جنگ کیسے جیت سکتے ہیں
اگر وہ سب
جنہوں نے فوٹوگرافر کے طور پر کام کیا
اور
پروپیگنڈہ منسٹری میں جنگ لڑنی سیکھی

بلقیس کی موت کے بعد اُس نے بیروت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ وہ جنیوا اور پیرس کے درمیان متحرک رہا۔ پھر لندن میں سیٹ ہو گیا۔

گو اُس نے خاصا وقت لندن میں گزارا۔ مگر اس کے باوجود اُسکی طاقتور شاعری اپنی بھرپور توانائیوں کے ساتھ عرب دنیا میں سفر کرتی رہی۔ دمشق ہمیشہ اس کی کمزوری رہا۔ ایک طاقتور عنصر کے طور پر اُس کی شاعری میں جھانکتا رہا۔ اپنی محبت اور پیار کا اظہار اُس

نے بہت بار کیا۔

''دمشق تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو؟'' کیا نظم تھی۔ شاعر کی اپنے آبائی شہر سے محبتوں کا اظہار کس کس انداز میں سامنے آتا ہے۔

میں یادوں کی گھٹڑی کھولتا ہوں

ایک پھر دوسری

مجھے اپنا باپ یاد آتا ہے

جو معاویہ ایلی کی ورکشاپ سے آتا ہے

مجھے دمشق کے گھر یاد آتے ہیں

انکی Copper کی ڈور نوبز Knobs،

ان کی لشکارے مارتی ٹائلوں والی چھتیں

اور اُن کے اندرونی صحن

یہ سب تمہیں جنت کی یاد دلاتی ہیں

میں Al-Muhyial ابن العربی کا جبہ پہنتا ہوں

میں جبل قاسیون کی چوٹی سے اُترتا ہوں

شہر کے بچوں کے لئے آڑو، انار اور محبت کی نظمیں

اُڑتی چڑیوں کی لمبی قطاریں

اے شام کے لوگو میں تمہاری سبز چڑیا ہوں

میں تمہارا پاگل شاعر ہوں

میں تمہارا نایاب چاند ہوں

اُسے مجھے ایک بستر دینے دو

اور ایک اونی کمبل بھی

کہ میں صدیوں سے نہیں سویا ہوں

"دمشق کی چنبیلی" اس محبت کی ایک اور واضح مثال ہے۔

ذرا دیکھیے:

میں دمشق واپس آتا ہوں

بادلوں کی پشت پر سوار ہو کر

دو خوبصورت گھوڑے بھی میرے نیچے ہیں

ایک میرے جذبوں کا

ایک میری شاعری کا

میں ساٹھ سال بعد واپس آیا ہوں

اپنی وفات سے صرف ایک سال قبل اُنہے "میں دہشت گردی کے ساتھ ہوں" جیسی شہرہ آفاق طویل سیاسی نظم لکھ کر خود کو امر کر لیا۔ نظم میں وہ دہشت گرد انہیں کہتا ہے جو دہشت گردی کی آڑ میں ملکوں پر تسلط جماتے اور معصوم لوگوں کو خون میں نہلاتے ہیں۔ قبانی جسے دہشت گردی مانتا ہے وہ گیارہ ستمبر والی نہیں نہ اس سے مراد فضول قسم کے دھماکے اور قتل ہیں۔ اس لازوال نظم کا ہر مصرع موتی ہے، ہیرا ہے۔

"میں دہشت گردی کا حامی ہوں"

امریکہ کہ لوگوں کی ثقافت کا دشمن

مگر خود ثقافت سے عاری

مہذب لوگوں کی تہذیب کا بیری

مگر خود تہذیب سے محروم

امریکہ

ایک فلک بوس عمارت کا نام
مگر دیواروں سے خالی
میں دہشت گردی کا حامی ہوں
ہمیں دہشت گرد کہا جاتا ہے
اگر ہم اسرائیلی بلڈوزروں تلے آ کر
مرنے سے انکار کردیں
اپنے لوگوں پر ہونے والے ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھائیں
وہ ہماری دھرتی ملیا میٹ کر رہے ہیں
ہماری تاریخ مٹا رہے ہیں
ہمارے قرآن، ہماری انجیل کی تذلیل کر رہے ہیں
اگر ہمارا گناہ یہ ہے تو
واللہ کتنی خوبصورت ہے دہشت گردی
میں دہشت گردی کا حامی ہوں
اگر یہ مجھے
روس، رومانیہ، ہنگری اور پولینڈ سے آئے
مہاجروں سے بچا سکے
یہ مہاجر فلسطین میں آ بسے ہیں
وہ ہمارے کندھوں پر سوار ہیں
انہوں نے القدس کے مینار

اقصیٰ کے دروازے

اور محرابیں چرا لی ہیں

میں دہشت گردی کی حمایت جاری رکھوں گا

جب تک نیو ورلڈ آرڈر

امریکہ اور اسرائیل کے درمیان

منقسم رہتا ہے

یہ میرے بچوں کا خون کرتا رہے گا

ان کے ٹکڑے کتوں کے آگے ڈالتا رہے گا

میں اپنی شاعری سمیت

اپنے لفظوں سمیت

اپنی ساری طاقت کے ساتھ آواز بلند کرتا رہوں گا

جب تک یہ نئی دنیا قصاب کی گرفت میں ہے

میں دہشت گردی کا حامی ہوں اور رہوں گا

اس نظم نے پوری عرب دنیا کے طول و عرض میں طوفان برپا کر دیا۔ بڑی طاقتوں نے بھی شدید غصے کا اظہار کیا۔ مگر شاعر نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔

اسکی موت پر جہاں دنیا بھر کے اخبارات نے اُسے خراج تحسین پیش کیا۔ وہیں دمشق کے گلی کوچوں میں اشک بہاتی آنکھوں نے ایک دوسرے سے ملنے پر کہا تھا۔

''جانتے ہو آج دنیا سے کون رخصت ہوا ہے؟''

وہ شخص جس سے بڑے بڑے ایوانوں میں بیٹھنے والے چھوٹے اور بزدل لوگ ڈرتے اور نفرت کرتے تھے۔ اُس کی آخری خواہش جسکا اظہار اُسنے اسپتال میں کیا دمشق

میں دفن ہونے کی تھی۔

''دمشق میرے لئے رحم مادر کی طرح ہے جس نے مجھے شاعری سکھائی جس نے مجھے تخلیق کار بنایا۔''

میں ملول تھی۔ شکر گزار تھی۔ عرب مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوئی تھی۔ شام کی ایک صاحب علم ہستی سے ملی تھی اور اب باب صغیر جانے کی متمنی تھی جہاں وہ عظیم شاعر دفن تھا۔ جب میں گھر سے نکلی تھی۔ اس کی ایک خوبصورت نظم میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

گرمیوں میں ساحل پر نیم دراز
تمہارے بارے سوچتا ہوں
اے سمندر اگر تمہیں یہ پتہ چل جائے
کہ تمہارے بارے میں نے کیا سوچا
تو تم اپنے ساحلوں، اپنی سیپیوں، اپنی مچھلیوں کو
چھوڑ کر میرے پیچھے چلے آتے

☆☆☆

مونا عمیدی

شام کی حساس، منفرد اور نئی سوچ کی حامل شاعرہ

- مونا عمیدی نے امریکن ماں کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی دمشق نہیں چھوڑا۔
- شام جیسے تہذیبی وثقافتی ورثے سے لبالب بھرے ملک کو اب کھنڈر بنتے دیکھنا بڑا کٹھن کام ہے مگر مونا عمیدی لفظوں کے سہارے یہ کام کر رہی ہے۔
- جنگوں کے المیے انسانی جذبات واحساسات کی پوشیدہ پرتوں کو بھی بیدار کر دیتے ہیں۔
- حافظ الاسد نے بنیادی مسائل کے حل کی طرف توجہ نہیں کی۔

ہم ہیں

ہم بکھرے شکستہ خوابوں والی نسل

جو شیلوں پر سوتی، جاگتی اور قہقہے لگاتی ہے

اِس نسل کا غم اور دکھ بس صرف اتنا

کیا بجلی اور انٹرنیٹ جلد بحال ہوگا

ہم وہ نسل جس کی خوشیاں چوری ہوگئی ہیں

تاہم ہمارے نوجوان دل زندگی کیلئے ابھی بھی کشادہ ہیں

ہم وہ نسل جو کبھی کسی دن کہیں گے

ہم نے تاریکیوں سے جنگ کی اور اُسے کہیں دور دھکیل دیا

موناعمیدی

دمشق میں چم cham پیلس ہوٹل کے بالمقابل نوبل بک شاپ پر دھری مونا عمیدی کی نظموں کے مجموعے کی پھولا پھرولی میں اس نظم نے پل بھر میں ہی گرفت میں لے لیا تھا۔

آہ بغداد کے سٹور بند ہیں
تریپولی کی گلیاں ویران ہیں
غزہ پر بمباری ہے
فلوجہ شعلوں میں نہا رہا ہے
دنیا سو رہی ہے
اور عرب دنیا
بحث میں اُلجھی ہوئی ہے کہ
ورلڈ کپ میچوں میں کون جیتا ہے؟

یہ چونکا دینے والی نظم تھی ۔وہیں کھڑے کھڑے پانچ چھ مزید نظموں کے مطالعہ نے بتایا کہ شاعرہ نے بشارالاسد کے آغاز اقتدار سے جس سیاسی تبدیلی کی خوشبو محسوس کرتے ہوئے بہت سی امیدیں وابستہ کیں ۔فکری انقلاب مشرق وسطیٰ کے درو دیوار پر دستک دیتا محسوس کیا۔2000 سے 2001 کے مختصر وقت کو" دمشق بہار" کے نام سے موسوم کیا تھا۔آنے والے وقتوں میں اس نے مایوس کیا۔

نثر اور کورس کی کتابیں لکھتے لکھتے دلی جذبات شعروں میں ڈھلنے لگے تھے۔

کھلتی رنگت والے سیلز مین نے صاحب کتاب سے مزید تعارف کی غرض سے ایک اور خوبصورت کتاب سیرین فوک ٹیلز Syrian Folk tales ہاتھ میں پکڑا دی اور ساتھ ہی بڑے میٹھے سے لہجے میں بیٹھ کر کتاب کو تفصیلی دیکھنے کی دعوت بھی دے دی۔

دیدہ زیب طباعت و کتابت اور ٹائٹل نے توجہ فوراً کھینچی ۔صفحات الٹنے پلٹنے اور کہیں کہیں پڑھنے سے احساس ہوا کہ بلاد الشام کے مختلف علاقوں کی یہ کہانیاں ایک انتہائی شاندار پیش کش تھی ۔گرفت میں لینے والی عام فہم زبان جو حقیقت اور طلسم ،معلوم اور نا معلوم کے درمیان سفر کرتی تھیں ۔مصنفہ شاعرہ بھی کمال درجے کی تھی ۔دونوں کتابیں خرید لیں ۔میری درخواست پر بک شاپ کے مالک نے مصنفہ کا فون نمبر اور پتہ بھی کاغذ پر لکھ دیا تھا۔یہ 2008 تھا۔شام پر امن تھا اور عام آدمی کب جانتا تھا کہ فضاؤں میں کہیں اس کی بربادیوں کے چرچے گردش میں ہیں۔

کہانیوں نے مجھے سحر میں جکڑ لیا تھا۔یہ تعارف تھا اس خوبصورت ملک کے ماضی کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے ۔یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں عمیدی کی دادی سے بیٹھی کہانیاں سن رہی ہوں ۔شام کے شہروں کے گھروں کے پرسکون ماحول میں ،شام کے مختلف

دیہی علاقوں میں روایتی زندگی کے سارے رنگ ان کہانیوں میں اڑتے پھرتے تھے۔

رات گئے نظمیں پڑھتی رہی۔ اگلے دن ال فردوس سٹریٹ پر واقع گھر پر ملاقات کے لیے پہنچ گئی۔ گھر ڈھونڈنے میں پتہ پانی ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور بڑا اناڑی سا تھا۔ خوب خوب گھمایا۔ اس پتھر کی طرح رولا جو فٹ پاتھ پر پڑے کسی شرارتی سے چلنے والے راہگیر کی ٹھوکروں پر آ جائے جو پاؤں کے ٹھڈوں سے اُسے لڑھکا لڑھکا کر اس کا حشر نشر کر دے۔

مونا عمیدی قدرے فربہی بدن کی سُرخ و سفید خاتون نے مجھے اپنے گھر کے دروازے پر خوش آمدید کہا تھا۔ دروازہ ایک معمر عورت نے کھولا۔ ایک اجنبی صورت سامنے تھی۔ زبان یار من ترکی والا معاملہ تھا۔ تاہم مونا آ گئی۔ پاکستان کا جان کر اتنا خوش ہوئی کہ جتنی سفر سے کوفت ہوئی تھی سب اُڑنچھو ہو گئی۔ چھوٹے سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی کولڈ ڈرنک آیا، پھر قہوہ، کھجوریں اور مٹھائی آ گئی۔ باتیں شروع ہوئیں اور پھیلتی چلی گئیں۔ اپنی دونوں کتابیں میرے پاس دیکھ کر خوش ہوئی۔ میں نے کہا کہ وہ اُن پر کچھ لکھ دے۔

''سکون سے بیٹھو۔ لکھ دوں گی۔'' محبت بھرا اظہار تھا لہجے میں۔

یہ شاعری اُسنے کتاب کی طرف اشارہ کیا شاید اس معیار کی نہ ہو جو شاعری کا ہوتا ہے۔ اصل میں تو فوک ٹیلرز کی یہ کتاب ہے جسے میں نے اہتمام اور محبت سے لکھا ہے۔ یہ تو بس ایسے ہی جذبات کا اظہار ہے۔

باتیں شروع ہوئیں وہ بھی دو عورتوں کی جو دو مختلف ملکوں، دو مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ عورتوں کے حوالے سے جو تصویر مونا نے مجھے دکھائی وہ ہماری تصویر سے کچھ ہی مختلف تھی۔ شہری اور دیہی عورت کا جائزہ بھی تھا۔ تاہم سیریا میں زیادہ آبادی شہری ہے۔ ملکی قانون میں بھی مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔

تاہم سیاسی طور پر جو کچھ سُننے کو ملا وہ صحت مند نہ تھا۔ موہا بہت سلجھی ہوئی اور ملکی حالات پر گہری نظر رکھنے والی خاتون تھی۔ اس نے مختصراً شام کی سیاسی تاریخ میرے سامنے کھول دی تھی۔ میری درخواست تھی کہ وہ کچھ حالات پر روشنی ڈالے کہ جانوں تو سہی۔

خادمہ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی لائی۔ جس پر ڈش میں سُرخ کٹا تربوز سجا تھا۔ موہا نے پلیٹ میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اُسے بھرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی کانٹا بھی ہاتھوں میں تھما دیا۔

شہد جیسا میٹھا ٹھنڈا تربوز حلق سے نیچے کیا اُترا کہ روح تک سرشار کر گیا۔

عرب دنیا میں دراصل بعث پارٹی نے بہت سرعت اور جانفشانی سے نوجوان طبقے کو متاثر کیا تھا۔ اِس کی واحد مثال اسلامی بھائی چارے سے ہی دی جا سکتی ہے۔ حافظ الاسد ایسا ہی ایک مضطرب نوجوان تھا جو قومی کردار میں اپنا حصّہ ڈالنے کیلئے بے قرار تھا۔ وہ فائٹر پائلٹ تھا۔ اپنی فوجی وابستگی کو اُس نے پارٹی میں اپنے کردار کیلئے بہت سمجھداری سے استعمال کیا۔ سیاسی سوجھ بوجھ، مہارت، ذہانت، فراست اُسے 1971 تک ملک کی صدارت کے عہدے تک لے گئے۔

اُس کی فتح یابی یقیناً کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ وہ اگر چاہتا تو اپنے اِس اقتدار میں سیریا کو آسمان پر لے جاتا۔ مگر اُس نے بنیادی مسائل جن میں سرفہرست نسلی امتیازات اور "معاشرے میں اسلام کا کردار" کی طرف توجہ نہیں دی۔

یہ سلسلہ جو آج سیریا میں اپنی تلخیوں اور المیوں کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ شاید نہ آتا اگر اس کا تدارک کر لیا جاتا۔

1973 کے نئے آئین میں درج تھا۔ فرانسیسی غلبے کے دوران بھی جو آئین وضع تھا اُس میں بھی یہ درج تھا کہ صدارت پر متمکن صرف مسلمان ہوگا۔ سیکولر سیاست کے ساتھ

مخلص ہونے کے باوجود حافظ الاسد نے اس مسلم آرا کو دو طریقوں سے سبوتاژ کیا۔ پہلے کے مروجہ آئین ایک شق داخل کرتے ہوئے اسلام کو نئے معنی پہناتے ہوئے اُسے نئی تعریف دی۔

اسلام امن، عدل، سلامتی، محبت اور مساوات کا مذہب ہے۔ اُس میں علویوں Alawis کو شیعہ مسلک سے جوڑا گیا اور کافر یا بدعتوں کی فہرست سے نکال باہر کیا۔ یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ جو 1982 حما Hama کے شہر میں پہلی بار فسادات کا باعث بنی۔ ان کی شدت اس درجہ تھی کہ شہر کھنڈر بن گیا۔

یہ اور بات تھی کہ اس کی بھرپور توجہ، دلچسپی اور فراخدلانہ وسائل کے استعمال نے کیا گھروں، کیا سڑکوں، اسپتالوں، پارکوں کی تعمیر کروا کے دنیا کو دکھا دیا کہ وہ جلا بھنا کھنڈر شہر کیسے ایک زندہ شہر بن سکتا ہے اور حکمران اگر چاہیں تو چیزیں کیسے ممکن ہوتی ہیں؟

یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ مگر بنیادی جھگڑا تو جوں کا توں تھا۔ نسلی مسائل کو حل کیسے کرنا ہے اور اسلام کا معاشرے میں کیا کردار ہو جیسے اہم مسائل پر اُس کی عدم دلچسپی آنے والے خونین حادثات کا باعث بنی۔ اُس کے ہاں اسلام اور بعث پارٹی سنی اور علویوں شہروں اور دیہی علاقوں میں سماجی تضادات کی گتھیوں میں الجھتی رہیں اور اُس نے انہیں سلجھانے اور حل کرنے کی طرف قطعاً توجہ نہ کی۔

2000 میں بشار کے آنے سے احساس ہوا کہ شاید تبدیلی کی کوئی خوشگوار سی لہر چلے۔ اس کی برطانوی نژاد بیوی اسما الخراس Akhras بھی بہت تیز اور ڈرامیٹک قسم کی اپروچ کی حامل نظر آئی تھی۔

دراصل اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد اس نے دمشق بہار کا نعرہ لگاتے ہوئے درجنوں سٹڈی سرکلز اور بحث مباحثوں کے مراکز قائم کیے۔ سچی بات ہے 2001 میں

دانشوروں اور وکلاء کے گروپوں نے آئین میں اصلاحات کے لیے زوردار قسم کی مہمیں چلائیں۔جن میں سرفہرست ایمرجنسی قوانین کا ہٹانا اور مکمل شخصی آزادیوں کا حصول تھا۔مگر جابرانہ ہتھکنڈے اتنے زبردست تھے اور اندرخانے ایسی ایسی گھناؤنی سازشیں تھیں کہ بظاہر ہر سطح بہت پرسکون نظر آنے کے باوجود تہہ میں بہت طوفان مچلتے تھے۔

جب ہم شام کی چائے پیتے تھے۔ملحقہ کمرے سے مدھم سروں میں کسی گیت کی آواز نے جیسے مجھے مضطرب سا کر دیا۔آواز اتنی خوبصورت تھی کہ سمجھ نہ آنے کے باوجود بھی گیت دل میں اُترا جاتا تھا۔

مونا نے پوچھا تھا۔عربی کی شدبد ہے۔

''بس پڑھنے کی حد تک سمجھنے کی نہیں۔''

یہ نزار قبانی کی شاعری تھی۔ترجمہ بھی اُس نے کر دیا تھا۔اور گانے والے کا نام بھی۔نزار قبانی پر بات ہوئی تو کہنے لگی۔وہ زمانوں کا شاعر ہے۔مخصوص وقت کا نہیں۔

عورت مرد کی امارت سے
نہ ہی اس کی خوبصورتی سے
اور نہ ہی اس کی شاعری سے
کچھ نہیں چاہتی
اس کی تمنا ایک ایسا مرد ہے
جو اس کی آنکھوں کی زبان سمجھ سکے
جب وہ اداس ہو
وہ اپنی چھاتی کی طرف اشارہ کرے
اور کہے

یہ ہے تمہاری جائے پناہ

پھر مونا کی ذاتی زندگی کے بارے جانا۔امریکن ماں اور شامی باپ کے گھر پیدا ہونے والی یہ بچی 1962 میں دمشق میں پیدا ہوئی۔انگریزی ادب میں گریجوایشن اُس نے دمشق یونیورسٹی سے کیا۔اس کے ساتھ اس نے انگلش عربی ٹرانسلیشن کا ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔آغاز میں اس نے بچوں کے لیے انگریزی کورسز مرتب کیے۔اور انگریزی زبان کیسے پڑھائی جائے پر نصابی کتب لکھیں۔بعد ازاں عربی کہانیوں کا ترجمہ شروع کر دیا۔

دو بچے بیٹا اور بیٹی باپ کے ساتھ دیمس Dimas کسی عزیز کے ہاں گئے تھے۔

''دراصل اُن کی بیٹی میری بیٹی کی ہم عمر ہے۔بہت پیار ہے دونوں میں۔آج اس کی سالگرہ تھی۔''

''آپ نہیں گئیں؟'' پوچھا۔

''کچھ طبیعت ٹھیک نہ تھی۔'' پھر ہنستے ہوئے بولیں۔

''ہاں چلی جاتی تو تم سے کیسے ملتی؟''

اور واقعی میں نے سوچا یہ جو دانے دانے پر مہر ہے ایسے تو نہیں کہا گیا۔

ہمارے درمیان اب اس کی فوک کہانیوں کے حوالے سے باتیں ہونے لگیں۔

فوک کہانیوں کی ان سلسلہ وار کتابوں نے ایک دھوم مچا دی۔عام شامی کیا پڑھے لکھے لوگ بھی اپنے ملک کی ثقافت کے اِن خوبصورت رنگوں سے ناواقف تھے۔بہت پذیرائی ہوئی۔انگریزی میں شاعری بھی چونکا دینے والی تھیں۔یہ جذبات و احساسات کا ایک جہاں کھولتی تھیں۔عراق سے متعلق نظمیں، لیبیا، مصر عرب دنیا کس بے حسی کا شکار ہے۔بڑی طاقتوں کی سیاسی ریشہ دوانیاں، غلبے کی خواہشیں اور طاقت کے اندھے اظہار

کیسے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے عام لوگوں کے خوابوں، خواہشوں، امیدوں اور ان کے بستے رستے خوش و خرم گھروں کو کھنڈر بنا دیتے ہیں۔ وہ جو کہانیاں اور محبت کے گیت لکھتے اور گاتے لوگ کیسے میٹھے جذبات سے ناطہ توڑ کر خنجر ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔ بے حد عام فہم لفظوں میں حقیقت کا چہرہ اور اپنے جذبات و احساسات کس خوبی سے اپنے اندر سے نکال کر وہ باہر صفحے پر بچھا دیتی ہے۔

جب عراق خاک و خون میں نہا رہا تھا کہیں کسی وژن رکھنے والے نے کہا تھا۔ عراق سے فراغت کے بعد شام کی باری ہے۔ آپ اِس بارے میں کیا کہتی ہیں۔

اِس بات پر اُس نے دکھ سے بھری ہوئی لمبی گہری سانس باہر نکالی تھی۔ اور مجھے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

حافظ الاسد غیر معمولی ذہانت والی شخصیت تھی۔ سوال ہے کہ 1982 کی تباہ کن بغاوت سے اُسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کس طرح بیرونی طاقتیں اس کے لوگوں میں گھسی کام کر رہی ہیں؟ جب 1500 سے سے زائد مشین گنیں پکڑی گئیں۔ لوگ گرفتار ہوئے اور معلوم ہوا کہ ان کی سی آئی اے نے تربیت کی ہے تو پھر عزائم کو پڑھ لینا کوئی مشکل کام تھا۔ مگر بات تو اتنی سی ہے کہ آمرانہ اقتدار کا مزہ اس نشہ آور مشروب کی طرح ہے جسے حالات کی تیز ترین ترشی جھنجوڑتی ضرور ہے مگر ہوشیار نہیں کرتی۔

رات کے کھانے کے بعد موما کا ڈرائیور مجھے چھوڑنے آیا تھا۔ ہم نے فون، ای میل کے تبادلے کیے تھے۔

پاکستان آ کر کبھی کبھی میرا اُس سے رابطہ ضرور رہتا۔ تاہم 2011 میں اخبارات نے بتانا شروع کیا کہ خانہ جنگی شام کے خوبصورت شہروں پر اپنی نحوست کے سائے پھیلانے شروع ہو گئی ہے۔

آنسوؤں نے آنکھیں دُھندلا دی تھیں کہ اندھی عرب دنیا اور دیگر اسلامی ملکوں کی قیادتیں سب آلہ کاربنی ذاتی اعتراض کیلئے ضمیر کے سودے کرتی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے اپنی اپنی دنیاؤں میں گم تھیں۔ کوئی بیئون منصوبہ بھی ہے۔ کہیں پر عظیم تر اسرائیل کے لیے کام ہو رہا ہے۔ امریکی تھنک ٹینک اب عرب اور تیسری دنیا کے مفلوک الحال ملکوں کو کِس اندھے کنوئیں میں دھکیلنے کیلیے سرگرم ہیں۔ انہیں کوئی غرض نہیں۔

اور یہ جنگ پھیلتی جا رہی تھی۔ اپنی ایک میل میں اس نے لکھا تھا۔

اِس عقل کے اوندھے بشار کو کون سمجھائے کہ سیاسی مخالفت کا مطلب ہتھیاروں کو اٹھانا نہیں ہوتا۔ سیریا کا جھگڑہ پرامن احتجاج کے طور پر شروع ہوا تھا۔ اِسے لڑائی میں کیوں بدلنے دیا گیا؟ احمق مغرب کی چالوں کو نہیں سمجھتا۔ جانتی ہو کتنے لوگ مارے گئے۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ ایک لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے اور دربدری کا المیہ تم دیکھتی ہی ہوں گی۔

اور یہ اِس کی نیٹ پر باتیں تھیں جنہوں نے مجھے بتایا تھا کہ عمیدی کہیں نہیں بھاگی۔ دمشق میں رہی۔ کیونکہ دمشق سے اُسے عشق ہے۔ لینن گراڈ کے اُسے بوڑھے موسیقار کی طرح جو سمجھتا تھا کہ وہ اگر شہر سے چلا گیا تو فصیلِ شہر گر جائے گی۔ اپنے خوبصورت ملک کے خوبصورت شہروں کو عراق کے شہروں کی طرح کھنڈر بنتے دیکھتی اور اپنے دکھوں کو لفظوں کے ہاروں میں پرو پرو کر اس کا اظہار کرتی رہی۔

دمشق خوبصورتیوں، پرانی اور نئی تہذیبوں کا شہر
آہ روشنیوں کا شہر مگر اب بجلی نہیں
چنبیلی جیسی کلیوں کا شہر، مگر اب پانی نہیں
محبتوں کا شہر، مگر دوستوں سے خالی

تاریخ سے بھرا شہر مگر مستقبل سے خالی

وہ ہمسائیوں کو آواز دیتی ہے اور سنتی ہے سارے شہر میں پانی نہیں۔بجلی نہیں،گیس نہیں۔تب دکھ نس نس اور رگ رگ سے پھوٹتا ہے۔پھر وہ معصومیت سے خود سے سوال کرتی ہے۔ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔دمشق میں فیجاFijeh چشمہ سلامت رہے۔اس نے تو شہریوں کا ہمیشہ خیال رکھا تھا۔

پھر جیسے وہ ماضی کی یادوں سے حال میں آتی ہے۔میں اسلامی کیلنڈر کے صفحات الٹتی ہوں۔جو میری کچن کی دیوار پر آویزاں ہے۔دو ماہ بعد رمضان ہے۔میرے بچپن کے رمضان کی خوبصورت یادیں اپنی پوری توانائی سے میری آنکھوں سے باہر جھانکتی ہیں۔کیسے دل موہ لیتے منظر تھے۔افطاری کے کھانوں کی خوشبوئیں۔اذان کی پرسوز آواز،تراویح کی رونقیں۔ٹپ ٹپ آنسو آنکھوں سے گرتے ہیں۔یہ رمضان کیسا ہوگا؟

صبح کے منظر رلا دینے والے ہیں
دمشق کے لوگوں کو کس جرم کی پاداش میں
سزا دی گئی ہے
میں کیسے بتاؤں کہ
دمشق کے رمضان کی مقدس راتیں
مگر رنگین لالٹینوں اور قمقموں کے بغیر

اب
خاموشیوں کو توڑتی ذکر کی آوازیں نہیں
دمشق میرے خوبصورت شہر
زندگی تو یہاں غروب ہوتے سورج جیسی ہوگئی ہے

جو لوگوں کے دلوں میں ڈوبتی ہے
بڑی ہی آتشیں دھمکیوں کے سگنل دیتی
اداسی اور مایوسی کی لہروں کو پھیلاتی
گھپ اندھیروں میں گم ہوتی

یہ جولائی 2014 ہے اور وہ لکھتی ہیں۔

میں شہر کا چکر لگانے کا ارادہ کرتی ہوں۔ اپنی گلی کے ہمسائیوں کے دروازوں کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے ہوا کی چال میں لڑکھڑاہٹ اور بین کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ بند دروازوں پر دستک میں درد کی ایسی چیخ ہے کہ جیسے وہ اچانک کسی بیٹھے مسحور کن خواب سے جاگی ہے اور اُسے یہ کربناک احساس ہوا ہے کہ اس کے مکین ہمیشہ کے لیے کہیں چلے گئے ہیں۔ میرا یہ شہر جو کبھی لوگوں سے بھرا پُرا ہوتا تھا۔ زندگی کی گہما گہمی سے ہنستا مسکراتا جانے کہاں گم ہو گیا ہے؟ امیدوں سے بھرا میرا یہ بلاد الشام مایوسیوں اور نا امیدیوں کے پاتال میں گر پڑا ہے۔ دیکھیے تو یہ درد مونا کے شعروں میں کیسے در آیا ہے۔

ہش ہش

قدموں کی چاپ دروازے کی طرف بڑھتی ہے
تالے کے سوراخ میں چابی گھومنے کی آواز
کہیں خوشی و مسرت کا در کھلنے کی امید
ہمیشہ رہنے والی تاریکی کو روشن کرنے کی آرزو
نہیں نہیں
ارد گرد صرف تاریک سائے منڈلاتے ہیں
دروازے کے سوراخوں سے ہوا سیٹیاں بجاتی ہے

خاموش دروازہ بند رہتا ہے
اپنی افسردگی کو گلے سے لگائے
کھلنے کا خواب دیکھتے ہوئے

دمشق کے گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے میرا دل دُکھ اور یاس سے بھر جاتا ہے۔ ہر کوئی ملک سے بھاگ رہا ہے۔ آپ باہر نکلتے ہیں خوبصورت گھروں کے دروازے بند ہیں، کھڑکیاں بند ہیں۔

میں رک جاتی ہوں۔ دروازے جیسے مجھے کہتے ہیں ہم اپنے مکینوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ کب واپس آئیں گے؟

ضروریات زندگی کی چیزیں بمشکل خرید کر ایک پارک میں تھوڑا سا سستانے کیلئے آ بیٹھی ہوں۔ یہاں کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ بحث و مباحثے میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ اب کس کی شیل بننے کی باری ہے۔

ان کا یہ کھیل مجھے میرے ان دنوں میں لے گیا ہے جب ہم بھی یہی کھیل کھیلتے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ اب کی کس کی باری ہے۔ چڑیل، جادوگر یا سپاہی بننے کی۔ لیکن یہ شیل shell۔ میں بیک وقت اُداس اور پریشان ہوگئی ہوں۔ پھر جیسے شیل میرے تصور میں ابھرا ہے اور وہ اپنے موت کے سفر کا احوال بیان کرتا ہے۔

شیل کا سفر
جیسے شہاب ثاقب کے ٹوٹنے کا سفر
انہوں نے مجھے دور اور نزدیک مارنے کے لیے چنا
میں دہکتا گولہ سا دمشق کا چکر لگاتا ہوں
کہیں میناروں کہیں گھاٹیوں پر سے

اوپر اور نیچے

مصروف لوگوں کو ادھر اُدھر پھرتے دیکھتے

خوش و خرم بچے یہاں وہاں پھرتے

جونہی اچانک میں نیچے اُترتا ہوں

ایک زبردست جھٹکے کے تعاقب میں چیخیں اور کراہیں

اس کے بعد کیا ہوا

میں نہیں جانتا

زار زار بہتے میرے آنسوؤں نے اُن ناموں کو دھندلا دیا ہے۔جو میں گلیوں کی دیواروں پر لکھے دیکھتی ہوں۔ان نوجوانوں کے نام جن کی ابھی شادیاں ہوئی تھیں۔اُن کی دلہنیں کہاں چلی گئی ہیں؟ کتنے بیٹے اور بیٹیاں اپنے والدین کو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔جب وہ لکھتی ہے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک برسات ہے۔

شیلز shells چھتوں اور فرشوں پر بارش کی صورت برس رہے ہیں

دیواروں پر مرنے والوں کے نام لکھے ہوئے ہیں

دلہنیں تو رات بھر میں ہی بیوہ ہو گئی ہیں

بچے محاذ جنگ سے باپ کی واپسی کے منتظر ہیں

جہاز طوفان کی مانند بمباری کر رہے ہیں

کہیں بچے سکول بیگوں کے ساتھ

کہیں لوگ شاپنگ بیگز کے ساتھ

خون میں لتھڑے پڑے ہیں۔

29 دسمبر 2014 کو اس نے لکھا۔

لگتا ہے جیسے میں اپنے ہی شہر میں اجنبی ہوں۔

اجنبی

جس نے اپنے خوابوں کو
چوما اور شب بخیر کہا
پھر انہیں ڈھانپ دیا
اور خاموشی سے رخصت کر دیا
اپنی زندگی سے چلتے ہوئے نکل گئی ہوں
اب اور اسی وقت سے
میں تو خود سے اجنبی بن گئی ہوں۔

میری بیٹی ابھی ایک ٹرپ سے واپس آئی ہے۔غم زدہ ماحول کے باوجود وہ خوش ہے اور مسکراتی ہے۔وہ پرانے سٹیم انجن کے ساتھ اپنی دوستوں کے ہمراہ براداہ Barada دریا کے کنارے کنارے منائے جانے والے اپنے ٹرپ کا احوال سناتی ہے۔

میں اپنی بیٹی کی آنکھوں سے چھلکتی امید کی روشنی دیکھتی ہوں۔

میرے اس اداس شہر کے باسیوں میں سے وہ لوگ جو موت نہیں زندگی کے دوسرے راستے کیلئے جدوجہد کرتے ہیں۔اس روشنی کو ان آنکھوں سے چھلکتے محسوس کرتی ہوں۔

ہم ہیں
ہم بکھرے شکستہ خوابوں والی نسل
جو شیلوں پر سوتی، جاگتی اور قہقہے لگاتی ہے

اِس نسل کا غم اور دکھ بس صرف اتنا

کیا بجلی اور انٹرنیٹ جلد بحال ہو گا

ہم وہ نسل جس کی خوشیاں چوری ہو گئی ہیں

تاہم ہمارے نوجوان دل زندگی کیلئے ابھی بھی کشادہ ہیں

ہم وہ نسل جو کبھی کسی دن کہیں گے

ہم نے تاریکیوں سے جنگ کی اور اُسے کہیں دور دھکیل دیا

عمیدی کی نظمیں اور یادداشتیں حکومت شام کی سرکاری سطح پر اُن بڑھکوں یا نظم و نسق کی ابتری کی یاوہ گوئیوں کی قلعی کھولتی ہیں جو حکومت نے اپنا طرزِ عمل بنالیا ہے۔تاہم اس کی نظمیں اگر ایک طرف اس کے دکھوں کا اظہار ہیں تو وہیں وہ ہمارے لئے اس صبح کا بھی پیغام ہیں جو طویل اور تاریک رات کے بعد طلوع ہو گی۔اور جو ہم جیسے مایوس اور ناامید لوگوں کے لئے ایک نوید ہے۔

☆☆☆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بورس پاسترنک

روس کا مایہ ناز نوبل ایوارڈ یافتہ ناول نگار، شاعر،

موسیقار اور ترجمہ نگار

- "ڈاکٹر ژواگو" جیسے شہرہ آفاق ناول کا خالق، عظیم شاعر، بڑا موسیقار اور بہترین ترجمہ نگار۔
- ذاتی اور سماجی رویوں سے حاصل ہونے والے تجربات اور مشاہدات نے اُس کی شاعری کو بے حد توانا اور مقبول بنایا۔
- فطرت اس کی نظموں میں بارش اور برف کے راستوں سے اندر داخل ہوتی ہے۔
- وہ روسی ہے۔ روس اُسے دنیا کے ہر تمغے سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی عزت، ذلت، اس کا جینا، مرنا سب روس کے ساتھ ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں دروازے پر کھڑا اِس کوشش میں ہوں
کہ جس سطح پر مجھے اب نمودار ہونا ہے
میری شکایات زیرِ لب ہی رہیں
میرے شکوے میرے ہونٹوں میں ہی رہیں
کہ میرے دماغی خانے میں محفوظ
میرے آنے والے سالوں کی
دریافت کی گونج اپنا دم توڑ رہی ہیں
رات کی تاریکی اپنے سینکڑوں خوفناک منظروں کے ساتھ
میرے اوپر نظریں گاڑے بیٹھی ہے
میں تمہارے اِن منصوبوں کے مقابل بہت ثابت قدم ہوں
اور اپنا کردار ادا کرنے کیلئے بہت مطمئن بھی ہوں
لیکن اور ڈرامہ تشکیل دیا جا رہا ہے
اِس بار تو مجھے اِس سے نکال ہی دو
لیکن جو کیا جاتا ہے وہ تو طے ہے
مگر انجام تو ہاتھ سے نکلے ہوئے تیر کی مانند ہے
میں تنہا ہوں اور میرے گرد جھوٹ کے ڈرون ہیں

بورس پاسترک

گیارہ جون کی شب دو بجے میری دوست اور میں پیٹرزبرگ میں نیوا کے ساحلوں پر کھڑی گل رنگ شفق کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کے اُن ٹولوں کو بھی دیکھ رہی تھیں جو پیٹرزبرگ کی "سفید راتوں" کو منانے کیلئے یہاں آئے ہوئے موج مستی کی سی کیفیت میں گٹار پر گیت گا رہے تھے۔ روسی زبان میں یہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھا مگر زندہ دلوں کی شوخیاں تو "ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا" جیسے جذبوں کی غماز تھیں۔ ہم اُن کے قریب جا بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک نیا منظر سامنے نمودار ہوا۔ لندن سے آنے والا ایک ٹولہ انگریزی میں گیت گاتا، جھومتا، بل کھاتا گٹار سے کھیلتا آیا۔ بڑا خوبصورت سا گیت تھا جس کے بار بار دہرائے جانے والے بول میری سمجھ میں آتے تھے کہ وزارت سیاحت کی جانب سے ملنے والے کتابچوں میں بورس پاسترنک کی یہی نظم برفباری کے حوالے سے درج تھی۔

دیوانوں کی طرح برستی اس برفباری میں

ہم گلا بوشتا بو کا کھیل کھیلتے ہیں

اور اپنے ہی شور سے خود کو بہرہ کر لیتے ہیں

اپنی کم علمی کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ میں پشکن کو اس طرح نہیں جانتی تھی جسطرح بورس پاسترنک میری آوائل بلوغت کی یادوں میں بحث کی صورت موجود تھا۔ میرے گھر میں میرے بہت پڑھے لکھے، صاحب علم ماموں نظریاتی طور پر دائیں بازو سے متاثر تھے۔ کارل مارکس، فریڈرک اینگلز Friedrick Engles اور لینن کا پرستار میرا خالو جس کا قبلہ و کعبہ ماسکو تھا۔ جب کبھی سب اکٹھے بیٹھتے تو دنیا میں رونما ہونے والے واقعات پر اُن کے تبصرے اور مباحثے کچھ انہی تناظر میں ہوتے۔ بحث مباحثے کبھی کبھی لڑائی جھگڑے کی صورت بھی اختیار کر لیتے۔ گو ایسا کم کم ہی ہوتا۔

موسم کے اعتبار سے یہ بڑے میٹھے سے دن تھے۔ سال غالباً 1958 کا ہی تھا۔ بڑے ماموں اور چھوٹے ماموں سالانہ چھٹیوں پر گھر آئے ہوئے تھے۔ کشادہ آنگن میدان کارزار کا سا روپ پیش کر رہا تھا۔ ہم آٹھویں، نویں اور ایف ایس سی میں پڑھنے والے کزنز کھڑے بیٹھے یہ تماشا دیکھتے اور سنتے تھے۔ آٹھویں جماعت میں پڑھنے والی اوسط ذہانت کی لڑکی کے پلے خاک کچھ پڑتا تھا۔ اگر کچھ پڑا تو بس اتنا کہ کوہ قافوں والے ایک ملک نام جس کا غالباً روس۔ جس کے ایک لکھنے والے کو اس کے ناول پر اس کے ملک نے معتوب ٹھہرایا۔ امریکہ اور برطانیہ اُسے انعام دلانے کے آرزومند اور اس کا ملک اُسے نکالنے کے درپے۔

قارئین میرے ذکر کردہ کرداروں کے حوالوں سے بخوبی جان چکے ہوں گے کہ کس کی ہمدردیاں کس کے ساتھ تھیں۔ میں اپنے ماموؤں کی گلیمرس شخصیتوں سے متاثر

ہونے اور انہیں دل میں بٹھانے کے باوجود اُن سے کہیں نفرت بھی کرتی تھی کہ وہ خاندان اور ہمارے ماحول میں طبقاتی بُعد کا باعث تھے۔ کھدر پہننے والے درویش سے خالو کو شخصی حوالے سے ناپسند کرتے ہوئے بھی اُن کی باتوں سے متاثر تھی۔ سو دلی ہمدردیاں کوہ قاف والے ملک کے ساتھ تھیں۔

کالج لائبریری میں جب "ڈاکٹر ژواگو" کا ناول دیکھا تو اُسے گھر لائی۔ اُردو میڈیم والوں کی انگریزی کچھ اتنی اچھی تو ہوتی نہیں۔ مگر یہ کتاب تو بورس پاسترنک کی تھی۔ اس کے ساتھ میری یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ سو پڑھا۔ ریگل سینما میں فلم لگی تو پہلا شو اور پہلا دن۔ میں ٹکٹ کھڑکی میں کڑی دھکے کھاتی تھی۔

تو آج میں پاسترنک کی اُسی سرزمین پر بیٹھی اُسے سُنتی تھی۔ رُوس آنے سے قبل میں نے پشکن کے ساتھ ساتھ بورس پاسترنک کی شاعری بھی پڑھی تھی اور یہ اُس کی بڑی خوبصورت نظم تھی۔

بورس پاسترنک منفرد قلم کار، شہرہ آفاق ناول ڈاکٹر ژواگو کا لکھاری، نوبل ایوارڈ یافتہ، ایک عظیم شاعر، جنونی سا موسیقار، بہترین ترجمہ نگار، انقلاب رُوس کا حامی مگر جو اپنے ہی نظریاتی لوگوں کے ظلم وستم کا شکار رہا۔

پیدائش ایک صاحب ثروت یہودی گھرانے میں دس فروری 1890 میں ماسکو میں ہوئی۔ باپ لیونڈووچ Leonidovich کی پور پور میں فن رچا ہوا تھا۔ مستند پینٹر، بہترین مجسمہ ساز، مصور اور ماہر تعمیرات تھا۔ ماں روزا کف مین Roza Kaufman ماہر پیانو نواز تھی۔ اس کے والدین کا ادیبوں، دانشوروں، موسیقاروں اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے گہرا یارانہ تھا۔

خاندان لیو ٹالسٹائی کا بھی بہترین دوست تھا۔ اس کی کتابوں کے سرورق اور اندر

کی تصویر کشی باپ کرتا تھا۔نومبر 1910 میں جب ٹالسٹائی گھر سے بھاگا اور Astapovo میں اسٹیشن ماسٹر کے گھر فوت ہوگیا۔بورس کا والد اس کی بستر مرگ پر کی ڈرائنگ کرنے کیلئے گیا تو بورس اس کے ساتھ تھا۔وہ سب لمبے اور واقعات اُس کی یادوں میں محفوظ ہوئے۔

1956 میں اپنے باپ کے کام بارے لکھے گئے مضامین میں وہ اپنے بچپن کی یادداشتوں کو آواز دیتا ہے۔میرے تصورات کی بچگانہ ڈور کا سرا ہمیشہ ٹرین کنڈیکٹر کے ساتھ جا ٹکراتا تھا۔ریلوائی یونیفارم میں ملبوس وہ کبھی ریلوے پلیٹ فارم پر کسی کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑا، مجھے ہانٹ کرتا۔کبھی کچن دروازے پر جہاں سٹوو پر گلو اُبلتا، پارسلوں کے بنڈلوں کی پیکنگ ہوتی اور مہریں لگتیں۔وہ ان مرحلوں کو دیکھتا اور ہدایات دیتا۔بہت سالوں میں نے خود کو اسی روپ میں دیکھا تھا۔

وہ آرمی میں نہ جاسکا کہ کہیں گھوڑے سے گر گیا تھا اور ٹانگ تڑوا بیٹھا۔سرجری کے بعد ایک ٹانگ بڑی اور دوسری چھوٹی ہوگئی۔

کہا جاتا ہے اس کا پہلا پیار باغی سے تھا۔دوسرا موسیقی سے۔موسیقی کی اُس نے پورے چھ سال تک تعلیم حاصل کی۔

یہاں 1959 میں اُس کی "I Remember" کی ایک تحریر بہت اہم ہے۔میں چار سال کا تھا۔جب ٹالسٹائی سے پہلی بار ملا۔میری والدہ نے اُس کے اعزاز میں ایک کنسرٹ کا اہتمام کیا تھا۔پاسترنک لکھتا ہے کہ جب ٹالسٹائی کے اعزاز میں خصوصی طور پر آلات موسیقی کی صرف ایک تانت کو بجایا گیا میں چونک اٹھا۔ایک میٹھا سا تیز چبھن والا درد مجھے اپنے سینے میں محسوس ہوا۔یہ یقیناً میری موسیقی سے عشق کی ابتدا تھی۔

اگرچہ بورس موسیقی کو شاعری کے ہم پلہ ماننے سے انکار کرتا ہے تاہم حقیقت ہے

کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بقول پلنک جس نے پاسترنک کی موسیقی کا گہرا مطالعہ کیا ہے کا کہنا ہے کہ اس کی آوازوں کی رمزیت، الفاظ کی بندش، سُر تال کا ملاپ اور دل کو چھو لینے والے پُر اثر لفظ ان سب کو بہت خوبصورت بناتے ہیں۔

اپنی ماسکو سیاحت کے دوران جب میں ایلنیکا (Alinica) سٹریٹ کی سیر کرتی تھی۔ مجھے بورس پاسترنک کی پہلی محبت یاد آئی تھی۔ ماسکو کے چائے کے امیر ترین تاجران جن کی تیل بھری ٹوپیاں انیسویں صدی تک ہیٹوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اسی شاہراہ پر اُن کے کاروباری مراکز اور ملکی و غیر ملکی تاجروں کے زمین دوز خفیہ تجوری خانوں کی تفصیلات انیتا کو مجھے بتاتی تھی۔ ida wissotzkaya ایسے ہی ٹی مرچنٹ گھر گھرانے کی بیٹی تھی۔ جس کے آباؤ اجداد کی جیبوں کو بھاری کرنے میں روس کا محنت کش طبقہ کسی نہ کسی انداز میں دن رات ہلکان ہو رہا تھا۔ نشیلی آنکھوں والی ida wissotzkaya جسے بورس نے ہائی اسکول کی تیاری میں مدد دی تھی اور جس سے وہ محبت میں گرفتار ہوا تھا۔

مربرگ Marburg جرمنی میں دوبارہ ملاقات ہوئی کہ اُس کے والد کو ida کا پورٹریٹ بنانے کیلئے بلایا گیا تھا۔ وہ بھی اُن دنوں مربرگ یونیورسٹی کا ہی طالب علم تھا۔ باپ کے ساتھ وہ بھی جاتا۔ مربرگ یونیورسٹی سے ہی اُس نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔

دونوں کے درمیان وعدے وعید تو کچھ اتنے نہ ہوئے تاہم پسندیدگی کا واضح اشارہ ایڈا کی جانب سے ضرور ملا۔ پہلی جنگ عظیم میں بورس واپس روس آ گیا۔ ida کیلئے پروپوزل بھیجا۔ بے حد دولت مند خاندان نے بہت بُرا منایا اور بیٹی کو مجبور کرتے ہوئے لعن طعن کی۔

”کچھ شرم کرو۔ ایسے کنگلے خاندان سے ناطہ جوڑنا چاہتی ہو“

انکار بڑا دلبر داشتہ سا تھا۔

1920 - 1918 سول وار کے دوران اُس نے باہر جانے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی جیسا کہ اُس وقت کے بے شمار لکھنے والے ملک چھوڑ گئے تھے۔انقلاب سے محبت رکھنے کے باوجود اُس نے اُس طرز حکومت کو سخت ناپسند کیا جس میں سرخ فوجوں کا پیدا کردہ ڈر، خوف، دہشت اور بربریت کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی اشیاء کی کمیابی نے زندگی کو بہت مشکل اور تکلیف دہ بنا دیا تھا۔

شاعری اُس کی حسین چاہت تھی۔کم عمری سے ہی وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔1905 کے انقلاب پر اُس کی دو طویل نظموں نے بڑی دھوم مچائی۔یہی وہ دور تھا جب وہ نثر کی طرف بھی متوجہ ہوا۔کہانیاں بھی لکھیں۔"آٹوبائیوگرافی" اور "Luvers" کا بچپن بہت مقبول ہوئی۔

"Themes and variations" اور "Twin in the clouds" اُس کی جوانی کی شاعری ہے۔یعنی یہی کوئی 1914 اور 1917 کے درمیانی وقتوں کی۔جب وہ صرف چوبیس برس کا تھا۔ my sister, life بہت مشکل حالات میں چھپی۔یہ 1922 کا زمانہ تھا۔یہ روسی سوسائٹی میں بہت انقلابی ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کی شاعری پر بہترین کتابوں میں سے ایک سمجھی گئی۔اس نے پاسترنک کو نوجوانوں میں بہت مقبول بنا دیا۔ہمیں ان میں انقلاب سے پہلے کے روس کی جھلک بھی ملتی ہے۔

اِسی مجموعے کی ایک دلکش نظم The racing star ہے یہ نظم اُس لمحے کو بہت خوبصورتی سے قید کرتے ہوئے اُس کیفیت کو بیان کرتی ہے جب انیسویں صدی کے روسی شاعر الیگزینڈر پشکن نے "پیغمبر" لکھی تھی۔

اس نظم میں اُس نے اُن خوبصورتیوں کو دریافت کیا جسے اس سے پہلے نقادوں نے

قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔ یہ انداز اوسپ مینڈل کی شاعری پر بھی اثر انداز ہوا۔ اُس کی ماسٹر پیس نظم "Rupture" بھی اسی مجموعے میں ہے۔ اس دور کی شاعری میں اُس پر Immanuel Kant کی فلاسفی، اس کے محبوب شعرا جن میں پشکن اور جرمن شعرا سرفہرست تھے کے اثر کے ساتھ ساتھ ہم 1917 کے انقلاب کی رُوح کو بھی محسوس کرتے ہیں۔

1922 میں اس نے ایوگینیا Evgenia Lurye سے شادی کی جو آرٹ کے ایک بڑے ادارے کی طالبہ تھی۔ اسی سال ایک بیٹا پیدا ہوا۔

''ریسنر Reissner کی یاد میں'' اُس کی ایک بے مثل طویل نظم تیس سالہ کیمونسٹ لیڈر ریسنر کیلئے تھی جو چھوٹی سی عمر میں فوت ہو گیا تھا۔ اِس نے اُسے مقبولیت دینے کے ساتھ ساتھ اُس کے بارے میں اُس تاثر کو بھی زائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ انقلاب اور انقلابی لیڈروں سے نا اُمید ہو گیا ہے۔

تاہم ایک ٹھوس یہ حقیقت تھی کہ وہ نظام کے تہ وبالا ہونے اور مار دھاڑ سے مایوس ہوا تھا۔ اُسے امید تھی کہ انقلاب عام آدمی کی زندگی میں تبدیلی لائے گا اُن خوابوں، اُن امیدوں کو کہیں تعبیر ملے گی جو زمانوں سے انہوں نے دیکھے تھے۔ آنے والے دنوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ غلط باتوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔

اپنی بہن جوزیفائن کو لکھتے ہوئے اُس نے اپنے دکھ کا اظہار کیا۔

''میں ولادی میر مایا کووسکائے اور نکولائی سے تعلقات ختم کر رہا ہوں کہ انہوں نے ادب اور آرٹ کو کیمونسٹ پارٹی کی خواہشات اور ضروریات کے تابع کر دیا ہے۔ میرے لئیے اُن کی دوستی کو خیرباد کہنا کس قدر دشوار اور تکلیف دہ ہے مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ میں بہت مجبور ہوں۔''

یہ 1932 تھا جب اُس نے اپنی تحریر کو مزید آسان اور قابل فہم بنایا۔نثر کی طرف توجہ کی۔Safe conductاور The Second Birth اُس دور کی بہترین نثری کتابیں شمار ہوئیں۔اس کے کا کیشیائی حصّوں میں اُس کے خیالات کا اظہار جس طرح ہوا وہ قابل فخر ہیں۔ان کتابوں نے بیرون ملک اس کے اُن مداحوں کی تعداد میں اضافہ کیا جو کیمونسٹ نہیں تھے۔

1932 میں ہی وہ ایک بار پھر محبت کا شکار ہوا۔Zinaida Neigauz زینداکمپوزر کی بیوی تھی۔یہ محبت اتنی شدید تھی اور دونوں اتنے جنونی ہو رہے تھے کہ ان کے لئے طلاقیں لینے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔پس دل کی مانی اور شادی کر لی۔

اِس دور میں وہ مسلسل اپنی نظموں کی نوک پلک سنوارنے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد میں مصروف رہا۔اُس نے اپنی شاعری کو ایک نہج پر نہیں چلایا۔تبدیلیاں کرتا رہا۔اپنے سٹائل کو سادہ اور دلکش بناتا رہا۔ذاتی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، اپنی حساس طبیعت کے ہاتھوں ملنے والے دکھ اور مصائب، سماجی رویوں سے حاصل ہونے والے تجربات اور مشاہدات بھی اِن میں شامل ہوئے۔وہ اِن گوشوں اور پہلوؤں میں سانس کی طرح اُترا اور بہت نیچے تک اُترتا گیا۔

فطرت اُس کی نظموں کا بہت اہم موضوع ہے۔وہ درختوں، بوٹوں، پتوں، شاخوں، گھاس، پھولوں، بچھلوں نباتات اور جنگلی پودوں کی دنیا میں رہتا ہے۔فطرت اس کی نظموں میں کہیں بارش اور کہیں برفباری کے راستوں سے داخل ہوتی ہے۔ایک ایکٹرس کا کردار ادا کرتی ہے۔اس کی ہیروئن ہے۔کہیں خوشبو بکھیرتی ہے اور کہیں آکسیجن فراہم کرتی ہے۔

نقادوں کی رائے تھی کہ My sister life کی نظمیں ٹی بی کے مریضوں کیلئے

صحت کا پیغام ہیں۔ کہیں یہ آپ کو زندگی اور خوشی کے احساسات سے دوچار کرتی ہیں۔ کہیں یہ گنگنانے پر مجبور کرتی ہیں۔

شاعرہ مارینا Marina کہتی ہے ہم نے فطرت کے متعلق لکھا ہے مگر پاسترنک کو فطرت نے لکھا۔ اُس نے فطرت کی دنیا میں انسان کی جگہ کو بھی دریافت کیا ہے۔ اُس نے ہمیشہ کے روایتی کرداروں کو ریورس گیئر لگایا۔ یہاں ہم اُس کے انتہائی منفرد انداز دیکھتے ہیں وہ فطرت کو متحرک کرتے ہوئے اُسے اپنی گرفت میں لاتا ہے۔

اُس کی نظموں کے ٹائٹل کس قدر انوکھے اور منفرد ہیں۔

"فروری سیاہی لاؤ اور آنسو بہاؤ"۔ "روتے ہوئے باغ"، "walts with a tear in it"، "حیرت سے تکتے پھول" "کونے جہاں سے چورا ہے مڑتے ہیں"۔

اس کی شاہکار نظمیں جو موسم، جذبات اور دُکھوں کے امتزاج سے سج دھج کر صفحوں پر بکھریں۔ ذرا دیکھیے تو

"ایک خواب" " A dream"

کھڑکی میں سے جھانکتی خزاں کو میں نے خواب میں دیکھا

اور تم

ہجوم میں گھرے، نشے میں چور متوالے

مجھے اُس شکرے کی طرح نظر آئے

جو سر اور کندھے جھکائے

قربان گاہ کی طرف جاتا ہو

اور

میرا دل تمہاری کلائی پر بیٹھنے کیلئے بضد ہوا

winter night میں اس کے جذبات محسوس کریں

برف باری ہوتی رہی

ہوتی رہی

دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک

برف نے سب کچھ چھپا دیا

بس میز پر ایک موم بتی جلتی رہی

جلتی رہی

دو ننھے مُنے سے جوتے فرش پر گرے

بہت بھدے سے انداز میں

نائٹ سٹینڈ پر جلتی موم بتی اپنے آنسو بہاتی رہی

ایک خوبصورت لباس پر

ایک اور خوبصورت نظم "فروری سیاہی لو اور آنسو بہاؤ"

فروری سیاہی لو اور آنسو بہاؤ

لکھو نا کہ تم سسکیاں بھر رہی ہو

بہار کا کیا پوچھتی ہو

وہ تو ابھی تک برف کے کیچڑ میں

دھنسی، جلتی اور آہیں بھرتی ہے

"A walts with a tear in it" میں دیکھیے

اِن پہلے چند دنوں میں

آہ میں اِسے کتنا پیار کرتا ہوں

برف باری کے دن بیت گئے

اس کی تازگی اور ہریالی جنگل جیسی ہونے والی ہے

لیکن وہ بدنمائی اُس کی ہر شاخ میں ابھی بھی موجود ہے

مجھے انتظار ہے اُس وقت کا

جب نقرئی شعاؤں کے دھاگے سے

جیسے انہیں دھیرے دھیرے ہلائیں گے

اور چیڑ کے پھل دھیرے دھیرے چمکنے لگیں گے

موم بتی کی روشنی اور نیچے بچھی نقرئی چادر

اس کے بدنما ٹھنٹھوں کو ہماری نظروں سے چھپا لیں گے

اسی نظم کا ایک اور بند دیکھیے۔

اُس کی قسمت تو صرف چند صنوبر کے درخت ہیں

سنہری و آگ کی سی رنگت اور تمازت لیے ہوئے

بلندیوں کی طرف اس کی اڑان ہوگی

اُس عمر رسیدہ پیغمبر کی طرح

جو آسمانوں کی طرف محو پرواز ہوتا ہے

آہ میں اِسے کتنا پیار کرتا ہوں

ان کے پہلے چند دنوں میں

میں اسے کتنا پیار کرتا ہوں

جب ساری دنیا موج میلے میں مصروف ہوتی ہے۔

بنیادی طور پر وہ بہت مثبت اور رجائیت پسند تھا۔امید اور نوید دیتا ہوا۔ایک

خوبصورت شاعر اور لکھاری اُسکی Second Birth نثر کی کتاب میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔کہیں وہ بدلتے موسموں سے لطف اندوز ہوتا ہے، کہیں زندگی اور موت کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔اُس کی شاعری محبت کے آفاقی جذبوں کی تہوں میں اُترتی، سوال و جواب کرتی برائی اور برے رویوں اور کہیں خدا کے ساتھ تجدید تعلقات کے مرحلوں سے اپنے قاری کو بہت حسن و خوبی سے گزارتی ہے۔

On Early Trains میں بھی اُس کا یہ اثر برقرار رہا۔

سٹالن کی ہجو کا بھی قصہ بڑا دلچسپ ہے۔

یوں تو 1929 سے ہی سٹالن cpsu کا مستند لیڈر تسلیم کرلیا گیا تھا۔مگر آہستہ آہستہ بورس پارٹی اور سٹالن سے مزید متنفر ہوگیا تھا۔انہی دنوں اوسپ مینڈل نے سٹالن پر سخت طنزیہ نظم لکھی۔قابل بھروسہ دوست اکٹھے ہوئے۔کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بھی بند کیے گئے حتیٰ کہ روشن دان بھی۔مینڈل نے مدھم سی آواز میں پڑھنی شروع کی۔

ہم زندہ ضرور ہیں مگر
اُس دھرتی بارے سوچتے نہیں
جہاں ہم رہ رہے ہیں
کچھ دس قدم پرے یا نزدیک
تم سن ہی نہیں سکتے ہو
جو ہم کہتے ہیں
لیکن اگر لوگ موقع پر بات کریں
تو وہ کریملن کا کیشین کے بارے ہی ہوگی
اس کی موٹی انگلیاں بھدی ہیں

اور پھنسے والی مچھلی کی طرح پلی ہوئی

موزوں لفظوں کی تلاش اتنی مشکل

جتنے بھاری وزن دار پتھر

اُس کا کروچ کی مونچھیں بہت ڈراونی ہیں

بوٹوں کا اوپر چمکتا اور رچھب دار ہے

لیکن گردا گرد چھوٹی اور موٹی گردنوں والے

خوشامدی ٹٹو اور پٹھو ہیں

یہی اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں

کچھ تو سیٹیاں بجاتے

کچھ میاؤں میاؤں کرتے

اور کچھ سوں سوں کرتے ہیں

وہ اکیلا

گرجتا، دخل در معقولات کرتا

اور کش لگاتا

اپنے ہی اصولوں کو توڑتا

حکومتی فرمانوں کو سموں تلے روندتا

اپنے جبڑوں، اپنے ماتھے

اپنی آنکھوں اور بھنوؤں میں

ہر قتل پر خوش ہوتا

نظم سننے کے بعد بورس نے بے اختیار کہا۔

’’مینڈل تم نے کیا لکھ ڈالا؟ ہمارے جذبات کا اتنا حقیقی ترجمان۔‘‘ پھر وہ خوف سے لبریز آواز میں بولا۔

’’مینڈل تم سمجھو تم نے کچھ نہیں سنایا اور ہم نے کچھ نہیں سُنا۔ تم جانتے ہو بہت ظالمانہ چیزیں ہو رہی ہیں۔ لوگوں کو ان کا جرم بتائے بغیر اٹھا لیا جاتا ہے۔ دیکھو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اور کچھ پتہ نہیں کب کیا کیا کہانیاں بن جائیں؟ بس سمجھو تم نے کچھ نہیں سُنایا۔‘‘

بورس بھول گیا تھا کہ شاعری خوشبو کی طرح ہوتی ہے جسے دیواروں، بند دروازوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کوچہ کوچہ قریہ قریہ سفر کرتی کریملن پہنچ گئی تھی۔

مینڈل کو گرفتار کر لیا گیا۔ بورس سخت پریشان۔ ایک گرفتاری دوسرے یہ ڈر کہ کہیں اُس پر بے وفائی کا الزام نہ لگ جائے۔ سارے شہر میں وہ بھاگا بھاگا پھرا۔ اپنے بارے میں وضاحتیں دیتا ہوا کہ اُس نے تو کوئی بات نہیں کی تھی۔

ایسے ہی صبر آزما دنوں میں اُس کے اپارٹمنٹ میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کسی نے کہا۔

’’کامریڈ سٹالن تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔‘‘ پاسترنک تو گُنگ سا ہو گیا ایسی صورت کا سامنا تو اس کے کہیں گمان تک میں نہ تھا۔

ایک آواز ماؤتھ پیس میں سے اُبھری۔ سٹالن کی آواز، ایک جابر اور ظالم حکمران کی آواز۔ رعب اور کرختگی سے بھری ہوئی آواز۔

پاسترنک کی آواز میں گھبراہٹ، جھجک اور احمقانہ پن تھا۔ ایک سوال کے جواب میں اُس نے کہا کہ اس کے اور مینڈل کے خیالات میں بہت اختلاف ہے۔

ایسا ثابت کرنے میں اُس نے فضول وقت ضائع کیا۔ سٹالن نے اُس سے ادبی

حلقوں میں مینڈل کی گرفتاری کا ردِعمل جاننا چاہا۔اور یہ کہ اُس کی رائے اِس بارے میں کیا ہے؟

مینڈل حواس باختہ سا تھا اوسان تو اڑے ہوئے ہی تھے۔فوراً ہی انکار کرتے ہوئے بولا ''کہ اب ماسکو میں ایسے سٹڈی سرکلز کہاں رہے ہیں؟''

سٹالن نے ایک تمسخرانہ انداز میں یہ کہتے ہوئے وہ ایک کامریڈ سے بات نہیں کرسکتا فون بند کردیا۔

بہت سالوں بعد اپنے اُس وقت کے جذبات واحساسات پر اُس نے لکھا کہ وہ سخت خوف زدہ ہوگیا تھا۔جب اُس کے اوسان بحال ہوئے۔اُس نے دوبارہ رابطے کی کوشش کی کہ وہ اُسے بتائے کہ وہ بہت غلطیاں اور زیادتیاں کررہا ہے مگر کریملن سے ایک ہی جواب تھا۔

''کامریڈ سٹالن بہت مصروف ہیں۔''

حقیقت تو یہ تھی کہ اس کا پچھتاوہ ختم ہونے میں نہ آرہا تھا۔بعد میں اُس نے لمبا چوڑا خط بھی سٹالن کو لکھا۔اُسے ہمیشہ اس بات کا تاسف رہا کہ وہ صورت حال کو ہینڈل کرنے میں بہت بُری طرح ناکام رہا۔

دوسری جنگ عظیم میں جب نازی جرمنی اور سوویت یونین میں جنگ چھڑ گئی۔ ماسکو میں برفباری کی طرح کی بمباری شروع ہوگئی تھی۔پاسترنک فوراً رائٹرز بلڈنگ جو Lavrushisk st میں تھی کی چھت پر فائر وارڈن کی خدمات سرانجام دینے لگا۔اُس نے بہت بار ایسے بہت سے بموں کو تلف کیا جو وہاں گرے اور پھٹے نہیں۔فتح کے بعد سٹالن کے مظالم پر اُس نے ایک بار پھر لکھا کہ جنگ کی تباہ کاریاں یقیناً اُس سے بہت کم تھیں جو سٹالن نے رُوسیوں پر کیں۔

یہ 1946 کے دن تھے جب پاسترنک Olga ivinskaya اولگا اوونسکایا سے ملا۔ سنگل مدر جو نوامیر Novy Mir کے ہاں ملازم تھی۔ عجیب سی بات تھی کہ اُس کی غیر معمولی مشابہت پاسترنک کی پہلی محبوبہ ایڈا کے ساتھ تھی جس کی محبت ابھی بھی کہیں بورس کے دل میں تھی۔

اُس نے اپنی شاعری کے بہت سے والیوم اور نثر میں بہت سے تراجم اُسے پڑھنے کو دیئے۔ یہ عجیب سی محبت تھی۔ نہ اُس نے اپنی بیوی کو چھوڑا اور اولگا کے ساتھ بھی شادی جیسے تعلقات قائم کر لیے۔ جو اُس کی زندگی کی آخری سانسوں تک رہے۔ وہ روز اُسے فون کرتا۔ تھوڑا خوف زدہ بھی رہتا پر اُس کی رفاقت کیلئے مرا بھی جاتا۔

اولگا اونسکایا اپنی یادداشتوں میں جھانکتے ہوئے کہتی ہے۔ کبھی میں ہکلاتے ہکلاتے ہوئے کہتی۔

"سنو آج میں بہت مصروف ہوں۔ کام کا بہت بوجھ ہے۔ اِسے نپٹانا ہے مجھے۔"

لیکن ہوتا کیا؟ ہر سہ پہر کام کے خاتمے پر وہ بذات خود میرے دفتر میں آجاتا۔ ساتھ ساتھ پیدل چلتے مین بلیووارڈ کی شاہراہوں پر نکل پڑتا۔ کبھی کبھی ہنستے ہوئے کہتا۔

"جی چاہتا ہے یہ سکوائر تمہیں تحفے میں دے دوں۔"

میں ہنس پڑتی۔ اُس کی سادگی پر۔ محبت بھرے جذبے کی شدت احساس پر، معصومانہ سے انداز میں اظہار پر۔ یہ تعلق بڑا مسرور کن تھا۔ اولگا نے اپنی ہمسائی کا نمبر اُسے دے رکھا تھا۔ ہمسائی رازدار بھی تھی۔ جب رات کو فون آتا وہ پانی کا آہنی پائپ بجاتی جو دونوں گھروں کے درمیان تھا۔

اولگا مزید لکھتی ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ ملے تھے بورس اُس وقت ہنگری کے قومی شاعر سندور Sandor Petofi کا ترجمہ کر رہا تھا۔ اولگا کو اس کی ٹرانسلیشن دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

"یہ میرے جذبات کے صحیح عکاس ہیں جو میں تمہارے لیئے اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ تم انہیں پڑھو گی تو میں اور میرے جذبات دونوں کی ترجمانی ہو جائے گی۔"

اِس تعلق اور محبت کے بارے میں بورس کی بیوی کو پتہ چل جانے پر اُس کے ردِ عمل پر اولگا کا کہنا تھا کہ اُسے اپنے شوہر کی بے وفائی پر سخت غصہ اور رنج تھا۔ ایک بار جب اُن کا چھوٹا بیٹا سخت بیمار ہو گیا۔ بیمار بچے کے بیڈ کے قریب کھڑے اُس نے اپنے شوہر سے وعدہ لیا کہ وہ میرے ساتھ اپنے ہر تعلق کو ختم کر لے گا۔

اسی دوران میں سخت بیمار ہو گئی۔ اتنی شدید کہ وہ جو مجھے لعن طعن کرنے آئی تھی اُسے اور میری ہمسائی دونوں کو مجھے اسپتال لیجانا پڑا۔ میں اُس جیسی اُونچی، لمبی مظبوط جسم اور دماغ والی عورت کو دیکھتی رہی جس نے میرے بہتر ہونے پر مجھے بتایا کہ اُسے بورس سے محبت نہیں رہی تاہم وہ اپنے گھر کو ہرگز توڑنا نہیں چاہتی ہے۔

میرے صحت یاب ہونے پر بورس ہمارے گھر آیا۔ اس کے انداز میں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ میری والدہ سے پرسکون انداز میں باتیں کرتا اور اُسے یہ بتاتا رہا کہ وہ مجھے کتنا پیار کرتا ہے؟ اُس کے جانے کے بعد میں بھی اس کی اِن باتوں پر دیر تک ہنستی رہی۔

1948 میں پاسترنک نے اولگا اونسکایا کو نوو امیر Novy Mir کی ملازمت چھوڑنے کا کہا۔ ملازمت ان کے تعلقات کیلئے عذاب بنتی جارہی تھی۔ Potapov st پر انہوں نے ہماری "دُکان" کے نام سے ایک اپارٹمنٹ لیا اور ترجمے کا کام ذرا وسیع پیمانے پر شروع کر دیا۔

یہاں اولگاونسکایا کی ایک تحریر اُس کے طرزِ کار پر روشنی ڈالتی ہے۔

ہم ہندوستانی بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی نظموں کو روسی میں ترجمہ کر رہے تھے۔میں نے دیکھا تھا وہ لفظوں کے پیچھے نہیں بھاگتا تھا۔وہ اُن کی چاشنی میں انہیں ڈبوتا۔کبھی ساری ٹرانسلیشن نہ کرتا۔رس نکالتا اور پھوک پھینک دیتا۔

یہ 1949 کی ایک سرد شام تھی۔جب اولگاونسکایا کو کے جی بی نے گرفتار کیا۔وہ اپنی یادداشتوں میں اِس خوفناک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ جب ایجنٹوں کا ڈھیر اس کے اپارٹمنٹ پر حملہ آور ہوا۔وہ اس وقت ٹائپ رائٹر پر بیٹھی کورین شاعر Won Tu. Son کا ترجمہ کر رہی تھی۔

پاسترنک سے متعلق سارا کام انہوں نے اکٹھا کر کے سمیٹا اور مجھے Lubyanka جیل میں لے گئے۔مجھ سے بار بار بورس اور اس کی سرگرمیوں بابت پوچھا جاتا۔میں نے ہر بار انکار کیا۔اُس وقت میں بورس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور میرا وہ بچہ بھی جیلوں کی اِن ہی اذیتوں میں ضائع ہوگیا۔

یہاں لیوساپوپورا Liuisa Popora دونوں کی مشترکہ دوست کی تحریر ہمیں وہ تصویر دکھاتی ہے کہ بورس نے اِس صورت کا سامنا کیسے کیا؟ اپنی محبوبہ کی گرفتاری کا سنتے ہی اُس نے لیوساپوپورا کو فون کیا اور فوراً گوگول بلیوارڈ میں آگیا۔جب وہ وہاں پہنچی اس نے دیکھا تھا۔وہ ایک بینچ پر بیٹھا زار زار روتا تھا۔پاسترنک کے لہجے میں کیسا یاس گھلا ہوا تھا جب اُس نے کہا۔

''میرا تو سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔وہ میری متاعِ حیات کو لے گئے ہیں۔میں اُسے کبھی دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔اف میرے لیے یہ سب برداشت کرنا موت سے بھی زیادہ بدتر ہے۔''

یہاں ہمیں اُس کا مغربی جرمنی میں اپنے دوست کو لکھا ہوا خط بھی اُس کے جذبات کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

دیکھو وہ میرے لیے اور صرف میرے لیے جیل بھیجی گئی۔ سیکرٹ پولیس کو علم تھا کہ وہ میرے بہت قریب ہے۔ انہوں نے میرے بارے جاننے کیلئے اُسے اذیتوں کی کس بھٹی میں جلایا مگر اُس کے بند ہونٹ ایک لفظ بولنے کیلئے نہیں کھلے۔ میری زندگی اُسی کی مرہون منت ہے کہ وہ مجھے ہاتھ تک نہیں لگا سکے۔ میں اُس کے صبر، اسکی برداشت، اسکی محبت کا کتنا مقروض ہوں کوئی نہیں جان سکتا۔

یہاں اولگا کی بھی ایک تحریر اُس کی شخصیت پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔ میری قید کے دوران اُس نے سٹالن کو ہمیشہ قاتل کا ہی درجہ دیا۔ ادبی حلقوں، رسائل و جرائد اور اخباروں کے دفاتر میں لوگوں سے باتیں کرتے تکرار کیلیے چلا جاتا۔

"یہ خوشامدی، یہ درباری کاسہ لیس یہ جو دندناتے پھرتے ہیں۔ انسانی لاشوں پر اپنی خواہشات کے محل بناتے ہیں۔ کب؟ کب کوئی انہیں نکیل ڈالے گا۔"

Akhmatova کے ساتھ اُس کا اچھا وقت گزرا اور اُس نے ڈاکٹر ژواگو کے دوسرے حصے پر سنجیدگی سے کام کیا۔

اونسکایا کے تعلقات رہا ہونے کے بعد پاسترنک سے اِسی طرح دوبارہ جڑے جیسے ماضی میں تھے۔ وہ ماضی کی طرح ایک بار پھر اس کے حصار میں تھا۔

اِس دوران پاسترنک نے جارج آرویل کی Animal Farm انگریزی میں پڑھی اور لطف اٹھایا۔

ڈاکٹر ژواگو کے کچھ ٹکڑے 1920 - 1910 میں لکھے گئے مگر درحقیقت یہ کتاب 1956 سے پہلے مکمل نہ ہو سکی۔ اسے چھپنے کیلئے نوامیر کو دیا گیا جس نے چھاپنے

سے انکار کردیا کہ کتاب سوشلزم کی سچائی سے انکاری تھی ۔اس کے ہیرو یوری ژواگو کے ہاں انفرادی فلاح کی بہتری کا پہلو زیادہ اہم تھا بہ نسبت سوسائٹی کی ترقی کے ۔سنسر والوں اور تنقید نگاروں نے بھی اس کے کچھ پیراگراف کو اینٹی سوویت کہا ۔اینٹی سٹالنزم اور "معاشرے کی صفائی" پر بھی تنقید تھی ۔ناپسندیدہ لوگوں کو پارٹی سے نکالنے پر بھی بہت لعن طعن کا اظہار تھا ۔

انہی دنوں اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کے متعین کردہ نوجوان جرنلسٹ مسٹر میوڈی اینگلو جو سوویت کے سماجی اور ثقافتی حلقوں میں خاصا مقبول ہو رہا تھا اور جس کا میلان کے ایک پبلیشر سے کمیشن بھی طے تھا کہ وہ روسی لکھاریوں کے نئے مسودے حاصل کرے کہ جو مغربی قارئین کیلئے دلچسپی کا باعث ہوں ۔

شہر میں ڈاکٹر ژواگو کے بارے میں مختلف آرا کی گردش نے اُسے فوراً متوجہ کیا اور وہ پیریڈلکونو Peredelkino پہنچا جہاں پاسترنک اپنے ڈاچے میں مقیم تھا ۔اُس نے ناول کو اشاعت کیلئے Feltrinelli کمپنی کی پیشکش کی ۔پاسترنک پہلے تو ایک دم سراسیمہ سا ہو گیا ۔پھر وہ اٹھا اپنی سٹڈی روم سے مسودہ لاتے ہوئے اینجلو ڈی سے بولا ۔

"تو تم نے مجھے فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا ہونے کی دعوت دے دی ہے ۔"

یہاں ہمیں لیزر فلیش مین کے بیانات سے مزید راہنمائی ملتی ہے ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ پاسترنک کو احساس تھا کہ وہ ایک بڑا خطرہ مول لے رہا ہے ۔ایک بھی ایسی مثال نہیں تھی کہ جہاں کسی روسی مصنف نے کسی مغربی پبلیشر سے 1920 سے لے کر اب تک کوئی ڈیل کی ہو ۔اب طوفان تو متوقع تھا ۔تاہم پاسترنک کو تھوڑی سی یہ بھی امید تھی کہ فلٹرینیلی پبلیشنگ ہاؤس کی کمیونزم سے وابستگی اور تعلق شاید سوویت سٹیٹ کو نہ صرف اجازت بلکہ شائع کرنے پر بھی مجبور کرے ۔

تاہم جب معاہدہ ہو رہا تھا اُس کے ہر ہر لمحے میں پاسترنک کی زندگی کی دونوں

اہم عورتیں اُس کی بیوی زینڈا اور محبوبہ اولگا اونسکایا خوف زدہ تھیں۔ پاسترنک البتہ حوصلے میں تھا۔اس نے دوٹوک لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ ناول کی اشاعت کیلئے ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔اس کا خیال تھا کہ دنیا کو ایک اچھے ناول سے محروم کردینا زیادتی نہیں جرم تھا۔یہاں فلٹریلی پبلیشنگ ہاؤس کو بھی خراج پیش کرنا پڑے گا کہ انہوں نے سوویت کے ہر دباؤ کو ماننے سے انکار کر دیا۔سوویت گورنمنٹ نے پاسترنک پر بھی دباؤ ڈالا کہ مسودہ واپس منگوائے مگر اس نے اندرخانے پیغامات سے کہا کہ حکومت کے ہر دباؤ کو نظر انداز کیا جائے۔

ناول کے خلاف ایک مسلسل مہم چلانے کے باوجود ڈاکٹر ژواگو غیر کیمونسٹ دنیا میں اپنی اشاعت پر بے حد سنسنی خیز واقعہ ثابت ہوئی۔اسرائیلی ریاست میں بھی تاہم اس ناول پر سخت تنقید ہوئی۔یہودیوں سے متعلق اس کے خیالات و نظریات کھرے، سچے اور متاثر کن تھے۔پاسترنک نے اعتراضات پر صاف گوئی سے کہا۔

"میں تو مذاہب، قبائل اور نسل پر ایمان ہی نہیں رکھتا"

یہاں ہمارے سامنے فلیشن مین کا ایک بیان ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت پاسترنک بہت باقاعدگی سے ایسی عبادت گاہوں میں حاضری دینے لگا تھا جہاں عبادت مروجہ طریقوں کی بجائے لبرل طریقوں سے ہوتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ روسی یہودیوں کیلئے سٹالن ازم اور دہریے بننے کی بجائے عیسائی بننا زیادہ بہتر ہے۔

ژواگو کا پہلا انگریزی ترجمہ بہت جلدی میں ہوا۔ 1958 میں یہ منظر عام پر آ گیا اور پچاس سال سے زیادہ عرصے تک یہی رہا۔کتاب بیسٹ سیلر کے طور پر لسٹ پر رہی۔اونسکایا کی بیٹی بھی اِس کتاب کی ٹائپ شدہ کاپیاں بانٹنے میں سرگرم رہی۔یہ بڑی پرلطف سی بات تھی کہ سوویت نقادوں نے بین کردہ ناول نہیں پڑھا۔پھر بھی پریس میں یہ

سرگرم موضوع رہا۔ ایک لطیفہ بھی زبان زدعام ہوا۔

"اگرچہ میں نے پاسترنک کو نہیں پڑھا۔ مگر اس کی مذمت کرتا ہوں۔"

مصنف کو اندرون اور بیرون ملک اپنی آخری زندگی تک بے شمار ایسے خطوط ملتے رہے جس میں کتاب پر اچھے برے تبصرے ہوئے۔ اس ضمن میں اس کی ایک دوست Ekaterina Krashennikova کا خط ہمارے سامنے ہے۔ جس میں وہ لکھتی ہے۔

"پاسترنک مت بھولو یہ بات کہ تم نے یہ کام کیا۔ یہ تو روسی لوگ ہیں۔ یہ تو ان کے مصائب اور اُن کے دُکھ ہیں جنھوں نے تم سے یہ کام کروایا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تمہارے قلم کو یہ طاقت دی۔ ہاں میں یہ ضرور کہوں گی کہ تمہارا کیمیکل فیکٹری میں کام کرنے کا تجربہ تمہیں مالا مال کر گیا۔"

ناول نے چونکہ بین الاقوامی سطح پر بہترین پڑھی اور لکھنے والی کتاب کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ اب استعماری طاقتوں کو بھی سیاست کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ برٹش ایم 16 اور امریکی سی آئی اے نے اِسے نوبل پرائز دلوانے کی مہم جوئی شروع کردی تھی۔ ایسا اس لیے بھی کیا جارہا تھا کہ ظاہر تھا پاسترنک کو نوبل ایوارڈ کا ملنا سوویت یونین کے وقار اور معتبریت کو نقصان پہنچانے کا موجب بنتا۔ دونوں بڑی طاقتیں سرگرمی سے اس پر عمل پیرا تھیں۔

23 اکتوبر 1958 کو ادبی ایوارڈ بورس کو دینے کا اعلان ہوا۔ پچیس اکتوبر کو بورس نے سویڈش اکیڈیمی کو شکریے کا تار بھیجا۔ اس میں حیرت، خوشی و مسرت اور فخر کے سے جذبات کا اظہار تھا۔

یہی وہ دن تھا جب ماسکو کے ادبی حلقوں نے اپنے تمام طلبہ سے ایک مطالبہ کیا

کہ وہ سب ایک مظاہرہ کرنے کا اہتمام کریں جسمیں اُسکا نہ صرف ایوارڈ سے انکار بلکہ یہ مطالبہ بھی کہ بورس کو جلاوطن کیا جائے۔ اسی پر اکتفا نہ ہوا۔ اس مہم جوئی کو حکومتی سطح پر دہرایا جانے لگا۔

صورت ایسی گھمبیر اور کشیدہ ہوگئی کہ اُس نے پریشان ہو کر ایک دوسرا تار بھیجا۔ انکار کا، اپنی مجبوری کا۔

تاہم سویڈش اکیڈیمی نے اعلان کیا۔ یہ انکار ایوارڈ پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوگا۔ یہ سویڈش اکیڈیمی کے پاس رہے گا۔ ہاں اس کی تقریب نہیں ہوگی۔ اِس سب کے باوجود سوویت کے لکھاریوں نے پاسترنک کو ملامت کرنا نہ چھوڑا۔

وہ لکھتا رہا۔ لکھتا رہا۔ When the weather clears جیسا شاہکار اُس کے اسی آخری دور کی یادگار ہے۔ شاعری کا ایک لاجواب مجموعہ۔

پھیپھڑوں کے کینسر میں مبتلا ہو کر اذیتیں سہتا، اپنے دکھوں پر کڑھتا وہ 30 مئی 1960 کو اپنے ڈاچا میں فوت ہوگیا۔

سچ تو یہ ہے کہ 1930 کی کیمونسٹ حکومت نے اس کی شاعری کو زندہ درگور کر دیا۔ ایک طویل تاریکی کا دور۔ جہاں وہ ترجے جیسے کاموں سے زندگی کو گھسیٹتا رہا تھا۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ انقلاب کے ساتھ ردِ انقلاب کا لاحقہ بھی جڑا ہوتا ہے۔ شاعروں، مصنفوں، موسیقاروں اور فنونِ لطیفہ کے ماہروں نے اکتوبر انقلاب کی آبیاری اپنے خون سے کی۔ یڑاٹسکی، میکسم گورکی، مایا کوفسکی۔

لیکن وہ جو انقلاب میں کہیں عقبی سیٹوں پر تھے، ناقابل اعتبار تھے۔ فرنٹ لائن پر آ گئے اور شاعر کی اس شعر کی تفسیر بن گئے۔

"منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔"

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اپنے ملک کی تاریخ چھوٹی بڑی جزئیات کے ساتھ میرے سامنے آگئی تھی۔

اور پھر وہ تاریخ کا آگے بڑھتا ہوا پہیہ گھما کر اُسے وہیں لے جاتے ہیں جہاں سے وہ شروع ہوا تھا۔ ''انقلاب کے نقیب'' کا خطاب پانے والا مایاکوفسکی جیسا شاعر اور ڈرامہ نگار نہ سٹالن سے ہضم ہو رہا تھا نہ اُس کی بیوروکریسی سے۔ 1930ء میں اُس کی خودکشی اِس نوکرشاہی کے خلاف بڑا واضح احتجاج تھی۔

ٹراٹسکی جیسے دانشور کو سٹالن کے ایجنٹ رامون مرکیڈور نے 1940ء میں میکسیکو میں قتل کروا دیا اور 1960ء میں اُسے سیاسیات پر لینن ایوارڈ سے نوازا گیا۔

عظیم شاعر اوسپ مینڈل کا بھی یہی حشر ہوا۔

شوستا کووچ کی چھٹی سمفنی پر سٹالن نے خود پابندی لگائی۔

بورس پاسترک نے خودکشی تو نہ کی۔ پر زندگی کی تلخیوں نے اُسے پھیپھڑوں کے کینسر میں مبتلا کر دیا تھا۔ 1858ء میں سویڈن نے جب ڈاکٹر ژواگو پر اُسے نوبیل پرائز دیا۔ اُس نے خوشی کا اظہار کیا کیا۔ جیسے اُس کے خلاف نفرت کا طوفان کھڑا ہو گیا۔ اُسے غدار کہا جانے لگا۔ الزامات اور اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ملک بدری پر اصرار ہوا۔

ہندوستان اور پاکستان کے اہل قلم آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔

میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں کیونکہ اس کی اپیل مجھے یاد آئی تھی صدر مملکت کے نام۔

''کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا ہے کہ روس میرے لئے کیا ہے؟ میرا کام میرا نام میری عزت اور موت سب رُوس سے ہیں۔ مجھے کسی نوبیل پرائز کی نہیں صرف اپنے وطن کی

ضرورت ہے۔میرا وطن رُوس ۔"

اور نوبیل پرائز لینے سے اُس کا انکار ہوا۔

اور آنسوؤں کی بوچھاڑ تھی جو میرے گالوں پر بہہ رہی تھی ۔اُسے اتنی تاویلیں دینے کی ضرورت تھی ۔ہائے یہ اہلِ اقتدار۔

اُس کی موت پر ایک بڑے ہجوم کے سامنے باوجود حکومتی ڈر اور خوف کے ایک نوجوان نے اونچی اور غصیلی آواز میں اُس کی بین شدہ نظم ہیملٹ Hamlet پڑھی۔

پھر ایک بڑے مقرر نے اپنی آواز کی پوری طاقت سے قبرستان میں مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

خدا کے نامزد لوگوں کے راستے کانٹوں سے بھرے ہوتے ہیں۔پاسترنک کو بھی خدا نے منتخب کیا۔وہ ابدیت پر ایمان رکھنے والا سچا اور کھرا انسان تھا۔ہم نے ٹالسٹائی پر لعن طعن کی۔ہم نے دوستوفسکی کو دھتکارا اور اب ہم پاسترنک کو بھی اسی سولی پر چڑھا رہے ہیں۔ہر وہ چیز جو ہمارے لیے عزت اور شہرت لاتی ہے۔ہم اسے مغرب کے حوالے سے بین کرتے ہیں۔لیکن اب ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔

اُس کی آواز بھرّا گئی تھی ۔آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی ۔اور جب اس نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔اس کا لہجہ جوش وجذبے سے لبریز تھا۔

"ہم پاسترک سے پیار کرتے ہیں۔اور ہم اس کا ایک عظیم شاعر،ایک عظیم مصنف کے طور پر اعتراف کرتے ہیں۔پاسترنک ہمیشہ ہمارے دلوں میں اور اپنے قارئین کے دلوں میں زندہ رہے گا۔"

☆☆☆

الیگزینڈر پشکن

رُوس کا بے بدل عظیم قومی شاعر الیگزینڈر پشکن

- ایوگےنی انے گن Eugene onegin رزمیہ شاعری کے منظوم ناول اور طویل بیانیہ نظم "رُسلان اور لُدمیلا" نے روسی شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے سجا کر دنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا۔
- باغیچہ سرائے The Fountain of Bakhchisarai کی طویل نظم حرم کی عورتوں کی زندگی، ان کے نفسیاتی و جذباتی مسائل، خواجہ سراؤں کے کردار، سلطان کے حرم کے اندر زندگی گزارنے کا ڈھنگ، تاتاری گیت اور اُن گیتوں کے کرداروں کی دلآویز اور دلکش تصویر ہے۔
- اُس کی شاعری کے حسن میں نئے رنگ بھرنے میں اُن ذی علم منچلوں کا بھی ہاتھ ہے جو اپنے حقوق کے لئے جلوس نکالتے، ہڑتالیں کرتے اور زار کے خلاف سازشوں کے جال بنتے رہتے۔
- کیٹس کی طرح وہ بھی تھوڑی عمر لکھوا کر لایا تھا۔

''زندگی کی شام''

میں موت کی تمنا کیوں کروں
مجھے زندہ رہنے کی شدید تڑپ ہے
فکر و آگہی سے میرا گہرا تعلق ہے
غم سے بھی مجھے نسبت اور عرفان ہے
دنیا کی تنقید اور ستم بھی سہنا ہے
کہ میرے شاعرانہ افکار ذمہ دار ہیں
انہی شعلوں اندر زندگی بسر کرنے کا
لطف و سرور ہے
کبھی کسی مترنم آواز کی لہریں
دل کو سرور دے جاتی ہیں
کبھی یونہی اشکوں کا سیلاب بہہ جاتا ہے
کیا خبر جب میری عمر کی ڈھلتی شام ہو
عشق دے جائے تبسم کا چھلکتا ہوا جام

الیگزینڈر پشکن

اس اپارٹمنٹ کی کونسی چیز ایسی تھی جو اپنی تاریخی حیثیت میں کم قیمتی ہونے کے باعث کم تر توجہ کے قابل تھی۔شاید کوئی بھی نہیں۔پھر میں نے اُس کمرے میں کیوں ڈیرہ لگا لیا تھا جو اُنکی خواب گاہ تھی اور جہاں نتالیا کا دلکش پورٹریٹ اور تصویریں آویزاں تھیں۔

کوئی چہرہ اس ظالمانہ حد تک بھی خوبصورت ہوسکتا ہے۔جیسا دیواروں پر ٹنگا یہ۔ میری آنکھوں کی ایکس رے مشین اسکے ایک ایک نقش کی باریکی میں اُتری تھی ۔اسکے بالوں کے براؤن سنہری شیڈ نے بے اختیار ساحلوں پر ڈوبتے سورج کے شفق رنگوں کی مجھے یاد دلائی تھی۔یہ فنکار کے نوک برش کا مبالغہ ہرگز نہیں تھا۔وہ ایسی ہی تھی ۔ماسکو اور دارالحکومت پیٹرزبرگ کی کورٹ سوسائٹی کی سب سے زیادہ زبان زد شخصیت۔

یہ رُوس کے بے بدل عظیم قومی شاعر اور نثر کے بڑے لکھاری الیگزینڈر سرگیوچ پشکن (Aleksandr Sergeevich Pushkin) کا گھر تھا ویسے تو دراصل یہ جگہ شہزادی والکنو سکایا کی ملکیت تھی۔پر زارشاہی کیطرف سے پشکن کو رہائش کے لئے

عنایت ہوئی تھی۔یہاں اُسنے اپنی زندگی کا ایک سال گذارا۔اسکی موت کے بعد اسے میوزیم بنادیا گیا۔

بڑی تھوڑی سی زندگی۔26 مئی 1799ء کی پیدائش اور 10 فروری 1837ء کو وفات۔درمیانہ مختصر ساوقت ہنگاموں، باغیانہ سرگرمیوں، بغاوتوں، رومانوں اور تخلیقی کاموں میں بسر ہوا۔

”کیٹس کیطرح بھلا اتنی کم عمر کیوں لکھوا کر آیا تھا۔میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا“۔

ہماری واپسی اب سر پر تھی سات دنوں کا ہواؤں میں اُڑتے ہوئے پتہ بھی نہ چلا تھا۔اور ابھی تک اسے دیکھا نہیں گیا تھا۔پشکن میوزیم نہ دیکھا جاتا تو میرے لیے آگرہ پہنچ کر تاج محل نہ دیکھنے والی بات ہو جاتی تھی۔جو مجھے قطعاً قبول نہ تھی۔پس بھاگی۔الیگزینڈر رکالم کے پاس مویا کا نہر کے کنارے پر خوبصورت سہ منزلہ اور دو منزلہ عمارتوں کے حصار میں گھری نمبر بارہ کے سامنے جارکی۔

میں نے پشکن کو نہیں پڑھا تھا۔جب رُوس کیلیئے تیاری کے مراحل میں تھی ذوالفقار تابش ایک دن فون پر تھے۔تابش صاحب میرے دیرینہ کرمفرماہیں۔محبت سے گویا ہوئے۔

”تم نے کن کن رُوسی لکھاریوں کو پڑھا ہے“۔

جنہیں پڑھا تھا گنوادیا۔سوال ہوا پشکن نہیں پڑھا۔میں کتاب بھیج رہاہوں۔اُسے پڑھے بغیر نہ جانا۔

سچی بات ہے میں ممنون بھی ہوئی اور دعا بھی دی کہ چلو میرا ایک عظیم شاعر سے ابتدائی تعارف تو ہوا۔ظ انصاری صاحب کا منظوم ترجمہ بھی کمال کی چیز تھی۔

بلند و بالا ہر اوُن محرابی دروازے سے اندر داخل ہوئی۔تو ایک شاہانہ عظمت کا پرتو ہر سو بکھرا ہوا نظر آیا تھا۔یہ میوزیم دوستو وسکی سے بہت مختلف تھا۔محرابی صورت والے برآمدوں سے آگے وسیع لان جسمیں گول چبوترے پر کھڑا پشکن دراصل اپنی عظمت کے بلند مینار پر کھڑا ہے جسکا اعتراف اسکی موت کے بعد ہوا۔

شاعر اپنے ددھیالی حوالے سے رُوسی اشرافیہ کی اونچی کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ماں ایتھوپیا کے ابرام پیٹر ووچ ہنی بال کی نواسی تھی جسے افریقہ میں اغوا کر کے قسطنطنیہ لایا گیا اور عثمانی سلطان نے اسے پیٹر اعظم کو تحفے کے طور پر بھیجا۔پیٹر اعظم کو اپنا یہ خادم بے حد پسند تھا۔اُسکی شادی خاص طور پر منصب دار گھرانے میں کی گئی۔

میں اُس وقت ڈرائینگ روم میں تھی۔آسمانی رنگ کی دیواروں والا کمرہ جسکا سامان آرائش بے حد سادہ اور مختصر تھا۔دیوار پر پشکن کا پورٹریٹ سجا ہوا تھا۔

اُلجھے اُلجھے گھنگھریالے بال موٹی آنکھیں اور موٹے ہونٹ رخساروں پر پھیلی پر ٹھوڑی پر سمٹی ہوئی داڑھی۔پشکن اپنے افریقہ سے تعلق پر ہمیشہ نازاں رہا۔اور جب کبھی بھی اسکا سانولا رنگ اسکی گرم مزاجی اسکی باغیانہ طبیعت اور خودسری زیر بحث آئی اُسنے ہمیشہ مسرور لہجے میں کہا۔

"مجھے اپنے مشرق سے تعلق پر فخر ہے۔اور افریقیوں سے مجھے قلبی محبت ہے"۔

اور اُسکا اظہار اسکی شاعری میں کہیں کہیں پر کہانیوں اور تاریخی ناولوں میں خاصی مقدار میں ہوا۔

کمرے میں رکھی میزوں پر خوبصورت شمع دان، ٹیبل لیمپ اور اُس کی شاعری کے دستی نمونے سجے تھے۔

جس ماحول میں اُس نے آنکھ کھولی تھی وہ گھر بھی علم و ادب کا گہوارہ تھا۔اُس کا چچا

شاعر، اُس کی پھوپھیاں ادب شناس اور اُس کے گھر میں اُس وقت کے رُوسی ادب کے مایہ ناز ادیبوں جن میں نکولائیا کرامزن Nilolai Karmzin اور ویسلیے زکوسکائے ۔

Vsily Zhulov Sky کا کثرت سے آنا جانا تھا۔ اُس کے باپ کے گھر کی الماریاں اگر فرانسیسی ادب سے مالا مال تھیں تو جس گھر میں اُس نے اپنی آخری سانسیں لیں وہاں بھی فرنچ لٹریچر کثرت سے تھا۔

میں اُس وقت اُس کے سٹڈی روم میں تھی۔ جہاں سبز دیواروں کی چھتوں کو ہاتھ لگاتی الماریاں پاؤں سے سر تک انتہائی قیمتی کتابوں سے سجی ہوئی تھیں۔ دراصل اُس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی اس میں فرانسیسی کلچر اور ادب رُوسی کلچر اور ادب کے ساتھ بہت نمایاں تھا۔ اُس کے گھرانے کے بچوں کے لئے نوکر چاکر اگر دیہاتوں سے آتے تو ایک اتالیق کا فرانسیسی ہونا بھی ضروری تھا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ وہ بہت چھوٹی عمر میں سترھویں اور اٹھارویں صدی کے فرانسیسی ادب سے روشناس ہو چکا تھا۔

اُس کی میز پر کاغذ پڑے تھے۔ بڑا خوبصورت ٹیبل لیمپ سجا ہوا تھا۔ ایک جانب کتابوں کا ڈھیر تھا۔ ایش ٹرے، ڈیکوریشن پیس اور بڑے خوبصورت پیپر ویٹ تھے۔ کرسی کا رُخ ذرا سا ٹیڑھا تھا یوں جیسے کوئی لکھتے لکھتے کسی کام سے اُٹھ کر باہر چلا جائے۔ وہ بھی تو شاید ہی اُٹھ کر باہر گیا تھا اور پھر اس کرسی پر دوبارہ بیٹھنا نصیب نہ ہوا تھا۔

اُس کی پیدائش ماسکو کی تھی۔ ابھی بھی اُس کے والدین اور رشتہ داروں کی تصویریں دیکھتی ہوئی باہر آئی تھی۔ باپ سرجی لیووِوچ Lvovich اگر اپنی ظاہری ہیئت میں رومانوف کے زبردست زاروں جیسا تھا تو ماں نادیزدا ہنی بال بالشت بھر لمبی گردن پر ٹکے خوبصورت چہرے والی متکبر اور رعونت پسند عورت نظر آئی تھی۔ یوں عملی زندگی میں وہ تھی بھی ایسی ہی۔ بچوں سے لاپرواہ اور لاتعلق سی۔ پشکن کی شاعری میں ماں کا ذکر نہیں۔ ہاں

البتہ اپنی آیا سے محبت کا کئی بار اظہار ہے۔

اس شرارتی ضدی اور ہٹ دھرم سے بچے کو گیارہ سال کی عمر میں سکول کے جس بورڈنگ ہاؤس میں بھیجا گیا۔وہ الیگزینڈر اوّل نے روس کے اعلیٰ طبقے کے بچوں کیلئے Tsarkoye Selo میں امپریل لائسیم کے نام سے قائم کیا تھا۔پشکن منفرد اور مشکل بچہ تھا۔رُوسی اور فرانسیسی لٹریچر میں اسکی کارکردگی بہت نمایاں تھی۔باقی مضامین میں بس گذارہ تھا۔

اُسکی شاعرانہ صلاحیتوں نے بھی اسی عمر میں پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے۔یہاں اُسکا ہدف اُسکے ناپسندیدہ ہم جماعت اُستاد خاص طور پر مذہبی تعلیم اور سرکاری کارندے بنتے مگر اس قیام نے اُسے ذہنی اور فکری بلوغت بھی دی۔

صرف سولہ سال کی عمر میں اُسنے رُوسی اشرافیہ کے ایک بڑے اجتماع میں اپنی نظم سنائی۔داد کمیٹی اور لوگوں نے یک زبان کہا۔"مستقبل میں روس کا عظیم شاعر ہوگا۔"

"ریپن" کی یہ پینٹنگ میں نے بڑے کمرے میں دیکھی تھی۔کرسیوں پر بیٹھے عمر رسیدہ اُدھیڑ اور نوجوان مردوں عورتوں کا ایک ہجوم ایک طرف دھری میزوں کے آگے کرسیوں پر بیٹھے غالباً جج صاحبان اور عین درمیان میں نوخیز سا لڑکا ہاتھ اٹھائے نظم پڑھتا ہوا۔کس غضب کا انداز تھا۔

نپولین کا رُوس پر حملہ آور ہونا اور اُس کا شکست کھانا۔فوجی جوانوں کا سکول کے دیوار کے پاس سے مارچ کرتے اور ترانے گاتے ہوئے گذرنا اور اُسکا انہیں دیکھنا اُسکی اوائل عمری کے وہ نقش تھے کہ جنگی کیفیات کے عکس اُسکی آئندہ شاعری میں نمایاں ہوئے۔اسی طرح یورپ سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ترقی پسند خیالات کے ساتھ واپس آکر مجلسوں اور محفلوں میں لکچر دینا،مباحثے اور مذاکرے کرنا اور اسکی اُن میں مسلسل شرکت نے

اُسکے فکری شعور کی تربیت کی۔

میوزیم کے کمروں کے دروازے اندر ہی اندر ایک دوسرے میں کھلتے چلے جاتے تھے۔کہیں بچوں کے کمرے، کوئی نشست گاہ تو کوئی ستالیا کا ڈریسنگ روم۔کمروں کا جدا گانہ رنگ وروپ انہیں انفرادیت دینے کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوق کا بھی حامل تھا۔

تھوڑی سی دیر کیلئے برآمدے میں پڑی بینچ پر بیٹھی تو پشکن کی زندگی کے کچھ نئے پہلو سامنے آگئے تھے۔ملازمت سرکاری ملی اور اونچی بھی تھی۔رئیسانہ ٹھاٹ بھاٹ تو پہلے ہی تھے۔یہ دور مکمل لعو ولعب اور عیاشیوں میں گذرا۔ناچ گانے، تھیٹر جوئے بازی، شراب نوشی ،مذہب اور حکومتی اراکین پر طنز ومذاق تو خیر عام سی باتیں تھیں۔

جلد باز بھی تھا اور جذباتی بھی۔ذرا سی بات پر گولی سے فیصلہ کرانے پر مصر ہو جاتا۔اسکے احساسات و جذبات کی بے باکی نے جنس، رومان اور سیاست پر اسکی خوبصورت طبع آزمائی کو بطور ایک رومانی شاعر کے اُسے اہم کیا۔

اُسکی طویل بیانیہ نظم ''رُسلان اور لُدمیلا'' روسی معاشرے کی ایک فوک عشقیہ داستان منظر عام پر آئی۔تین ہزار مصرعوں کی اس نظم نے روسی شاعری کو نئے رنگ وآہنگ سے سجا کر دنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا۔

پھر ایک حیرت انگیز اور عجیب سی بات ہوئی بے حد عجیب۔

کوئی تیس (30) بتیس (32) کے دائرے میں گھومتی ایک قدرے فربہی مائل جسم کی دراز قامت لڑکی میرے پاس آکر رُکی۔اُسنے میری طرف دیکھا اور دو سوال پوچھے۔پہلا سوال تو چلو سیاحوں سے ہر کوئی پوچھنے کا حق رکھتا ہے کہ آپ کہاں سے ہیں؟ لیکن دوسرے سوال نے مجھے حیرت کے سمندر میں پھینک دیا تھا۔میں اس کا چہرہ دیکھتی تھی کہ آخر اس درجہ باریک بینی سے اُسے میری حرکات کا مشاہدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے مسکراتے ہوئے اُسکا بازو پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا۔

تاریخ میں اپنا نام بڑے آدمی کے طور پر لکھوانے والے لوگوں کے محبوب یا انکے زوج کے بارے میں جاننے کا بالعموم فطری تجسس ہر کسی کو ہوتا ہے۔ نتالیا کی تصویروں کے سامنے دیر تک کھڑے ہونے کی وجہ یہی احساس اور یہی فطری تجسس تھا۔

''خبیث عورت''۔

اُسنے ہونٹ سکوڑے اور ایک ایسے لہجے جس میں دُکھ گُھلا ہوا تھا بولی۔

ایسے بے مثال شاعر جس نے تھوڑے سے وقت میں رُوسی ادب کو اتنی بے شمار جہتیں دیں۔ اسکی بے وفائی اور کٹھورپن کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یوں اگر وہ اسکے عاشق جارج دی انتھیس کے ساتھ ڈوئل میں اُسکی گولی کا نشانہ نہ بھی بنتا تب بھی ایکدن اُسنے مرجانا تھا۔ بس یہی ایک دو سال اور جی لیتا۔ گُھٹن اور پریشر نے اسکا سینہ پھاڑ دینا تھا''

میں بٹر بٹر اسکا چہرہ دیکھتی تھی۔

ایسی شُستہ انگریزی بولتی تھی کہ اپنے نو دن کے قیام میں ایکدن بھی اتنا رواں لب ولہجہ سننے کو نہ ملا تھا۔ وہ مالدویا کے دارالخلافہ کیشنیف (Kishinev) کی ساشا تھی جو لندن کی کسی یونیورسٹی میں رُوسی ادب پڑھاتی تھی۔ ان دنوں پیٹرزبرگ آئی ہوئی تھی۔ اور اُس ٹورسٹ گروپ کی منتظر تھی جس نے دو بجے میوزیم پہنچنا تھا۔ پُشکن کی سچی عاشق۔

میں گنگ سی بیٹھی اسے اتھاہ حیرت سے دیکھتی تھی۔ مغربی پہناوے میں لپٹی اس لڑکی کے اندر کیسی مشرقی روح تھی۔ ایسے خیالات واحساسات تو ہم تیسری دنیا کی عورتوں کے ہوتے ہیں جنہیں بڑا دقیانوسی کہا جاتا ہے۔

محبت کے خمیر میں گندھی ساشا کی قربت مجھے اُس سرد سرزمین پر بہار کے کسی معطر جھونکے کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔

اسکی Ode To Liberty پڑھی ہے آپ نے؟ ساشا نے میری طرف دیکھا۔میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دراصل اسکی یہی نظم اُسکی جلاوطنی کا باعث بنی تھی۔اس نظم میں زار رُوس "الیگزینڈر راول" کے اُس ظلم وزیادتی پر بھرپور احتجاج اور دکھ کا اظہار تھا جسکا وہ اپنے والد پال اوّل کو قلعہ میخائلوسکائے میں دھوکے سے قتل کرنے کا مرتکب ہوا تھا۔

پر یہ جلاوطنی بڑی نعمت ثابت ہوئی تھی۔رُوس کی جنوبی ریاستوں کوہ یورال، کوہ قاف کی وادیوں بحیرہ ارل اور بحیرہ کیسپین کے ساحلی علاقوں نے اُسکے مشاہدے، اسکے تجربے اور انسانی فطری رویوں کے مطالعے نے اسکے علم میں اضافہ اور تخلیقی کام میں رنگ بھرا۔تُرکوں، چرکسوں، تارتاریوں، جارجیائی اور کاکیشیائی قبائل کے لوگوں سے میل جول اور جنوب کے علاقائی حسن، سادگی اور تصنع سے پاک ماحول اسکی شاعری پر کئی جہتوں سے اثر انداز ہوا۔اس دور کی شاعری پر لارڈ بائرن کا بھی اثر ہے۔"Sea" اسکی واضح مثال ہے جہاں وہ بائرن کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اُسکے دنیا سے جانے پر افسردہ ہے۔

"The Caucasian Captive" کوہ قاف میں رہنے والے قبائل چرکسوں اور کاکیشیوں کے ایک روسی قیدی کی زبان سے اُنکے رہن سہن، اُنکی دلیری شجاعت، اُنکے گھوڑوں کے اوصاف، انکی مہمان نوازی کا ذکر کرتے ہوئے وہ رُوس کے جیالے سپہ سالاروں کو بھی خراج تحسین پیش کرتا ہے۔جنہوں نے ان قبائل کے ساتھ سرحدی لڑائیوں میں دادِ شجاعت دی تھی۔

مستی سلاف کہ جب روسی فوج ماری گئی تھی اور وہ تن تنہا لڑا اور فتح یاب ہوا۔

اسکے لہجے کا فخر اور غرور بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔جب وہ کہتا ہے روس کا دوسر والا عقاب سے سجا پرچم فضا میں لہرایا تو ہم کسقدر مسرور اور سرخرو تھے۔

روسی جرنیل سیسیانوف کا ذکر کرتے ہوئے بھی اس کا انداز اُسی تفاخر میں ڈوبا ہوا ہے کہ جب شمالی قازقستان کے تیریک دریا کے پانی لہو بن گئے تھے۔اُن چٹانوں اور پانیوں پر سیسیانوف کی پیشانی کی چمک تھی۔روسی جرنیل یرمولوف کے بارے میں لکھتے ہوئے قازق لوگوں کو خبردار کرتا ہے۔

''ذرا سن اے قازق یرمولوف آتا ہے۔''

مجھے ہنسی آ گئی تھی۔کتنا مانوس سا یہ فقرہ تھا۔میں نے ساشا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

ساشا مجھے تمہارے اِس فقرے سے اپنے لوگ یاد آ گئے ہیں جو اپنے اپنے سیاستدانوں کے لئے کہتے ہیں۔

ذرا ٹھہرو قاضی حسین آتا ہے۔ذرا سُنو نواز شریف آتا ہے۔ذرا سُنو بے نظیر آتی ہے۔

ساشا کِھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔اس کی ہنسی مجھے باغیچے میں سبز گھاس پر بکھری دھوپ کی مانند خوبصورت لگی تھی۔

پشکن یوں بھی یرمولوف کا بہت مداح تھا کہ وہ زار روس کا مخالف اور دسمبرے کے باغیوں کا حمایتی تھا۔

اُن لوگوں کے شب و روز کی پشکن ایک ایسی تصویر پینٹ کرتا ہے کہ انکی معاشرت کے سبھی رنگ، انکی فکری سوچ اور علاقے کا حُسن و روپ یوں سامنے آتا ہے کہ قاری خود کو کسی گرفت میں لینے والی فلم کے سامنے محسوس کرتا ہے۔

یہی صورت The Gypsies میں ہے۔بلقان کے خانہ بدوشوں کی زندگی کی ایک سچی تصویر جسکے مرکزی کردار شہری مرد الیکو بسرابیہ (بلقان کا ایک علاقہ جس پر

روسیوں اور ترکوں کی لڑائی ہوتی رہی) کی زیمفیرا اور اُسکا بوڑھا باپ جسے سنتے ہوئے مجھے احساس ہوا تھا کہ خانہ بدوشوں کے فطری احساسات وجذبات سرحدوں سے اور فاصلوں سے کتنے بلند و بالا ہیں۔ بنجارے ہمارے ہاں بھی ایسے ہی ہیں۔ شاعر نے کیسی سچی انکی عکاسی کی ہے کہ ایک تابناک تصویر سامنے آگئی ہے۔

باغیچہ سرائے The Fountain Of Bakhchisarai کی اس طویل نظم میں شاعر کا تاریخ پر گہرا مطالعہ، عمیق مشاہدہ اور ذاتی تجربہ بہت شدت سے نظر آیا۔ روس کے جنوب کی وہ ریاستیں جن پر کبھی تاتاریوں کے جھنڈے لہراتے تھے۔ اور چنگیز خان کے پوتے کے گولڈن ہورڈ (فوج لشکر) یوکرائن، ماسکو، ہنگری اور پولینڈ تک کے علاقوں کو روندتے پھرتے تھے۔

نظم میں حرم کی عورتوں کی زندگی، انکے نفسیاتی وجذباتی مسائل، خواجہ سراؤں کے کردار، سلطان کا حرم کے اندر زندگی گزارنے کا ڈھنگ، تاتاری گیت، اُن گیتوں کے کردار زریمہ جو جارجیا کی فتح کے بعد سلطان کے حرم میں داخل ہوئی اور پولینڈ کے شہر باغیچہ سرائے کی شہزادی ماریا جسے تاتاری خان اپنا دل دے بیٹھا تھا۔ شاعر نے کس کمال سے منظر کشی کی تھی کہ ایک ایک منظر اپنی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ساتھ سامنے آتا تھا۔

اس طویل نظم کا وہ حصہ بہت خوبصورت ہے جہاں تاتاریوں کے عروج وزوال کی داستان کو اختتام پذیر کرتے ہوئے انکے ویران محلوں، افسردہ باغوں اور قبرستانوں کے ساتھ ساتھ اُس فوارے کا بھی ذکر ہے۔ جو شہزادی ماریا کی یاد میں تاتاری خان نے بنایا تھا۔ فوارے کے اوپر ہلال اور صلیب ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ اُسکا نام محل کی عورتوں نے ”آنسوؤں کا فوارہ“ رکھ چھوڑا تھا کہ باغیچہ سرائے کی شہزادی وہاں بیٹھ کر اپنے محبوب کی یاد میں رویا کرتی تھی۔

ساشا نے کتنے خوبصورت انداز میں اُس کی شاعری کے چند اہم شہ پاروں کو

بیان کیا تھا۔ سُن کر مزہ آیا تھا۔

جنگ قفقاز کے بھڑکتے شعلوں میں
جل گئے جو ملک ہمسائے تھے
روس کے گاؤں، شہر
امن کا گہوارہ تھے
خان نے بھی جلا ڈالے
پھرتے پھرتے جو میں آ نکلا تو رِیدا
دیکھا محل میں آنسوؤں کا فوارہ
ہلال اور صلیب دونوں ہم رکاب
جگمگاتے تھے پانیوں پر
پھر چل دیا باغیچہ سرا کی جانب
خوابیدہ تھے محل مینارے
برآمدے ویران اور کمرے خاموش
یہ وہ جا جہاں کبھی تاتار
جنگوں سے تھک کے آتے تھے
محفلیں سجاتے تھے
باغبان نہ رہے پر باغ باغیچے
کہانیاں اُن کی سناتے ہیں
جن کے دبدبے سے لرزاں تھے

شہر و بیابان

"Prophet" بھی ایک ایسی ہی شاہکار مختصر نظم ہے۔ دیکھئے رُوح کی تشنگی سے ہلکان شاعر کو چھ پروں والے فرشتے نے اپنی سُبک انگلیوں سے چھو کر اُسکا سینہ چاک کر کے کیسے اسمیں سچ کہنے کے انگارے بھر دیے ہیں۔

''ستوزرا''۔

راستے کے ایک چوراہے پر
چھ پروں والے فرشتے کو دیکھا
انگلیاں ایسی سُبک سی
جیسے کوئی جگمگاتا روشن خواب ہو
میری آنکھوں پر اُس کی آنکھوں کا لمس پھرا
جیسے روشنیوں کے سیلاب میں ڈوب گئیں
میرے کانوں کو چھوا اُس نے
اور نغمہ افلاک سے بھر دیا انہیں
آسمان کی تھرتھراہٹ نے متوجہ کیا
فرشتے فضاؤں میں پرواز کرتے
اور سمندروں کے پانیوں پر تھرکتے دیکھے
میرے ہونٹ کھولے اور دہن دبایا
میری باتونی، شوخ زبان کو
تالو سے کھینچا
تلوار سے میرا سینہ چاک کیا

دھڑکتا دل میرا سینے سے جدا کیا

شعلوں جیسے انگاروں سے بھر دیا اُسے

صحرا میں کسی لاش کی طرح پڑا رہا میں

حتیٰ کہ آسمان سے آئی صدا

اٹھو! آنکھیں کھولو

تو پیمبر ہے میری روح تیرے اندر

بحر و بر میں میرا پیغام سنا

یوں کہ قلبِ انسان

میرے لفظوں سے روشنی پائیں

سچی بات ہے میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔پیغمبروں پر نزول کی ساری کیفیات سامنے آ گئی تھیں۔

ان نظموں کی نغمگی معنوی خوبصورتی حد درجہ دلکشی اشعار کا توازن اور تناسب ان کی جامعیت اور بندش۔اُس کی چار مصرعوں کے بند والی نظمیں رُوسی زندگی کی حقیقی ترجمان بن گئی تھیں۔فطرت کے عناصر ہوا،سُورج،روشنی،اندھیرا زندگی کے ہنگامے اور حقیقتیں اُس کی شاعری کے وجود میں یوں گھستی تھیں جیسے انسان کے وجود میں سانس۔شہرت کا ھما سر پر بیٹھ گیا تھا۔

اُسکی شاعری کے حسن میں نئے رنگ بھرنے میں اُن ذی علم منچلوں کا بھی ہاتھ ہے جو اپنے حقوق کیلئے جلوس نکالتے،ہڑتالیں کرتے اور زار کے خلاف شازشوں کے جال بُنتے رہتے۔

دسمبر 1825ء کی انسانی حقوق کی تحریک (دسمبرسٹ موومنٹ) کے حامیوں کے

جلوسوں پر جب گولیاں چلیں۔گرفتاریاں ہوئیں۔باغی سولیوں پر چڑھائے گئے۔بے شمار جلاوطن ہوئے۔جانتی ہو۔ساشا نے میری طرف دیکھا تھا۔اُسکی آنکھوں میں مجھے عقیدت ومحبت کا ایک سمندر نظر آیا تھا۔

اُنکی زبانوں پر اُسکے اشعار تھے۔اُنکے سامان میں پشکن کے خطوط تھے۔

میں ایک ٹک اسکے چہرے اور اسکے ہونٹوں کو ہلتے دیکھتی تھی۔

''سُنو''۔

اُسنے گنگنانا شروع کیا اپنی لے میں وہ گنگناتی چلی گئی یہ سوچے بغیر کہ مجھے روسی نہیں آتی۔شاید اُسے جلد ہی احساس ہو گیا تھا۔

''اوہ''وہ انگریزی بولنے لگی تھی۔

سائبیریا کے جنگلوں،بیابانوں میں تمہارے دل اور عزائم بلند رہیں۔تمہاری قید کے مہیب غاروں میں میری آواز تم تک ہر صورت پہنچے گی۔تمہاری یہ آہنی بیڑیاں اور تمہارے زندان کی تیلیاں ایک دن ٹوٹ جائیں گی اور وہ صبح طلوع ہو گی کہ جب تمہارے ہم وطن تمہیں خوش آمدید کہیں گے۔یہ ایک نئی صبح ہو گی جس کا تمہیں انتظار ہے۔

مجھے فیض یاد آیا تھا۔اور میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

میں نے دیکھا تھا ساشا اپنی ترنگ میں مست پڑھے چلی جا رہی تھی۔

یہ آہنی زنجیریں کٹ جائیں گی ایک دن
یہ قفس کی تیلیاں ٹوٹ جائیں گی ایک دن
ہم وطن خوشیوں کو گلے لگائیں گے ایک دن
تمہاری کاوشیں رنگ لائیں گی ایک دن

''پشکن نے بہت سارے عشق کیے تھے''۔ابھی اتنا ہی بول پائی تھی۔

اُسکے لہجے میں تیزی تھی۔اُس نے میری بات کاٹ دی تھی۔''شاعر تو ہوتا ہی عشق کرنے کیلئے ہے۔لڑکیوں اور عورتوں کا اس سے اور اسکی شاعری سے عشق بہت ضروری ہے۔یہ عمل نہ ہو تو اکثر تخلیق کے سوتے نمو نہیں پاتے۔تمہارے ہاں شاعر سے عشق نہیں کیا جاتا۔''

''بنیادی طور پر تو دنیا کے ہر خطے کے انسان اپنی نفسیات اور جبلّت میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ کم وبیش ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔دیس کے شاعروں کی لمبی قطار آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی۔''

''مجھے دیکھو ساشا میری آنکھوں میں جھانکو میں اُسکے عشق میں گرفتار ہوں۔تمہارے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی ہوں تمہارے لئے نہیں اپنی تسکین کیلئے۔''

پشکن نے اپنی جلاوطنی کا زمانہ مالدوایا میں گزارا۔تین چار سال۔اُس نے ہم لوگوں سے محبت کی۔ہمارے اُوپر لکھا۔ہماری تہذیبی زندگی اور کارناموں کو اپنی شاعری میں سمو کر اُسے عام کیا۔

کیشنیف میں لینن سٹریٹ پر وہ خوبصورت سفید بڑا سا گھر ابھی بھی ہے جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔کیکر اور لائم کے درختوں سے سجی سڑک پر میرے ابا کے گھر سے تھوڑی ہی دُور ایک ہزار سال پُرانے پتھر کا محرابوں والا پھاٹک ہے جس پر ٹرکوں سے چھینی ہوئی توپوں سے ایک گھنٹی بنا کر لگائی گئی ہے۔اُس کے پاس ہی واقع پارک میں جب بھی شام کو کھیلنے جاتے۔میں اُس ستون کے پاس ہمیشہ رُکتی۔اس پر نصب مجسّمے کو دیکھتی اور اپنی بڑی بہن سے پُوچھتی۔جو مُجھے بتاتی۔یہ بُہت بڑا شاعر ہے۔ہمارا شاعر

یہ الیگزینڈر پشکن ہے۔

مالداویائی لوگ پشکن سے بُہت پیار کرتے ہیں۔

رُوسی لوگوں اور اُن کے کلچر سے محبت بھی اُنہیں پشکن کی وجہ سے ہے۔

پھر ساشا نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اٹھا کر اُس کمرے میں لے گئی جہاں ٹی وی پر اسکی زندگی کی ڈاکومنٹری چل رہی تھی۔ ہم دونوں میٹ پر بیٹھ گئیں۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگائی تھی۔

سکرین پر میرے سامنے پسکوف کا شہر آیا اس شہر کا گاؤں میخائلوفسکوے اسکی خاندانی جاگیر پر بنا ہوا وہ گھر جہاں وہ عظیم شاعر رہتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم میں نازیوں نے اِس علاقے کو تباہ کر دیا تھا۔ رُوسی کلچر کی سب یادگاریں ملیا میٹ ہو گئی تھیں۔ ساشا نے مجھے بتایا۔ جنگ کے فوراً بعد حکومت نے محفوظ خاکوں کے مطابق گھر دوبارہ اسی انداز میں تعمیر کیا۔ پشکن کی آیا آرینا رودیونوونا کے گھر کو بھی ٹھیک کیا گیا۔ سوویت حکومت نے ہر اُس یادگار کو محفوظ کیا جو کسی نہ کسی حوالے سے شاعر سے متعلق تھی۔ دونوں گھر سکرین پر میرے سامنے آئے۔ یہاں اُس نے قید تنہائی کاٹی تھی۔ سخت سردیوں میں برف سے ڈھنپے راستے اور گھر کی کھڑکیوں دروازوں سے جھانکتی تنہائی اُداسی اور ویرانی کے گھمبیر سے تاثر نے مجھے افسردہ کر دیا تھا۔

''سویتا گورسک'' کی خانقاہ میں شاعر کی قبر پر ہر سال لگنے والے میلے کی جھلکیاں تھیں۔ لوگوں کا ہجوم بے کراں تھا۔ ان کی محبتوں اور چاہتوں کے اظہار تھے۔

''تو آؤ پھر میناؤ ساغر کی بات کریں۔''

جب وہ Tsarkoye Selo میں زیر تعلیم تھا پیلس کے شاہی باغوں میں بہت سی لڑکیوں سے اسکی دوستی تھی۔ وہ اپنی نظمیں انہیں سناتا اور مُسکراتے ہوئے کہتا۔

''صرف تمہارے لئے۔''

بحیرہ کیسپین کے ساحلی حصوں جارجیا پا کیشیا، یورال کے پہاڑی سلسلوں قازقستان

میں اپنے قیام کے دوران یہاں کی تو پشکن حسن کی مالک عورتیں اسکی کمزوری بنیں۔

کارولینا سوبیکائے کمال کی خوبصورت عورت تھی۔عمر میں اُس سے بڑی تھی۔ ذہین ۔حسین اور عیار۔ دھڑلے نخرے ٹُخرے اور شاعرانہ ذوق کی حامل۔اُسکی شاعری کی نزاکتوں اور باریکیوں کو سمجھنے والی۔

پشکن بھی اسکی ذہانت اور رسیلی آواز کا شیدائی تھا۔جارجیا کو روسی گروزین کہتے ہیں اپنی ایک نظم میں گروزینی حسینہ کو مخاطب کرتے ہوئے اُسنے جس دل پذیر انداز میں اُسکے حسن اسکے گروزینی گیتوں اور ان میں چھلکتے اپنے گھر سے دور ایک انسان کے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔وہ اپنی مثال آپ تھا۔

غم زدہ ہے یہ گیت

دل کش ہے یہ نغمے

اے دل ربا دلکش حسینہ

یہ گروزینی راگ نہ سنا

تو جو گاتی ہے تو کیا دل پہ گزر جاتی ہے

ساحل کے شب و روز کی یاد آتی ہے

یونہی میرے آنسو بہتے رہیں گے

یادیں مضطرب کیے رکھیں گی

تم سے کچھ بن نہ پڑے گا

یہ درد جدائی خود ہی کم ہو جائے گا

نائٹ اور Beneath the blue sky of her native land وہ اکثر اُس سے فرمائش کر کے سنا کرتی۔

اینا کیرن بوڑھے جرنیل کی بیوی Amalia Riznich کسی بڑے تاجر کی بیوی۔ اینا اولینیا اینا وولف بے شمار عورتوں کا وہ شیدائی اور بے شمار عورتیں اس پر عاشق۔

پُشکن انسانوں کو سمجھنے میں تیز تھا پر عورتوں کو سمجھنے میں بودا۔ اِن ڈھیر ساری عورتوں میں سے کسی نے بھی اُس سے بے لوث اور دل و روح کی سچائی سے پیار نہیں کیا تھا۔ سوائے اینا وولف کے۔ پر مصیبت تو یہ تھی کہ شاعر اُسکے کیلئے جذبوں کی وہ شدت محسوس نہیں کرتا تھا۔ گو اُسنے کچھ وقت اسکے ساتھ ضرور گذارا۔

کوئنٹس علیزہ وورنسو طرحدار اور خوبصورت ہی نہ تھی اوڈیسہ کے گورنر کی بیوی بھی تھی۔ اور گورنر کو اسکے معاشقے کا علم ہو گیا تھا تو عتاب کا گولہ برسا۔ اوڈیسہ سے اُسکا اخراج ہوا بہت سارے الزامات کے ساتھ۔ جن میں بدچلنی بھی ایک تھا۔ سرکاری ملازمت ختم۔ زار نے اُسے میخائلوفسکوئے پر نظر بند کر دیا۔

رشتے دار تو پہلے ہی نالاں تھے۔ ماں باپ کے ساتھ تعلقات بھی خوشگوار نہ تھے باپ اسکی باغیانہ سرگرمیوں پر ہمیشہ سے تشویش اور فکر میں مبتلا رہتا تھا۔ بیٹا شاہی اشرافیہ میں اسکے لیئے باعث فخر بننے کی بجائے شرمندگی اور ذلالت کا موجب بن رہا تھا۔ زار بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اسکے باپ کو تاکید کی گئی تھی کہ بیٹے پر کڑی نظر رکھے اسکی ڈاک کھولی اور پڑھی جائے اور جہاں روکنے والی ہو۔ روکی جائے۔ ایک بدنام سی کہانی اس پیرائے میں بھی مشہور ہو گئی تھی کہ اُسنے اپنے باپ کو مارنے کی کوشش کی۔

خاندان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اُسے جاگیر پر تنہا چھوڑا جائے۔ شاید خاندان کا یہ بائیکاٹ اور انتہائی قدم اُسے راہ راست پر لے آئے۔ پورا خاندان نومبر کے وسط میں سٹیٹ سے چلا گیا اور پُشکن وہاں صرف آیا آرینا کے ساتھ رہ گیا۔

پر وہ بھی شاعر تھا اور شاعر بھی خداداد۔ حالات کا ہرتا زیانہ اسکی شاعری کیلئے مہمیز

ثابت ہو رہا تھا۔

سرکاری نگرانی اور بغیر اجازت کے باہر نہ جانے کی سزا نے اُسے ٹک کر بیٹھنے اور نامکمل کاموں کی تکمیل کی مہلت دی۔ "ایوگے نی انے گن Eugene Onegin" کا پورا خاکہ ترتیب دیا گیا۔ بلکہ تین چار باب مکمل بھی کیے۔

اُسکی خاندانی آیا آرنیا (Arina Rodionovna) کی شفقت اور پیار نے اُسپر عام رُوسیوں کی سادہ دلی، محبت، ہمدردی اور ممتا کے نئے رنگ وا کیے اس پر اس طبقے کی وہ خوبیاں آشکارا ہوئیں جن سے بالائی طبقہ محروم تھا۔

آرینا نے پشکن کو زمانوں پرانی وہ فوک کہانیاں سنائیں جو حکمت و دانائی سے پُر اور زندگی کے تجربے سے گندھی ہوئی تھیں۔ یہ وہی تھی جس نے اس نوع کی زندگی کے احساسات سے اُسے روشناس کیا اور اسکی جھلک اسکی بہت سی نظموں میں ظاہر ہوئی۔

آرنیا پشکن کی کئی حماقتوں اور غلطیوں کو چھپا جاتی۔ ممتا کی چھاؤں میں اسکی پریشانیوں کو سمیٹ لیتی۔

"Winter evening" میں وہ اُسی سے مخاطب ہے۔

محبت اور عقیدت کی ایک اتھاہ ہے اُسکے لہجے میں جب وہ کہتا ہے۔

جام کا پیالہ اٹھا
اور میرے ساتھ پی
کہ تو مجھ جیسی دکھی جوانی کی ساتھی ہے
آ کہ ہم اپنی تلخیاں اس جام میں گھول لیں
مجھے ننھی چڑیا کا گیت سنا
مجھے اُس لڑکی کا گیت سنا

جو بہت سویرے پانی بھرنے جاتی ہے

ایک اور جگہ وہ پھر اُس سے مخاطب ہے۔

تمہارے باورچی خانے کو اندھیرے کا خوف بھر دیتا ہے

کچھ بولو

میری موسم بہار جیسی جوانی کی ساتھی

تا کہ خاموشی کا طلسم تو ٹوٹے

برسات اور خزاں دونوں موسم اُسے بہت ہانٹ کرتے تھے۔ برسات جب گلیاں اور سڑکیں کیچڑ سے لت پت ہوتی تھیں اور خزاں جب انگور پکتے تھے۔

پھر دوستوں کی کوششوں سے ماسکو واپسی ہوئی۔ یہ چھ سات سال اسکی ادبی زندگی کا عروج تھے جسمیں اُسنے رزمیہ شاعری کی ''ایوگے نی انے گن Eugene Onegin ''منظوم ناول میں فکر و سوچ اور بیان کی دلکشی و بے ساختگی نے رُوسی شاعری کو مالا مال کر دیا۔ رُوسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ پلٹا وابھی جب منظوم صورت میں منظر عام پر آیا تو قدامت پرست روسی بھی پشکن کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہوا۔

The Bronze Horse man کو بھی تنقید نگاروں نے اُسکا شاہکار کہا

ہے۔

ساشا بولے چلی جاتی تھی اور میری نگاہیں جو سکرین پر جمی تھیں۔ دی برونز ہارس کا سنتے ہی دو دن پہلے کے دیکھے ہوئے دسمبر سٹ سکوائر پہنچ گئی تھی۔ بڑی دلچسپ تاریخ تھی اِس کی بھی اور ساتھ ہی برونز ہارس کی بھی۔

دسمبر سٹ سکوائر تاریخ رُوس کے چند عہد ساز واقعات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں جس پہلی چیز نے بھرپور توجہ کو کھینچا وہ کانسی کے گھوڑے پر سوار وہ مجسمہ ہے۔ جو کیتھرائن دی

گریٹ کی طرف سے اپنے نانا سُسر پیٹر دی گریٹ کو خراج ہے۔ عقیدت مندانہ اظہار ہے۔ کیتھرائن غیر رُوسی ہونے کی وجہ سے اپنا ناطہ اور تعلق رُوسی تاریخ کے ابتدائی زاروں اور رومانوف خاندان سے جوڑنے کی بہت خواہشمند رہتی تھی۔

برونز ہارس موریس فالکون (Maurice Falconet) کا یہ شاہکار دراصل رُوس میں پہلا رومن سٹائل مجسمہ تھا جو 1782ء میں یہاں نصب کیا گیا اور اس جگہ کو پیٹرز سکوائر کا نام ملا۔

بادامی اور گلابی گھلے ملے رنگ کے تین خفیف سے سٹیپ والے اِس چبوترے پر موٹا تازہ اور لمبا سا سانپ بکھرا ہوا ہے۔ گھوڑے کے اگلے سم سانپ کا سر کُچل کر آگے بڑھتے ہوئے اس انداز میں اوپر اٹھے ہوئے ہیں جیسے ابھی وہ آسمان کی لامحدود وسعتوں میں پرواز کر جائے گا۔

گھوڑے کے پُھولے ہوئے نتھنے، اُوپر اٹھی کنوتیاں اور برا چھوں کو چیرتی لگام جس کا سرا شہ سوار کے ایک ہاتھ میں ہے۔ شہ سوار کے چہرے اور آنکھوں میں آہنی عزم کی دہکتی لو ہے۔

سانپ سویڈن کا علامتی نشان ہے۔ سویڈن جو جانی دُشمن ہے رُوس کا۔ دُشمن جس کا سر بُری طرح کچل دیا گیا ہے۔

فضا میں پھیلے ہوئے ہاتھ کا تمثیلی انداز، کیا کہہ رہا ہے؟ مجھے اس کا پس منظر تو نہیں ملا۔ میرے خیال میں ایک اچھا شہنشاہ اپنی دھرتی کو اپنی پناہ، عافیت اور شفقت کے سائے تلے رکھنے کا عزم ہی دُہراتا ہے۔

اُنیسویں صدی کے آغاز میں پیٹر سکوائر سینیٹ سکوائر میں بدل گیا۔ نام کی تبدیلی ایک بار پھر اُس وقت ہوئی جب ایک بے حد اہم واقعے نے جنم لیا۔ حکمران زار نکولس اول

تھا۔سخت گیر، فوج جس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔سلطنت فوجی ٹولے کے ہاتھوں میں تھی۔شرفاء مملکت کے ایک گروپ نے آزادی اظہار، بنیادی انسانی حقوق اور آئین کی بالا دستی کے لئے بغاوت کر دی۔تاریخ میں سنائی دینے والی اِس پہلی احتجاجی آواز پر اس کا گلا جس بُری طرح گھونٹا گیا اُس نے تاریخ کے صفحات میں دُکھ اور ملال کے تاثرات بکھیر دیئے۔

میں نے اِس واقعے کی پینٹنگ دیکھی تھی۔اس وقت وہ منظر فریم سے نکل کر سکوائیر میں مجسم ہو گیا تھا میں دیکھتی تھی یادگار کے پاؤں میں بکھرے احتجاجی تو شاید پندرہ اٹھارہ سو سے زائد نہ ہوں پر گھڑ سوار بندوقوں والے ہزاروں کی تعداد میں میدان کے ہر طرف کیل کانٹوں سے لیس یوں کھڑے تھے جیسے سامنے دُشمن کی بھاری نفری مقابلے پر۔ اور بس کوئی دم میں جنگ کا طبل بجا چاہتا ہو۔

حبیب جالب بھی کیسے وقت یاد آیا تھا اور وہ پیاری سی لڑکی بھی چھم چھم کرتی جمہوریت اور آئین کی بالا دستی کا جھنڈا اُٹھائے سامنے آ گئی تھی اور سکوائر حبیب جالب کی گونج دار آواز سے بھر گیا تھا۔

ڈرتے ہیں بندوقوں والے اِک نہتی لڑکی سے۔

اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے لوگ کس قدر بزدل ہوتے ہیں کہ سچ کا علم تھامے چند لوگوں سے ڈر جاتے ہیں۔

14 دسمبر 1825ء کے بے حد سرد دن جب احتجاج کرنے والے لوگ "دی برونز ہارس مین" کے قدموں میں اکٹھے ہوئے، اُن پر گولی چلی۔پانچ لیڈر اور سینکڑوں لوگ تو وہیں ختم۔ بقیہ گرفتار ہوئے اور سائبیریا کے کالے پانیوں میں پہنچائے گئے۔اور یہی وہ لوگ تھے جو دسمبری کہلائے۔انہی جیسے لوگوں کے لئے پشکن جیسے شاعر نے انقلابی نظمیں

لکھیں ۔ دوستووسکی نے اپنے ناولوں میں ذکر کیا۔ اس سکوائیر کو دسمبر سٹ سکوائیر کا نام بھی ملا۔

ماحول میں افسردگی کا رچاؤ عود آیا تھا۔ میں نے گھوڑے کو بغور دیکھا تھا۔ میں شاید یہ جاننا اور دیکھنا چاہتی تھی کہ اپنی پشت پر عہد ساز شخصیت کو بٹھانے کا جو گھمنڈ اُسکے نتھنوں کو پھلائے ہوئے ہے کیا اسکی آنکھوں میں کہیں اُس احساس، اُس درد کی کوئی ہلکی سی رمق بھی رقصاں ہے کہ جب بے گناہوں کے خون سے یہ جگہ رنگین ہوئی؟

"The Bronze Horseman" دی بر ونز ہارس مین" اِس سکوائر کی جان، اسکی رونق بڑھانے، فرانسیسی مجسمہ ساز کی فنکاری نمایاں کرنے، پیٹر دی گریٹ جیسے تخلیق کار کی خوبیوں کے پرت کھولنے کے ساتھ ساتھ پشکن جیسے بے مثال شاعر کی لازوال نظم کو بھی اُجاگر کرتا ہے کہ اس کی نظر نے اِسے کس انداز میں دیکھا اور محسوس کیا۔ نظم کے پسِ منظر میں 1777ء کا خوفناک سیلاب تھا۔

میں نے گھڑ سوار کے پھیلے ہوئے آہنی ہاتھ کو دیکھا۔ لرزش یا تھرتھراہٹ نہیں تھی وہاں۔ اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ آنکھوں سے ٹپکتے جلال اور ہیبت نے مجھے ایوگینی کی طرح ہی خوف زدہ کر دیا تھا۔

"برونز ہارس" کا ایوگینی، دریائے نیوا کی کھاڑی کے کسی چھوٹے سے جھونپڑے میں رہنے والا مچھیرا، دریا کے منہ زور سیلاب میں اپنے جھونپڑے اور اپنی محبوبہ پراشا کو کھو بیٹھا تو گھڑ سوار سے یہ پوچھنے چلا آیا کہ تو کیسا شہنشاہ ہے؟ منہ زور پانیوں کے کنارے شہر آباد کرنے سے پہلے تو نے نہ سوچا کہ یہ پانی بھی کبھی کبھی انسانوں کو سبق سکھانے آ دوڑتے ہیں۔ اور جب بھی ایسا ہو گا تو مرنا کس نے ہے؟ غریبوں اور ماڑے لوگوں نے۔ تیرا کیا ہے؟ تیرے محلوں میں بھرے ہوئے پانی کو تو تیرے جرنیل تیری ایک آواز پر سمیٹنے

کے لئے دوڑ پڑیں گے۔ پر ہم جیسے ماڑے لوگ تو برباد ہو جاتے ہیں۔ اب تو مجھے بتا۔ میری کُٹیا اور میری پراشا جو میرا خواب، میری امید تھی۔ وہ سب تو پانیوں میں بہہ گئے۔

”لُٹ گیا نا میں تو؟ زندگی اُجڑ گئی نا میری تو۔ بول۔ جواب دے مجھے۔ آدھے جہاں کے مالک و وارث! تجھے اُس آگ کا کچھ اندازہ بھی ہے جو میرے سینے میں جل رہی ہے؟“

اُس نے سر کو چبوترے پر پٹخا پھر اُٹھایا۔ مُجسمے کو دیکھا اور طنز سے بولا۔

”بڑا آیا عمارتیں بنوانے والا۔ نیا شہر بسانے والا اور تاریخ میں اپنا نام لکھوانے والا۔“

اُس نے گھڑ سوار کو بس اتنا ہی تو کہا تھا۔ اتنا سا گلہ اور اتنی سی شکایت ہی تو کی تھی پر اُسے لگا جیسے گھڑ سوار کی آنکھوں میں غُصے کی چنگاریاں پھوٹ پڑی ہیں زمین سنسنانے لگی ہے یوں جیسے کوئی زلزلہ آ رہا ہو اور گھوڑا اس پر چڑھ دوڑنے والا ہو۔ ایوگینی خوف اور دہشت سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُسے لگا جیسے گھوڑے کی ٹاپیں سڑک کا سینہ کوٹتے ہوئے اُس تک پہنچ کر اُس کا سر کُچل دیں گی۔

آہ! ایوگینی بیچارہ، یوں ہی بھاگتا پھرا اور ایک دن اپنی کُٹیا میں مر گیا۔

میں نے ایک بار پھر گھڑ سوار کو دیکھا تھا اس کے چہرے اور ہاتھ کو بھی۔ سچی بات ہے کہ میں ایوگینی کی طرح بھاگی تو نہیں تھی پر خوف زدہ ضرور ہوئی تھی۔

اپنی سوچوں سے باہر آئی۔ دھیان کو دوبارہ سکرین کی طرف متوجہ کیا۔ ذہن تو کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ پشکن روس کی ایلیٹ کلاس کے مجمع میں شاعرانہ کلام سناتے ہوئے قدیم کلاسیکل سٹائل کے کپڑوں میں ملبوس نظم سنا رہا تھا۔ یہ تصویر بھی کسی کمرے میں دیکھی تھی۔ اب سامنے ماسکو کا وہ گھر تھا جہاں وہ پیدا ہوا۔ سکول جہاں اُس نے پڑھا۔ اُسکے ڈھیروں

ڈھیر انداز۔

یہاں رُوس میں اُسنے نتالیا کو دیکھا۔

نتالیا گنچارووا۔نتالیا گنچارووا کے نام نے مجھے بھی چونکایا تھا۔میں ٹی وی چھوڑ کر یکسوئی سے اسکی طرف متوجہ ہوئی۔وہ اسی قدر خوبصورت تھی جتنا ایک شاعر اپنی شاعری میں حسن کے گُلدستے باندھ سکتا ہے۔سولہ سال کی بالی عمر کی چنچل وشوخ وشنگ لڑکی جسکے حسن اور اداؤں کی رُوس کی ایلیٹ کلاس میں دُھوم مچی ہوئی تھی۔

اب پشکن کی شادی کی تفصیلات ہوں۔ساشا اُس کی عاشق صادق ہو اور مجھ جیسی سیاح عورت ہو جسے بہر حال ایک بڑے انسان کی زندگی کے اس پہلو سے انتہائی دلچسپی تھی۔خود ہی جان جائیے کہ سُننے اور سُنانے میں شوق و مستی کا کیا عالم ہو گا۔

یہ کس قدر دلچسپ بات ہے کہ اس کی محبت کا آغاز اگر نتالیا کے نام سے ہوا تو اختتام بھی نتالیا کے نام سے ہو رہا تھا۔

''نتالیا میرے دل میں ہی نہیں دماغ میں بھی گھس گئی ہے۔''اُسنے اپنی ساس کو لکھا تھا۔

سُسرال کو شادی کی ذرا جلدی نہیں تھی۔انکے مطالبات بھی بے شمار تھے اور تحفظات کی بھی لمبی لسٹ تھی۔گو باپ نے بولدی نو کی جائیداد اس کے نام کر دی تھی۔شاہی ملازمت بھی مل گئی تھی کہ شہرت بطور شاعر مسلمہ ہو چکی تھی۔کتابوں کی آمدنی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔پر زندگی میں میانہ روی اور اعتدال نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔

شاعر کا دل بُری طرح اسیر آگیا تھا۔اُسکے لئے وہ کسی دیوی کا روپ دھار گئی تھی۔

''میڈونا''میں وہ اُسی سے مخاطب ہے۔

''کاش میں نتالیا ہوتی۔اور پشکن نے وہ نظم میرے لیئے لکھی ہوتی۔'' ساشا ہنستے ہوئے بولی تھی۔

میں بھی ہنس پڑی تھی اور میں نے کہا تھا۔

''جو تمہیں پیار کرتا ہے اُسے پشکن جیسا ہی سمجھو۔''

''ذرا سنو۔''

اسکی تشنہ سی آرزو سامنے آتی ہے۔''کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ میں اپنا گھر بھی بناؤں گا اور پرانے شاہکاروں سے اسے سجاؤں گا۔''

''اونیگن'' میں اُس کی دلی خواہش کُھل کر سامنے آتی ہے۔

''اب میرا مطمع نظر گھروالی ہے۔میری سب سے بڑی تمنا پُرسکون زندگی اور گوبھی کے سوپ کا پیالہ ہے۔''

ساشا کی آنکھوں میں اُترتی نمی مجھ سے پوشیدہ نہ رہی تھی۔

''میڈونا'' میں اُسنے نتالیا کے حسن کو حُسن مریم سے تشبیہ دی اور پاکیزگی مسیح ابن مریم جیسی چاہی۔نظم میں اُسکا یہ اظہار کہ اسکی تخلیق اس خوبصورت رنگ وروپ کے ساتھ خدانے بنائی ہی اُسکے لئے ہے۔خوبصورتی اور رعنائی کے اس مجسمے کو وہ اپنے گھر میں دیکھنے کا خواہشمند ہے کہ جسکے ریشے ریشے میں اسکی مشقت گھلی ہوئی ہے۔

دل کھول کر اُسنے دلہن اور سُسرال کی خواہشوں کو پورا کیا۔شادی 1831ء میں جس شاہانہ انداز اور کرّوفر سے ہوئی اُسنے اُسے ساٹھ ہزار روبل کے قرضے کے نیچے دبا دیا تھا۔

''پر دیکھو''

ساشا رُک گئی تھی۔میری آنکھیں تجسس کی لو سے دہکتی اسکے چہرے پر جمی

تھیں۔چند لمحے ایک پُراسراری خاموشی میں لپٹے گذر گئے۔

شادی سے قبل وہ مضطرب سا تھا۔بے چین سا عجیب سے جذبات واحساسات کی یلغار کی زد میں آیا ہوا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

''کیا یہ انتہائے مُسرت ہے۔'' اُسنے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

''ہاں نہیں شاید۔''

اُسنے باری باری تینوں جواب خود کو دیئے۔پر پھر بھی کہیں اضطراب تھا۔

اور شادی سے اڑتالیس گھنٹے قبل وہ ثانیہ کے پاس گیا جسکا خانہ بدوشوں سے تعلق تھا۔

''ثانیہ کچھ گاؤ۔کوئی ایسی چیز جو میرے لیئے خوش قسمتی کی تعبیر ہو۔تم جانتی ہو میں شادی کر رہا ہوں۔''

ثانیہ کی خوبصورت غزالی آنکھوں میں گذرے دنوں کے خوبصورت عکس جھلملائے۔بغیر ایک لفظ بولے وہ اٹھی اُسنے گِتار اٹھایا۔قالین پر بیٹھی۔تاروں سے نکل کر جو گیت فضا میں بکھرا،اُسمیں حزن وملال کا وہ رچاؤ تھا جس نے ساری فضا کو پل جھپکنے میں غمناک کر دیا۔شاعر نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا اور کسی چھوٹے سے بچے کیطرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ثانیہ کی آنکھیں بند تھیں۔لمبی گردن پورے وقار سے کھڑی تھی گیت کا حزن اور شاعر کی سسکیاں پورے ماحول پر پھیلی ہوئی تھیں۔

''آہ'' بہت دیر بعد اُسنے سر اٹھایا اور کہا۔اس گیت نے مجھے ختم کر دیا۔یہ کسی بڑے صدمے کی پیشین گوئی ہے خوشی کی نہیں۔

میں عجیب سے سحر میں گرفتار اُسے سُنتی تھی۔

اور جب تقریب عروسی میں ایک دن باقی تھا۔ اُسنے اپنے دوستوں سے کہا۔

"تو آؤ کہ میرے ساتھ مل کر میرے کنوار پنے کی زندگی کو دفن کرو۔"

اور اسکے گہرے درجن بھر دوست اکٹھے ہوئے اور چاہا کہ محفل موج و مستی ہو۔ پر حیرت زدہ ہوئے کہ وہ کیسی اذیت میں ہے۔

اپنی جوانی کو، اپنی آزادی کو، الوداع کہنے کیلئے اُسنے اپنی نظم میں سے چند اشعار پڑھے۔

"میں موت کب چاہتا ہوں مجھے تو زندگی کی آرزو ہے۔ میں غم سے آگاہ ہوں اور فکر و پریشانی سے بھی میرا تعلق ہے۔"

ایسے اشعار جیسے وہ جوانی کو رخصت نہیں کر رہا تھا بلکہ زندگی سے رخصت لے رہا تھا۔ جیسے وہ نئی زندگی کو نہیں بلکہ موت کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ جیسے آج کے بعد اسکی زندگی میں کل نہیں ہوگا۔

اور میز کے گرد بیٹھا اُسکے دوستوں کا ٹولہ دہشت زدہ سا اُسے دیکھتا تھا۔ اور پھر اُسنے روندھے گلے اور بھرائی آواز میں انہیں خدا حافظ کہا اور اپنی منگیتر سے ملنے چلا گیا۔

میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میں اُس کمرے میں نہیں تھی۔ اور یقیناً ساشا بھی نہیں ہوگی۔ زمان و مکان کے فاصلے سمٹ چکے تھے۔ اور وجود وقت کی اُس منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاں دو صدی قبل کا دورانیہ متحرک تھا۔

یہ اٹھارہ فروری 1831ء کا سرد برفیلی کٹیلی ہواؤں کے جھکڑوں میں جھولتا جھومتا دن تھا۔ پشکن کی شادی کا دن۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی ماسکو کے چرچ Ascension میں ہو رہی تھی۔ ماسکو کی ایلیٹ کلاس چرچ میں اس اتنی شاندار شادی اور اخراجات کے تخمینوں پر تبصروں اور حاشیہ آرائیوں میں مصروف تھی۔ زرق برق گاؤن پہنے اور منقش

ٹوپیاں اوڑھے داڑھیوں والے پادری منتظر تھے۔

دلہن کی آمد، اسکا شاہانہ عروسی لباس، روشنیوں کا سیلاب اور گیتوں کی آوازیں سنہری کارپٹ پر چلتی دلہن کی تمکنت، حسن اور بانکپن اتنا بھرپور تھا کہ وہ مسکرایا۔ اپنی گردن کو اکڑایا سینے کو اوپر اٹھایا اور اپنی قامت کو لمبا کیا کہ دلہن اس سے لمبی تھی۔

سیٹوارڈ نے تقریباتی کراؤن اُنکے سروں پر رکھے اور پادری نے انہیں زندگی اکٹھے گذارنے کے دعائیہ جملے کہے۔

اور جب انگوٹھیاں پہنائی جا رہی تھیں۔ اچانک ایک آرائشی سنگار پٹی فرش پر گری۔ خود کو اس سے بچانے کیلئے وہ جھکا۔ رحل سے ٹکرایا۔ صلیبی مجسمہ اور کوپل ایک بھدی آواز سے گرے اور پشکن کی کینڈل بجھ گئی تھی۔

شاعر کھڑا ہوا۔ چہرے پر پیلاہٹوں کی زردی کے ساتھ۔ ڈوبتی شکستہ آواز اسکے ہونٹوں سے نکلی۔

"All the bad omens"

نتالیا سے شادی پر وہ خوش تھا۔ گو شادی مسائل کے انبار لیکر آئی۔ غیر معمولی شخصیت غیر معمولی عزم و حوصلہ والا۔ جی داری سے کھڑا رہا جم کر کام کیا۔

''انچار'' بھی ایک شاہکار نظم ہے۔ سلطنتوں کی ریشہ دوانیاں بے رحمی۔ سرحدوں کی وسعتوں کیلئے انسانوں کا قتل۔ ذرا سی ایک نظر

حکمران نے تیروں کو بجھایا زہر میں
نشانہ لیا چلّے میں چڑھا کر
یہ موت کے اڑتے ہوئے سندیسے
سرحدوں کی جانب ہوئے محوِ پرواز

ہمسایوں کے لئے سوغات ہیں

زہر بھرے جام یہ

''پریشانی'' اور ''پشیمانی'' بھی کمال کی تخلیق تھیں۔

اُس نے نثر، ڈرامہ، تنقیدی مضامین اور ادبی اخبار (لتراتو رنایا گزیتا جو آج بھی شائع ہو رہا ہے) میں لکھا اور خوب لکھا۔ ''Poet'' جو زمانے کے چلن۔ لوگوں کے اطوار، حسد جلن، جیسے رویوں پر مشتمل ہے جنہیں وہ بخوبی سمجھتا ہے اور خود سے کہتا ہے کہ تیرا مطمئن اور ثابت قدم ہونا ضروری ہے۔ ہجوم کی فکر نہ کر۔ واہ واہ کے نعروں پر نہ جا۔

وقت کا بادشاہ ہے تو

اپنی زندگی کا آپ مالک

تیرا شعور، تیری فراست

جلا پائے تیری آزادی سوچ سے

اسی دوران اُس نے نکولائی گوگول کی کہانیاں کے مجموعے Evening On A Farm Near Dikanka پر بہت سے تنقیدی مضامین لکھے اور انہیں اپنے رسالے The Contemporary میں شائع کیا۔ مشہور زمانہ ڈرامہ Boris Godunov بہت پہلے کے لکھے ہوئے پر نظر ثانی کی اور چھاپا۔ ''The Stone Guest'' ڈرامہ بھی بہت مقبول ہوا۔

نتالیا کو دراصل یہ احساس ہی نہیں تھا کہ جسے اُسے پسند کیا، اُسے چاہا اور اپنی شریک زندگی بنایا وہ کیا ہے۔ مہنگے ترین ملبوسات، منفرد جیولری، اپنے گرد عاشقوں کا ہجوم اور عیش و عشرت سے لبریز زندگی اُسکا منتہا تھا۔

1831ء میں شادی ہوئی اور 1835ء تک وہ چار بچوں کی ماں بن چکی

تھی ۔ماریا الیگزینڈر، گریگوری اور نتالیا۔ آغاز کا کچھ وقت اُسنے پشکن کی جاگیر پر گذارا۔کیپٹل پیٹرز برگ میں آنے کے بعد اُسنے باقاعدگی سے کورٹ سوسائٹی میں جانا شروع کردیا۔مداحوں اور عاشقوں کا ہجوم اسکے گرد اکٹھا ہو گیا تھا جن میں زار نکولس اوّل سر فہرست تھا۔اُسے نفرت تھی زار سے''Cloud'' میں بادل کے استعارے میں اُسنے زار کو ہی مخاطب کیا تھا۔

یہ شب و روز چکّی کے اُن دو پاٹوں کیطرح تھے جن میں وہ پس رہا تھا۔زار نکولس کیطرف سے ملنے والا کورٹ کا ٹائیٹل بہت توہین آمیز تھا جس نے اُسے غضبناک کیا۔پر نتالیا کا رویہ اس سے بھی زیادہ توہین آمیز تھا۔

ابھی اسپر ہی اکتفا نہ تھا کہ دارالحکومت کی فضاؤں میں نتالیا کے ایک نئے سکینڈل کی افوائیں اڑیں۔یہ فرنچ نوجوان جارج ڈی انتھیس (George d' Anthes) حسن و جوانی اور وجاہت کا دلآویز نمونہ جسے ڈچ سفیر ہیکرن نے اپنے بیٹا بنایا ہوا تھا۔

''The Gypsis'' دی جپسیز'' کے کردار اگر حقیقی تھے تو الیکو کا کردار اُسکا تخلیق کردہ تھا۔رُوسی شہری مرد۔خانہ بدوش زیمفیرا کی ماں تاریکی میں جب اُسکے باپ کو چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ چلی جاتی ہے تو شاعر کہانی کے ہیرو الیکو کی زبان سے زیمفیرا کے باپ بوڑھے خانہ بدوش سے کہتا ہے کہ تم نے اُس درندے کا پیچھا کیوں نہ کیا۔دونوں کو گولی کیوں نہ ماری۔بوڑھے کا جواب اُسکے من کو نہیں لگا تھا جب اُسنے کہا۔

''محبت پر تو کوئی اختیار نہیں اور جوانی آزاد ہوتی ہے۔''

جب زیمفیرا بھی کسی اور کے ساتھ دل لگاتی ہے اور رات کی تاریکی میں اپنے عاشق سے ملنے جاتی ہے تو الیکو دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔یہ کہتے ہوئے کہ محبت میں کیسی شراکت داری؟

تو وہ بھی الیکو ہی تھا۔ جوش غضب اور رقابت سے بھرا ہوا۔

''تو پھر آؤ۔ ڈوئل لڑتے ہیں۔'' اُسنے للکارا۔

یہ خوفناک اور شدید قسم کی ڈوئل تھی۔ بڑا اعلیٰ نشانہ باز تھا۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی شرطوں کا فیصلہ گولیوں سے کرنے کا عادی تھا اور ہمیشہ جیتا تھا۔

''تو پھر کیا ہوا؟ وہ زندگی سے کیسے ہار گیا؟''

میرا اپنا لہجہ گلوگیر سا تھا۔

''جو دل سے ہار جائیں۔ زندگی بھی انہیں ہرانے پر تل جاتی ہے۔''

اُسکا تو غیض و غضب اُسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ وگرنہ وہ تو ہارا ہوا تھا۔

اس کی ایک نظم Thoughts دیکھو۔ وہ تو شاید جانتا ہی تھا۔

ہر دن اور سے کی ہر ساعت
میں اسی خیال کی اُدھیڑ بن میں ہوں
کہ ان گزرتے لمحوں اور دنوں سے
موت کے سال کا اندازہ لگاؤں
میری قسمت موت کو مجھے لینے کے لئے
کہاں بھیجے گی بھلا
کسی میدان میں، حالت سفر میں
یا پھر کہیں سمندروں کے سینے پر

شدید زخمی تھا۔ لوگ اٹھا کر اسی گھر میں لائے۔ اور پورا پیٹرزبرگ اس گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ لوگ مشتعل تھے۔ گلیوں اور سڑکوں پر ماتم کی کیفیت میں تھے۔ غضبناک تھے۔ موت کی خبر کو دو دن تک چھپایا گیا۔ دو دن بعد بھی ہجوم اتنا بپھرا ہوا تھا کہ آدھی رات کو خاموشی سے

میت کو رسک مناسٹری میخائلوفسکائے کے نزدیک اسکی ماں کے پہلو میں دفن کے لئے لے جائی گئی۔

بہت دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے تھے۔ نتالیا کے بارے میں میرے پوچھنے پر ساشا نے کسی قدر تلخی سے کہا تھا کوئی پانچ چھ سال تو زار نکولس اوّل کی باقاعدہ رکھیل رہی۔ پھر کہیں پیٹرووچ لینسکوئے سے ملی۔ زار کی مکمل آشیرباد کے ساتھ اُس سے شادی کی۔ دو بیٹیوں کی ماں بنی۔ 1863ء میں فوت ہوئی۔

''ساشا نے وقت دیکھا۔ جن لوگوں کی وہ منتظر تھی وہ آنے والے تھے۔ ہم دونوں اکٹھے کھڑے ہوئے۔ میں نے اُسکے ماتھے پر بوسہ دیا اور ملال گھلی آواز میں کہا۔ ساشا میرے پاس الفاظ نہیں جو تم جیسی پیاری لڑکی کا شکریہ ادا کریں۔ اگر کبھی کہیں پاکستان کا نام پڑھو تو اپنے آپ سے ضرور کہنا کہ اُس دیس میں تمہیں یاد رکھنے والی ایک عورت رہتی ہے۔ اور وہاں اگر کبھی آؤ تو میرے پاس آنا۔ تمہیں پردیس میں اپنے گھر کا احساس ملے گا۔

پھر میں اُس کمرے میں گئی جہاں اُسے زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔ وہ بستر جہاں اُسے لٹایا گیا۔ وہ بندوق جس سے وہ زخمی ہوا۔ میز پر پڑی وہ گھڑی جو اسکی آخری سانس کے ساتھ ساکت کر دی گئی تھی۔ چھوٹی سوئی دو (2) اور تین (3) کے درمیان اور بڑی نو (9) پر۔

وہ آگاہ تھا اپنے مقام سے۔ ایسے ہی تو اُسنے نہیں لکھا تھا کہ ایکدن رُوس کی سرزمین پر میرا نام ہوگا دنیا کی زبانوں پر میرا کلام ہوگا۔ اور زارشاہی کا منارہ میری عظمت کے سامنے سرنگوں ہوگا۔

ساشا اُس کی نظم گنگنانے لگی۔

''زندگی کی شام''

میں موت کی تمنا کیوں کروں

مجھے زندہ رہنے کی شدید تڑپ ہے

فکر و آگہی سے میرا گہرا تعلق ہے

غم سے بھی مجھے نسبت اور عرفان ہے

دنیا کی تنقید اور ستم بھی سہنا ہے

کہ میرے شاعرانہ افکار ذمہ دار ہیں

انہی شعلوں اندر زندگی بسر کرنے کا

لطف و سرور ہے

کبھی کسی مترنم آواز کی لہریں

دل کو سرور دے جاتی ہیں

کبھی یونہی اشکوں کا سیلاب بہہ جاتا ہے

کیا خبر جب میری عمر کی ڈھلتی شام ہو

عشق دے جائے تبسم کا چھلکتا ہوا جام

☆☆☆

لیوٹالسٹائی

روسی ادب کا دیو

صوفیہ ٹالسٹائی

یادداشتوں کے آئینے میں

- اپنے وقت کے بڑے ناولوں اور ناول نگاروں کا اعتراف کرنے سے وہ ہمیشہ منکر رہا۔
- اُس کا کہنا ہے کہ اینا کرینینا ہی میرا پہلا سچا اور کھرا ناول ہے۔
- صوفیہ اپنے کرب کا اظہار کرتے ہوئے اپنی یادداشتوں میں لکھتی ہے کہ ٹالسٹائی کے خیال میں دنیا میں محبت قسم کی کوئی چیز نہیں۔ یہ صرف جسمانی ضرورت ہے۔ جنسی تعلقات کیلئے ساتھی کی ضرورت۔ بس۔
- سچ تو یہ ہے کہ جب میں اُس کا لکھا ہوا پڑھتی اور اُسے لکھتی مجھے لگتا الفاظ جیسے کھلونوں کی طرح اُس کے ہاتھوں میں کھیلتے اور خیالات کسی آسمانی پھوار کی طرح اُس کے دماغ سے برستے۔

لیوٹالسٹائی اور صوفیہ ٹالسٹائی

اپنے ماسکو میں قیام کے دوران میں یاسنایا پولیانہ Yasnaya ployana جانے کی بڑی خواہش مند تھی۔ٹالسٹائی کا وہ گھر جہاں وہ پیدا ہوا۔جہاں اُس نے اپنے ادبی شہ پاروں کی تخلیق کی تھی۔پر جیسے وہاں حاضری دینی میری قسمت میں نہ تھی۔

یوں ماسکو میں کروپوتکن سٹریٹ پر موزے ٹالسٹائی میں اس کی اپنی لکھائی میں لکھے ہوئے اُس کے دو شہرہ آفاق ناولوں وار اینڈ پیس اور اینا کرینینا Karenina کے مسودے رکھے ہوئے ہیں اور ٹالسٹائی سکوائر کے ویران سے پارک میں اُس کے مجسمے کے ساتھ تصویریں وغیرہ بنوا کر دل کے رانجھے کو پرچانے کی کوشش کی تھی۔

پر یاسنایا پولیانہ جانے کی ہڑک نچلا نہ بیٹھنے دے رہی تھی۔اُس دن اپنے ہوٹل کے سامنے ریسٹورنٹ میں ناشتہ کرتے ہوئے میں ویٹرس ورونیکا جو یاسنایا پولیانہ سے تھی کہہ بیٹھی۔

''تمہارا تو گھر ہے وہاں ۔جس دن تمہاری چھٹی ہو۔ہمیں لے چلو نا اپنے ساتھ۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''آپ کو معلوم ہے وہاں کوئی بھی چیز اصلی نہیں ہے۔نہ وہ درخت جنہیں ٹالسٹائی نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا، نہ وہ فرنیچر، نہ وہ کمروں کا سامان، نہ وہ تصویریں۔دوسری جنگ عظیم میں نازی فوجوں نے ماسکو پر حملے کے دوران یاسنایا پولیانہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ایسے تنگ انسانیت لوگ تھے کہ درختوں کو کاٹ ڈالا۔فرنیچر جلادیا۔یادگار تصویروں کو آگ لگا دی۔

مجھے احساس ہوا تھا کیفے کی ورونیکا اور داشا پڑھی لکھی ہی نہ تھیں ادبی ذوق کی حامل بھی تھیں۔جب وہ پنیر پراٹھا اور بھاپ اڑاتی چائے ہمارے سامنے رکھ رہی تھیں۔میں نے اُن سے ٹالسٹائی کے اُن دونوں شاہکار ناولوں کی بابت پوچھا تھا کہ وہ انہوں نے پڑھے ہیں۔ورونیکا نے اثبات میں سر ہلایا۔ساتھ ہی داشا کی طرف ہاتھ پھیلایا جو کاؤنٹر پر کھڑی ہمیں مسکراتے ہوئے دیکھتی تھی اور بولی۔

''دراصل یہ صوفیہ ٹالسٹائی کو پڑھے بیٹھی ہے اور میں ٹالسٹائی کو۔چلو اگر شام میں ایک نشست ہوجائے تو لطف آئے گا۔آج شام ہم دونوں فارغ ہیں۔یہیں چبوترے پر بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔''

شام بہت خوبصورت تھی۔ہمارے ہوٹل کی دیوہیکل عمارت کیفے اور اس سے ملحقہ کمپاؤنڈ پر کسی مہرباں کی طرح سایہ فگن تھی۔پرے بسوں کے یارڈ میں دھوپ اپنا بڑھاپا بڑے کروفر کے سے انداز میں گزار رہی تھی۔سنبل کے بلند و بالا پیڑوں میں ہوا کی مست خرامیاں جاری تھیں۔

یارڈ کے موتی بکھیرتے فوارے کی سنگی دیواروں پر بیٹھتے ہوئے ہم نے کونے والی

دوکان سے کسی اجنبی زبان میں گائے گیت کے بول فضا میں بکھرتے سُنے تھے۔درمیانی عمر کی خوبصورت ورونیکا اُن بولوں پر جھومتے، زیرِ لب گنگناتے چبوترے پر بیٹھی اور ساتھ ہی اُس نے مجھ سے سوال کرڈالا تھا کہ میں نے کون کون سے ناول پڑھے ہیں اور کس نے زیادہ متاثر کیا ہے؟

پڑھے تو میں نے دونوں تھے اور دونوں میرے پاس بھی ہیں۔وار اینڈ پیس روسیوں کی نپولین بونا پارٹ کے خلاف عظیم جدوجہد کی شاندار کہانی ہے اِس ناول کا ایک حصہ "1805 کا سال" کے عنوان سے "The Russian Messenger" جیسے ادبی پرچے میں چھپنے سے اس کے بارے میں بے حد پسندیدگی سامنے آئی تھی۔تین مزید باب چھپے۔دونوں تنقید نگاروں اور عام قارئین نے اِس ناول کے تاریخی پس منظر کو پسند کیا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اینا کرینینا کی بات ہی اور ہے۔یہ اُسکا دوسرا ناول تھا۔اینا کرینینا کے کچھ حصے میں روس کی ترکی کے ساتھ جنگ کا بھی ذکر ہوا۔تاہم یہ سچائی کی حقیقت نگاری اور جذبوں کی انتہاؤں کو چھوتا ایسا دلکش ناول جس نے اپنے وقت اور عہد کے بہترین لکھاریوں سے خود کو منوایا۔نقادوں کی رائے ہے۔

This is less a work of art than a piece of life,

but what it loses in art it gains in reality.

اُس کے سارے کردار تو جیسے چھم چھم کرتے میری آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔اینا کرینینا کے چہرے پر پھیلی متانت اور خوبصورتی کی گھمبیرتا اس کے احساسات کی داخلی کشمکش، روح کی افسردگی، ورونسکی کے اندر بھرا ہوا جوش و جذبہ، جوانی کا حُسن اور جنون ایک شادی شدہ عورت سے انتہا درجے کا عشق، دلیر مگر اندر سے خوف زدہ بھی۔ورونسکی کے

کردار کے اِن پہلوؤں کی عکاسی کس درجہ خوبصورت تھی۔

لیوین Levin بھی انتہا درجے کا متاثر کن کردار ہے جو انیسویں صدی کی آخری نصف صدی کے روسی معاشرے پر اثر انداز ہوتے مختلف رجحانات جن میں تعلیم ،خواتین کے حقوق ،سیاسی نظریات ،کسانوں کا معاشرے میں کردار جیسے موضوعات پر بے باکانہ اظہار لیوین کی شخصیت کو دل کش بناتے تھے۔

دراصل جب لکھنے والا اپنے زمانے کی معاشرتی خرابیوں کو موضوع بناتا ہے تو جاذبیت بڑھ جاتی ہے۔اس ناول نے روسی معاشرے میں پھیلے ہوئے منافقانہ رویوں ، ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کی عادتوں ،حسد ،بغض سے بھرے جذبوں کی بڑی کھل کر عکاسی کی تھی۔

خاندانوں میں شادی بیاہ کے مسائل بھی اس وقت کا ایک اہم مسئلہ تھا۔ناول میں یہ پہلو بھی مختلف انداز میں زیر بحث آیا۔سوسائٹی میں نفسانی خواہشات کے بے ڈھنگے اور بے ڈھبے اظہار ،اخلاقی اقدار کی کمی ،شہری زندگی کے طرز معاشرت میں دیہی زندگی اور زرعی مسائل کا دخول سب ایسے موضوع تھے کہ جو اس وقت کی سوسائٹی میں رچے بسے ہوئے تھے۔جن کی خامیوں اور کہیں خوبیوں سے معاشرے کا تانا بانا بنا ہوا تھا۔

مزے کی بات یہاں ٹالسٹائی کا منفرد اسلوب سامنے آتا ہے کہ ان پر لکھتے ہوئے ٹالسٹائی ان کی اخلاقی نقطہ نظر یا بطور نشان دہی کے کسی وضاحت کے چکر میں ہرگز نہیں پڑا بلکہ وہ اپنے موضوع اور خیالات کو روسی زندگی کے وسیع پینوراما میں پھیلاتے ہوئے چلا جاتا ہے اور وہ جو پیغام دینا چاہتا ہے وہ بھی عیاں ہو جاتا ہے۔کہہ لیجیے کہ لیوین کے کردار میں خود ٹالسٹائی ہے۔اس کی فکر ،اس کے خیالات ،اس کی جدوجہد ،اسکے تجربات سبھی کا کھل کر اظہار سامنے آتا ہے۔

ورونیکا نے میری باتوں سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا۔

"دراصل تو سارا کمال ہی مصنف کا ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ اُس کی ناول نگاری نے روسی سوسائٹی کی کبھی پرتوں کو جن میں وہ خود بھی رہ رہا تھا تہہ در تہہ کھول کر اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

اب کوساکز The Cossacks کو ہی دیکھیں۔ یہ ناول بھی بنیادی طور پر تالستائی کے تجربات پر ہی مبنی ہے۔ جب وہ کاکیشیا کے علاقوں میں رہا تھا۔

کہانی دیکھیں ذرا۔ اس کے ایک مرکزی کردار دمیتری آلینن Olenin جو روسی فوج کا کیڈٹ ہے۔ جس پر اُس علاقے کا فطری حُسن، انسانی نفسیات اور رویوں کی پیچیدگیاں، سچائی، انسان کے اندر نیکی کا حُسن اور کوساک معاشرہ اپنے تمام تر حُسن اور رنجیوں کے ساتھ آشکارہ ہوا تھا۔ کوساک لڑکی کی مارینا کی سادگی، اُس کا کاکیشیائی حُسن، پہناوے اور لوکا Luka مارینا کے منگیتر کی دلیری، شجاعت، کینہ، نفرت جیسے جذبات کے ساتھ ناول ایک خوبصورت ادب پارہ بن گیا ہے۔

میں محسوس کر رہی تھی کہ دل کش خدوخال والی دوشا کیلئے اب خاموشی سے اُسے مزید سُننا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے لب کھول لئے تھے۔

آپ کی رائے اپنی جگہ اہم ہے۔ اس پر بحث نہیں ہوسکتی۔ تحریر کو دیکھنے اور پرکھنے کے پیمانے ہر ایک کے اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ تاہم میری ناقص رائے میں "جنگ اور امن" کو عظیم ترین ناولوں میں سے ایک شاہکار خیال کیا گیا ہے۔ اس کے موضوع کی وسعت اور کرداروں کی اختتام تک جرأت کمال کی ہے۔ ناول میں بکھرے ہوئے سینکڑوں کی تعداد میں کردار کہیں گھریلو زندگی، کہیں نپولین کے ہیڈ کواٹر، کہیں زار روس الیگزینڈر اول اور کہیں جنگ کے میدانوں کی کیا خوب عکاسی کرتے ہیں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ ٹالسٹائی کا ناول کو لکھنے کا بنیادی مقصد تو صرف ڈیمبرسٹ بغاوت کی وجوہات کو کھوجنا اور انہیں فکشن کی صورت دینا تھا۔ دراصل ڈیمبرسٹ تحریک تاریخ روس میں بڑی انقلابی تحریک بن کر ظاہر ہوئی تھی۔ مگر ہوا کیا کہ وہ بہت سے دوسرے موضوعات میں اُلجھ گیا اور یہ صرف اختتامی باب تک ہی محدود ہو کر رہ گیا جہاں اُس نے اینڈریو بالکونسکی Bolkonsk کے بیٹے کو ایک ڈیمبری بنا کر قصہ پار کیا۔

ہاں ورونیکا رک گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ کی کلی کھلی۔ آنکھوں میں سرور کی سی کیفیت کی لو دمکی اور انگلیوں کا چٹکی کے سے انداز میں بجانے کی کھنک فضا میں گونجی۔ میں نے نگاہوں کا رخ پھیرا۔ ماحول میں تیرتی تبدیلی نے مجھے سمجھایا تھا کہ یارڈ کی دکان سے آتی گانے اور موسیقی کی آوازیں ورونیکا کے کسی پسندیدہ گیت میں ڈھل گئی ہیں۔ بات کے موڈ میں اس وقت آئی جب گانا ختم ہوا۔

عجیب سی بات ہے ٹالسٹائی تو اپنے اس ناول کو ناول نہیں بلکہ کچھ اور ہی خیال کرتا ہے۔ یہ بھی مزے کی بات ہے کہ اپنے وقت کے بڑے ناولوں اور ناول نگاروں کا اعتراف کرنے سے بھی وہ انکار کرتا ہے۔ تاہم اس کے اس خیال کی حیرت اس وقت کم ہو جاتی ہے جب آپ محسوس کرتے ہیں کہ ٹالسٹائی ایک حقیقت پسند ناول نگار ہے جس کے خیال میں انیسویں صدی کی زندگی کے سیاسی اور سماجی مسائل میں گھری اور اس کی حقیقی ترجمانی کرتی ہی کوئی تحریر ناول ہو سکتی ہے۔

میں ہنس پڑی تھی۔

اب دیکھ لو ورنیکا وہ تو خود کہتا ہے کہ اینا کرینینا ہی میرا پہلا سچا اور کھرا ناول ہے۔

اسی طرح what is to be done میں کیسے وہ ملک میں پھیلی انارکی کی کیفیت سے امن پسندی کی خواہش میں عیسائیت کے فلسفے سے متاثر روسی آرتھوڈوکس چرچ کی گود میں

چلا جاتا ہے۔

بلاشبہ بطور لکھاری وہ روسی ادب کا دیو ہے۔اُس نے شاہکار تخلیقات دنیا کو دیں۔مگر بطور شوہر ایک بیوی کی نظر میں وہ کیسا انسان ہے؟ یہ بھی دیکھنے والی بات ہے۔

یہ کس قدر ستم کی بات ہے کہ وہ آدمی جس کا دماغ عجیب و غریب سے مذہبی خیالات سے بھرا ہے۔وہ جو روسی ارسٹو کریسی عورتوں کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہے اور وہ رائے بڑی منفی قسم کی ہے کہ وہ اچھے کردار کی مالک نہیں۔اور یہ کہ اُسے شادی ہی نہیں کرنی۔

اب ہوتا کیا ہے۔شادی ماسکو میں ہوتی ہے۔1862 میں ماسکو کے ایک ڈاکٹر اینڈ ریو کی تیسری بیٹی صوفیہ بہرز Behrs سے چونتیس سال کا آدمی عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔تحریری خط کے ذریعے اُسے بتاتا ہے کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شادی کے فوراً بعد اُسے اپنی ڈائریاں دیتا ہے۔جن میں اُس کے عشق کی داستانیں ہیں۔اس کے عجیب و غریب سے مذہبی خیالات ہیں جن میں وہ روسی ارسٹو کریسی کی عورتوں کو بہت اچھی طرح جاننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ان کے بارے میں اس کے خیالات بڑے منفی قسم کے ہیں۔اس کا فیصلہ تھا کہ وہ شادی ہی نہیں کرے گا۔

ان ڈائریوں میں اس کے جنسی تعلقات کی بھی تفصیلات ہیں۔زرعی کسان غلام جنہیں سرف کہتے ہیں کی ایک خوبرو عورت سے جنسی تعلقات اور ایک بچے کا باپ ہونے کی نوید اپنی تحریر کے ذریعے اُس کی آنکھوں سے گزار کر دل کو گھائل کرتا ہے۔

ذرا اپنے آپ کو اس کی جگہ رکھ کر تصور کریں کہ امنگوں اور آرزوؤں سے بھری ایک دلکش لڑکی اپنی آنکھوں میں خواب سجائے یہ سب پڑھتے ہوئے کتنی دل برداشتہ ہوئی ہوگی۔زمانہ بھی تقریباً سوا ڈیڑھ صدی پیچھے کا ہے جب روسی عورت اتنی آزاد بھی نہ تھی جتنی آج

ہے۔پر حقیقت یہ ہے کہ آج کی ماڈرن عورت کو بھی اگر ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے تو وہ بھی صوفیہ ٹالسٹائی کی طرح روتی اور کرلاتی ہے۔

ورونیکا کھلکھلا کر ہنسی اس کے دانت گو سفید موتیوں جیسے نہ تھے مگر خفیف سی درزوں کے ساتھ ایک تناسب سے جڑے خوبصورت لگتے تھے۔

”من وعین یہی سین ٹالسٹائی اینا کرینینا میں دہراتا ہے۔جب چونتیس سالہ کونستنتین Constantin اپنی انیس سالہ منگیتر کیٹی کو ڈائریاں دیتے ہوئے کہتا ہے۔

”انہیں پڑھ لینا میرے ماضی سے واقف ہو جاؤ گی۔“

اب دونوں میں ہلکی پھلکی سی نوک جھونک کا منظر پیدا ہو گیا تھا۔

”ایک نوخیز دلہن کے جذبات کا ذرا سوچو تو یہ کتنا سفاکانہ پہلو تھا کیا تم اِسے سراہو گی۔“

داشا نے قدرے نروٹھے پن سے ورونیکا کو گھورا اور بولی۔

صوفیہ اپنی ڈائری میں کیسے یاس بھرے انداز میں لکھتی ہے۔

”مجھے تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرے اوپر کوئی بم پھٹا ہو۔ایک خوف میری رگوں میں سرایت کرنے لگا تھا کہ وہ کہیں دوبارہ اس کے پاس نہ چلا جائے۔

شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے جو لکھا اُسے ذرا سنو۔

شادی جو جوانی کے خوبصورت اور محبت بھرے رومانس سے شروع ہوئی تھی۔اسمیں کچھ خوشی بھرے لمحے بھی آئے۔مگر ان کی مدت کتنی تھوڑی تھی۔جھگڑے بہت جلد شروع ہو گئے تھے۔

”وہ بہت سرد مہری کا سلوک کرتا تھا۔گھر سے نکلتا تو گھنٹوں واپس آنے کا نام نہ لیتا۔میں صبح، دوپہر اور شاموں میں اکیلی ہوتی۔مجھے محسوس ہوتا میں اس کے بچے کی رس

ہوں، گھر میں رکھے فرنیچر کا ایک ٹکڑا ہوں۔ سٹور میں پڑے سامان کا ایک حصّہ ہوں۔ میں بے حد ناکارہ اور کوئی فالتو چیز ہوں۔ میں کتنی تنہا ہوں۔''

یہ تو پاگلوں جیسی باتیں کرتی ہے۔ عورتیں تو سدا ہی شوہروں سے شاکی رہتی ہیں۔ جس سے پوچھ لو وہ سو کیڑے نکالے گی اُن میں۔ زمانہ جس کی عظمتوں کا گواہ ہوا۔ میرا وہ پیرو مرشد، میرا راہبر، میرا محبوب لینن کلاسیک لٹریچر کا دیوانہ۔ کیا بتاؤں کہ وہ ٹالسٹائی کا کتنا بڑا مدّاح تھا؟ اُسے بار بار پڑھتا۔ لطف اٹھاتا اور اپنی نصف بہتر سے کہتا۔

''کرپسکا یورپ میں ٹالسٹائی کا مقابلہ کس سے کرو گی؟''

اپنے ہاتھوں کو خوشی و مسرت سے مسلتے ہوئے وہ اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتا۔

''کسی سے بھی نہیں۔ ارے کرپسکا یا کوئی بھی اُس جیسا نہیں۔''

داشا کی آواز بھرّا سی گئی تھی۔

وہ مزید اپنے کرب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہے۔

''میں ہمہ وقت حاملہ ہی رہتی تھی۔ زندگی کتنی ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ میں اکثر اپنے دل کو ٹٹولتی اور خود سے پوچھتی ہوں۔ میں کیا چاہتی ہوں؟ اور جو جواب آتا ہے وہ مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ میرا اندر رنگ رلیوں سے بھری زندگی کا متمنی ہے۔ میں سمارٹ رہنا چاہتی ہوں۔ لوگوں سے سُننا چاہتی ہوں کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔ پھر جیسے میں جھلا جاتی ہوں اور کہتی ہوں کہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟''

ورونیکا کچھ بولنا چاہتی تھی۔ داشا نے اسے بھانپ لیا تھا۔ اُسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

''عورت کے نقطۂ نظر سے اِن جملوں میں چھپا درد دیکھو۔

اس کی یادداشتوں کو لکھتے ہوئے میں ایک جملہ پڑھتی ہوں۔ ''دنیا میں محبت قسم کی

کوئی چیز نہیں۔ یہ صرف جسمانی ضرورت ہے۔ جنسی تعلقات کیلئے ساتھی کی ضرورت بس۔ اگر میں یہ چیزیں شادی سے پہلے کہیں پڑھ لیتی تو کبھی اس سے شادی نہ کرتی۔"

دوشا کو کیفے کے اندر سے کسی نے آواز دی تھی وہ ابھی آئی کہتی ہوئی چلی گئی۔

"چلو ورونیکا تم ٹالسٹائی کی زندگی کے بارے کچھ بتاؤ۔"

نو ستمبر 1828ء میں روس کے صوبے طلا (Tula) میں اپنی ذاتی جاگیر یاسنایا پولیانہ میں پیدا ہونے والا یہ عظیم لکھاری چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ماں شہزادی نی (Nee) اُسے صرف دو سال کی عمر میں ہی چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی۔ ان بچوں کی پرورش کی پہلی ذمہ داری ان کے باپ کاؤنٹ نکولائی ٹالسٹائی کی کزن نے اٹھائی۔ جب وہ نو سال کا تھا تب باپ بھی رخصت ہوا۔ قانونی گارجین ان کی پھوپھی ٹھہری۔ مگر ابھی تھوڑا سا ہی وقت گزرا تھا کہ اُسے بھی موت چھین کر لے گئی۔ سارے بچوں کو کازان ایک اور خالہ کے پاس جانا پڑا۔

بچپن میں ان انتہائی قریبی رشتوں کی پے در پے محرومیاں تھیں۔ اس کا اندازہ اس کی یادداشتوں سے ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ جرمن اور فرنچ استاد تھے۔ سکولنگ میں احساس ہوا کہ وہ اچھا طالب علم نہیں ہے۔ ہمیشہ معمولی نمبر لیتا۔ کازان یونیورسٹی سے کوئی ڈگری یا ڈپلوما تک نہیں حاصل کر سکا۔ اب کرنے کو کیا کام تھا؟ باپ کی جاگیر پر آ گیا۔ کھیتی باڑی میں مصروف ہوا۔

رُوس میں اُس زمانے میں زرعی غلامانہ نظام رائج تھا۔ اس نے کسان غلامی تحریک کو متحرک کیا اور اُس کا لیڈر بن گیا۔ مگر وہ اسے بھی زیادہ فعال نہ کر سکا کہ آئے دن تو وہ ماسکو اور طولا (Tula) بھاگا پھرتا۔ تاہم ایک کام کا اس نے باقاعدہ آغاز کیا اور وہ اُس میں کامیاب ہوا اور اسی نے اُسے ناول نویسی کی طرف متحرک کیا۔ یہ اُس کا روزنامچہ لکھنے کی

عادت تھی۔

ابھی وہ اپنی جاگیر پر ہی تھا جب اُس کا بھائی نکولائی Nokoley اُسے ملنے آیا۔ وہ آرمی میں تھا۔اُس نے اُسے بھی آرمی جوائن کرنے کو کہا۔کاکیشیائی پہاڑوں کے قصے تفصیلات کے ساتھ اُسے سنائے۔

فوج میں اُس نے جنکر کے طور پر شمولیت کی اور یہی وہ مقام تھا جہاں اُس کی زندگی نے راہ بدلی۔وقت کی فراوانی تھی۔اُس نے وقت گزاری کیلئے اپنے بچپن کی یادوں کو کہانی کے طور پر لکھنا شروع کیا۔پھر یہ اُس وقت کے پسندیدہ اور مقبول ترین روزنامہ ''The Contemporary'' میں چھپنے کیلئے بھیج دیا۔اور بس یہی مقام آغاز تھا کہ اسے پڑھنے والوں نے انتہائی پسندیدگی کا مرتبہ دیا تھا۔

یہ اہم بات تھی کہ یہ لکھنا جیسے عادت سی بن گئی۔جنگ کریمین (Crimean) کے دوران اُس نے لڑکپن ''Boy hood'' لکھی۔اور اُسی دوران اُس نے جنگ سے متعلق تضادات پر اپنے خیالات کا اظہار تین سریز پر مشتمل Seva stopl Tales کے عنوان سے کرتے ہوئے اُسے ایک نیا رنگ اور نیا اسلوب دیا۔

یہ سریز ایک سپاہی کے شعور و آگہی کی خوبصورت عکاس تھی۔جنگ ختم ہوئی۔اُس نے فوج کو خیر باد کہا اور روس آ گیا۔

تیزی سے اُبھرتے مصنف کو پیٹرز برگ کے ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی۔ضدی، ہٹیلے اور منہ زور سے ٹالسٹائی نے کسی بھی ادبی تنظیم سے وابستہ ہونے سے انکار کر دیا۔بیانگ دہل اُس نے خود کو انارکسٹ کہا اور پیرس آ گیا۔جو پیسہ ساتھ لایا تھا وہ جوئے کے شوق کی نظر ہوا۔جب جیب میں پھوٹی کوڑی نہ رہی تب گھر لوٹا۔

"Youth" جوانی نے 1857 میں چھپ کر اس مثلث کو مکمل کر دیا جو اُس کے بچپن، لڑکپن اور جوانی پر پھیلی ہوئی تھی۔ وار اینڈ پیس کے بعد 1873 میں اینا کرینینا اور 1986 میں The Death of ivan Ilyich چھپے۔ Resurrection اُس کا بے حد ضخیم ناول تھا۔ 1904 میں ہادی مراد لکھا گیا جو اس کی موت کے بعد چھپا۔

داشا واپس آئی۔ خوبصورت دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

''اس کے فن پر قصیدے ابھی جاری ہیں۔''

''ہم تو تمہارے انتظار میں تھے کہ کب آؤ اور صوفیہ کی ڈائری کے چند ورق اُلٹو۔ اور صوفیہ کی شان میں اس کی عظمتوں کے گیت گاؤ۔

''تو سُنیے پھر۔ میں ورق پلٹتی ہوں۔''

میں اپنے شوہر کے لٹریری کام میں کتنی بڑی معاون تھی۔ اُس کا شاید اُسے احساس ہی نہیں تھا۔ "وار اینڈ پیس" کو میں نے دو تین بار نہیں سات بار لکھا۔ یہ نہیں کہ اسکا کوئی حصہ جس میں کہیں ترمیم یا کوئی اضافہ ہوا ہو۔ بلکہ اول سے آخر تک لکھا۔ اس کی تمام ترسفاکیوں کے باوجود، اُس کے رُلا دینے والے رویوں سے دل برداشتہ جہاں وہ مجھے مجبور کرتا کہ میں ہر بچے کو اپنا دودھ پلاؤں۔ اس کیلئے سبزی کا سالن بھی خود بناؤں کیونکہ وہ ویجیٹرین تھا۔ کام کے بوجھ نے مجھے بیمار کر ڈالا تھا۔ کمر کا درد مستقل رہنے لگا تھا۔ نکسیر اکثر پھوٹی رہتی۔ اور دانتوں کی تکالیف آئے دن مجھے رُلاتیں۔

مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان تکالیف کی شدت اس وقت بہت کم ہو جاتی ہے جب میں اُس کا لکھا ہوا پڑھتی اور اُسے لکھتی۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے کوئی بھی چیز اتنی متاثر نہیں کرتی تھی جتنے اس کے خیالات اور اس کی ذہانت۔ الفاظ جیسے کھلونوں کی طرح اُس کے ہاتھوں میں کھیلتے اور خیالات کسی آسمانی پھوار کی طرح اُس کے دماغ سے برستے۔

بہت سالوں بعد صوفیہ کی ایک اور تحریر ہماری آنکھوں کو بھگوتی ہے۔ درمیانی عمر کی وہ عورت ابھی بھی بہت پرکشش تھی۔ ڈھیروں بچوں کے باوجود اس عورت نے اپنی ذات کو خود اذیت پرستی میں مبتلا کرلیا تھا۔ گندی اور بے ہودہ کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتی اور انہیں پڑھتی۔ گھنٹوں پیانو بجاتی رہتی۔ ٹھنڈے پانیوں میں دیر تک پیراکی کرتی اور نوجوان کمپوزر سرگئی تانیر Sergei Taneer سے گپ شپ کرتی۔

قدرتی بات تھی تالستائی کو شدید حسد محسوس ہوا تھا۔ اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"میں خودکشی کرلوں گا اگر تم باز نہ آئیں۔"

اور اُسے نہ چاہنے کے باوجود اپنی اُن تمام سرگرمیوں کو ختم کرنا پڑا جن سے وہ مسرت کشید کرنے لگی تھی۔

کاش اُسے نسائی نفسیات کی ذرہ سی بھی سوجھ بوجھ ہوتی تو وہ یقیناً میرے اندر پھیلے درد اور یاس بھرے جذبات کو سمجھتا۔

میں تو اپنے گھر میں ہی مہاجر ہوگئی تھی۔

ہم سب قدرے اُداس اور ملول سی فضا میں سانس لیتے تھے۔ داشا پھر صوفیہ کا روپ دھارے بولتی چلی جارہی تھی۔

میں کھانا کھانے، سونے اور خاموش رہنے میں تو خودمختار تھی پر کسی ایسے کو پیار کرنے میں جس میں میری رضا اور خوشی شامل ہو آزاد نہیں تھی۔ کبھی کسی محفل میں جب لوگ یہ کہتے تم کتنی خوش قسمت عورت ہو۔ تمہارا شوہر جینئس ہے۔ کیا تم خوش اور شکرگزار نہیں ہو؟ میرا اندر کبھی کبھی میرے چہرے پر رقم ہوجاتا تب میں حیرت بھرے جملے بھی سُنتی۔

"تم کتنی ناشکری عورت ہو۔"

اور جب میں بڑے بڑے لکھنے والوں کے تاثرات اور آراء پڑھتی جیسا کہ دوستوفسکی نے کہا کہ یہ ایسا کمال کا کام ہے جس میں کوئی خلا نہیں، کوئی نقص نہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آرٹ کا شاہکار ہے۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار ولادی میر نیبو وکوو Nabokov اور ولیم فولکنرز Faulkner نے کیا جن کے خیال میں وہ ایسا ناول ہے جو شاید ہی کبھی لکھا گیا ہو۔ جادوئی اثر والا۔

تب میں عجیب سے احساسات کا شکار ہو جاتی۔ بہت دیر ایک تاسف اور دکھ کی سی کیفیت میں گم رہتی۔ پھر جیسے میرا اندر بلبلانے لگتا۔ میں خود سے باتیں کرتی۔

یہ ناشکری عورت اس کی سکریڑی تھی، پروف ریڈر، ایڈیٹر، ہاؤس کیپر، اس کی ایجنٹ اس کے سٹیٹ معاملات کی نگران، اُس کے تیرہ بچوں کو پیدا کرنے والی ماں اور ایک نرس۔

سچ تو یہ ہے کہ میں نے چالیس سال تک ایک جینئس کی خدمت کی۔ اپنی کتنی خواہشوں کا گلا گھونٹا اور اس نے کیا کیا؟ وہ اپنی پرسکون، آرام دہ اور پرامن گھریلو زندگی کو 82 سال کی عمر میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

صوفیہ اپنی ساٹھویں 60 کو مناتے ہوئے کہ جو عین اس دن تھی جب اُسے پروپوز کیا گیا تھا خود سے پوچھتی ہے کہ اُس نے اٹھارہ سالہ لڑکی کے ساتھ کیا کیا؟ جس نے اپنی ساری زندگی اُسے دے دی۔ اپنی محبت، اپنا اعتماد بھی کچھ اسکے قدموں میں نچھاور کر دیا اور میں نے کیا حاصل کیا؟ اذیتیں، سردمہری، ظلم۔

زندگی کی آخری دو دہائیوں میں اُس نے ایک اور مصیبت اپنے گلے میں ڈال لی تھی۔ ایک کامیاب ناول نگار ہونے اور بے حد شہرت پانے کے باوجود وہ روحانیت کے جھنجھٹ میں پڑ گیا اور اکثر بہت ڈپریس رہنے لگا۔ "زندگی کیا ہے" اس کا مفہوم واضح کرنے

کیلئے وہ آرتھوڈوکس گرجوں میں جانے لگا۔اسکا یقین پختہ ہوگیا کہ یہ سب خرابیوں کے اڈے ہیں ۔اس نے اپنے خیالات اور عقائد کو لکھنا شروع کیا۔

1883 میں The Meditator چھپی اور ساتھ ہی اُس نے گورو کی سی حیثیت اختیار کرلی تھی۔اُس کے مداحوں کے تانتے تو پہلے ہی تھے اب عقیدت مندوں اور پیروکاروں کی قطاریں لگ گئیں۔اس نئے مشغلے کی دیکھ بھال کا بوجھ بھی صوفیہ کو ہی اٹھانا پڑا۔

انہی دنوں میں وہ لکھتی ہے۔میں خود سے پوچھتی ہوں کیا میں نے اپنے شوہر کو خوش نہیں کیا۔کبھی کبھی میرا جی اُسے قتل کرنے کو چاہتا ہے۔کبھی میں اپنے آپ کو قتل کرنے کا سوچتی ہوں۔

اس کی ایک اور بڑی ہی افسردہ تحریر دل کو ملول کرتی ہے۔

انقلاب،بالشویک انقلاب دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہونے جیسی سرگوشیوں نے واضح صورت اختیار کرلی ہے۔آئے دن دھمکیاں ملنا معمول بن گیا ہے۔تاریخ ہر چیز کو تباہ کرنے پر تلی نظر آتی ہے۔

اُف میں اپنی چار ہزار 4000 ایکڑ کی اسٹیٹ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے خود سے کہتی ہوں۔

"ہمیں یہاں رہتے ہوئے ہمیں نصف صدی گزرگئی ہے۔اس طرز زندگی کی عادت سی ہوگئی ہے۔ہر روز ہم اکٹھے ہوتے ہیں۔میٹنگ ہونا معمول بن گیا ہے۔اس میں سوچ بچار ہوتی ہے کہ ہمیں اس لوٹ مار سے خود کو کیسے محفوظ رکھنا ہے؟میری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ہمارے گھوڑے،خچر،بیل مزارعے سب طولا کی ہائی وے پر بھاگے چلے جارہے ہیں۔میری ہر وہ چیز لٹتی جارہی ہے جس سے مجھے پیار ہے۔جن کے ساتھ میرا وقت گزرا جو

میرے خوشی اور یاس کے دنوں کے ساتھی ہیں۔

موت بھی عجیب ڈرامائی انداز میں ہوئی۔

نمونیئے کا پرانا مریض تھا۔وقت کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ و اشتعال، بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔خودکشی کرنے کی خواہش بھی اکثر اندر سر اٹھاتی تھی۔

ٹالسٹائی کا ایک با اعتماد پیروکار ولد دی میر chertkov سابق فوجی افسر ایک بڑا بیوروکریٹ اس کے ادبی معاملات کو ڈیل بھی کرتا تھا۔صوفیہ کی آنکھوں میں تنکے کی طرح کھٹکتا تھا۔اس کے خیال میں وہ شیطان تھا۔اُسے دونوں کے درمیان جنسی تعلقات کا بھی شبہ تھا۔

7نومبر 1910 کی سرد ہڈیوں میں کودا جماتی رات تھی۔جب بیاسی 82 سال کی عمر میں اُس نے ڈرامائی فیصلہ کیا۔اُس نے اُس عورت کو جو اس کے ہر دکھ درد میں اس کی ساتھی تھی کو بتانے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ اسکے دل میں کیا ہے؟

آدھی رات کو اس نے کسی کو بتائے بغیر اپنا آرام دہ گھر اپنی اسٹیٹ چھوڑی۔چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد وہ شرمارڈینو Sharmardino پہنچا۔یہاں اس کی بہن ماریا رہتی تھی۔یہیں کوئی ہٹ کرائے پر لے کر وہ بقیہ زندگی گزارنے کا متمنی تھا۔لیکن اُسے وہاں ٹکنا نصیب نہ ہوا۔اُسے مجبور کیا گیا کہ وہ کاکیشیا جانے کیلئے گاڑی میں سوار ہو۔اس کی کمزور صحت اسے برداشت نہ کر سکی۔Astaporo ایک بہت چھوٹے سے دور افتادہ سٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر نے اُس کیلئے اپنے گھر کے دروازے کھولے۔یہ بیس 20

نومبر تھا اور وقت ساڑھے چھ کا جب اُس نے دنیا کو الوداع کہا۔
اور میری آنکھیں گیلی تھیں۔ داشا کی آنکھیں گیلی تھیں۔

☆☆☆

دوستوو سکی

روس کا عظیم کلاسیکل ناول نگار

اور

اینا دوستوو سکی

- دو گھنٹے سے زیادہ وقت میں نے اینا دوستووکی کے کمرے میں گزارا۔ میرے سارے جذبے اس عورت کو خراج تحسین پیش کرتے تھے جس نے ساری زندگی کرائے کے گھروں میں گزاری۔
- میں اپنے بارے میں پرامید ہوں۔ انسان ایک سربستہ راز ہے اور اسے کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
- "Poor Folk" میں اس کا ہیرو کوئی رومانوی کردار نہیں تھا بلکہ معاشرے کا ستم رسیدہ غیر اہم شخص ایک کلرک تھا۔ انسان کے اندر کی سچائی کی تلاش کو اس نے اپنی تحریر کا منتہا ٹھہرایا۔

اومسک Omsk جیل میں چار سالہ مشقت بھری قید نے اسے اتنی تکلیف نہیں دی جتنی قلم کاغذ اس کے ہاتھ سے چھننے پر ہوئی ۔ اسے اسی کا ڈر تھا اور یہی اُس نے کہا۔

"اگر مجھے لکھنے نہ دیا گیا تو میں مر جاؤں گا۔کاغذ اور قلم کے ساتھ میں پندرہ برس کی سزا کو بھی بخوشی کاٹنے کے لئے تیار ہوں۔"

بیرکوں میں یہ چار سال چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ اُس نے گزارے ۔ان کرداروں میں جو گہرائی ،توانائی اور خوبصورتی اس نے دیکھی وہ کہنے پر مجبور ہوا۔

"یہ تو بدصورت سیپیوں میں بند وہ سونا ہے جس کی دریافت میں نہ مجھے اپنے برسوں کے ضائع ہونے اور نہ کاغذ قلم نہ ہونے کا دُکھ ہے۔میں نے ان حیرت انگیز لوگوں کو باریک بینی اور سچائی سے پڑھنے اور ان کے کرداروں کی بے شمار جہتوں کو پرکھنے کی جو کوشش کی ہے وہ میرے لئے بہت بڑا اثاثہ ہے۔

میں نے رُوس کو نہیں پر رُوسی لوگوں کو ضرور جانا اور سمجھا ہے۔"

دوستوو سکی اور اپنا دوستوو سکی

سچ تو یہی تھا کہ میں تو سینٹ پیٹرز برگ کے ریلوے سٹیشن سے ہی سیدھی اُس عظیم ناول نگار کے گھر اور میوزیم جانے کی خواہش میں بے حال تھی۔ پر مصیبت تو یہ تھی کہ صورت اس شعر کی غماز تھی۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

ایک تو میری ساتھی محل میناروں کی شیدائی۔ونٹر پیلس اور ھرمیتیج کا سبق گھر سے پڑھ کر چلی تھی۔دوسرے میں خود بھی محلات اور چرچوں کے طرز تعمیر کی فنکاریوں، فنون لطیفہ کی گھمبیرتاؤں اور ان کی بوقلمونیوں میں یوں اُلجھی کہ دوستوو سکی ذرا سا دل سے اوجھل ہو گیا۔

چوتھے دن سویرے سویرے مجھے اس کی ہُڑک اٹھی تھی۔میں بک گائیڈ ہاتھ میں پکڑے ریسپشن پر چلی گئی۔ریسپشن پر ہر دوسرے دن ایک نئی لڑکی ہوتی۔

آج جو کھڑی تھی وہ پونے چھ فٹی سرو کے بوٹے جیسی قامت والی جس کی صراحی دار گردن پر جو سر ٹکا تھا اُس پر ایک گلاب چہرہ سردیوں کی چاندنی راتوں کی طرح سنجیدہ اور

اُداس سا جھلملاتا تھا۔ ایک تو مجھے ان روسی لڑکیوں کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ کمبختیں مسکراہٹ کے لئے اتنی کمینی اور کنجوس کیوں ہیں؟ منحوس ماریاں کلیوں کے اس چٹکاؤ کو سات تالوں میں کیوں قید رکھتی ہیں؟ بھلا اس پر کوئی زور خرچ ہوتا ہے۔ کوئی پیسہ لگتا ہے۔ کون انہیں سمجھائے کہ باچھوں کو ذرا سا کھول دینے سے ان کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

ہاتھ میں پکڑی گائیڈ بک میں نے کاؤنٹر پر رکھی اور اُسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے دوستوو سکی کی تصویر پر انگلی رکھی۔ ہاتھ فضا میں استفہامیہ تاثر دیتے ہوئے لہرایا۔

''ٹیکسی۔'' وہ بولی۔

''نییت۔ (نہیں) میٹرو یا بس۔'' میں نے جواباً کہا۔

یہ بھی مقام شکر تھا کہ وہ انگریزی کا دال دلیا کر لیتی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس نے مجھے بتانا چاہا کہ تم ٹیکسی کرلو ٹھیک رہو گی۔

''ارے مجھے کُتّے نے کاٹا ہے جو ٹیکسی کرلوں۔ ایک دو کلومیٹر کا راستہ اُس نے گھما پھرا کر دس کا کرلینا ہے۔ اور پانچ سو چار سو روبل جھاڑ لینے ہیں۔ رُوس کے ٹیکسی ڈرائیور بھی اول درجے کے کائیاں ہیں۔ غیر ملکیوں کو لوٹنا جانتے ہیں۔ یوں بھی من موجی اور ٹریفک قواعد و ضوابط میں لاپرواہ سے ہیں۔ ایسی ایسی پھُرتیاں دکھاتے ہیں کہ مانو لگتا ہے جیسے سواری کو تو اُوپر پہنچا کر ہی دم لیں گے۔

لڑکی ہنس پڑی اور بولی۔

''آپ تو میرے سامنے زمین پر زندہ سلامت کھڑی ہیں۔ یہ بڑے ماہر ڈرائیور ہوتے ہیں۔ گھبرایا نہ کریں۔''

''بس تم مجھے سمجھا دو۔ میٹرو یا بس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں۔''

"میٹرو سے۔" اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

اس کی حیرت پر مجھے اچنبھا ہوا۔

"لو یہ ہمیں کیا گاؤدی عورتیں سمجھ رہی ہے۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔

چلو خیر کچھ زبان اور کچھ جیسچر نے سمجھا اور سمجھایا۔ اور ہم لوگ چلے۔ سادوویا Sadovya میٹرو سے دوستووسکی سکایا میٹرو پر اُترے۔ باہر آئے۔

گاڑیوں بسوں سے بھرا ہوا یہ چوک جس کے عین سامنے خوبصورت ولادی میر چرچ تھا جس کے ساتھ ہی کزنچنی Kuznechny لین ہے۔ نقشے پاس ہونے کے باوجود ہم لوگوں کو روک کر پوچھنے میں ذرا سا تامّل نہیں کرتے تھے۔

مگر اِس پریکٹس کے باوجود ہم پرائی یم سکایا سٹریٹ سے ذرا آگے نکل گئیں جواب دوستووسکی سٹریٹ کہلاتی ہے۔

جب واپس پلٹنے لگے تو فٹ پاتھ پر چار بوڑھی عورتوں کو تازہ سلاد کی سُرخ مولیاں، ہرا پیاز، پودینہ اور گاجریں بیچتے دیکھا۔ مُولیوں اور گاجروں کی خوش رنگی اور تازگی اپنی جگہ تھی۔ پر جو بوڑھیاں دوکاندار بنی وہاں کھڑی تھیں وہ اپنے پہناوں کے ساتھ پیٹرزبرگ کی قدیم تہذیب کی نمائندہ تھیں۔ موٹی چنٹوں والے لونگ سکرٹ، پوری آستینوں والے لمبے بلاؤز اور سروں پر خاص قسم کی ٹوپیاں اوڑھے۔

مولیاں اتنی تازہ اور خوش رنگ تھیں کہ بے اختیار اُسی وقت جی چاہنے لگا کہ ابھی پکڑیں اور کچر کچر کھانا شروع کر دیں۔ یقیناً ایسا کر بھی لیتے پر ایک تو ابھی سویر تھی۔ بھاری بھرکم ناشتہ کلیجے پر دھرا تھا۔ دوسرے گُرو کے گھر جا رہی تھیں۔ طے کیا کہ خرید لیتے ہیں۔ بیگ میں رکھ لیں گے۔ کٹلٹ اور خلیب (براؤن بریڈ) کے ساتھ مزیدار ڈنر کا سامان ہو جائے گا۔

اب قیمت کا پوچھا۔انگلیوں سے ایک خوبصورت سمارٹ سی بابشکا نے چار کا اشارہ دیا۔سات آٹھ بندھی مُولیوں کا یہ گچھا ہم نے دو اور تین میں خریدنا چاہا پر وہ چار کے اشارے پر ڈٹی رہی۔

چلو خیر پانچ روبل کا سکہ دیا اور ایک روبل کی واپسی کیلئے ہاتھ کیا بڑھایا جیسے لگا کہ شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ بیٹھے ہیں۔خونخوار چیلوں کے نرغے میں آ گئے ہیں۔خوفناک شکاری کتوں کے گھیر میں پھنس گئے ہیں۔اُسکی ساتھی عورتوں نے فی الفور چار اور صفر کا اشارہ دیتے ہوئے غصیلی نگاہوں سے یوں گھورا جس میں پیغام تھا فوراً پیسے دو۔چالیس روبل۔

''چالیس روبل۔''

میری آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔اِن پانچ چھ مولیوں کے گُچھے کے چالیس روبل۔ ناممکن۔

میرا تو سانس لینا مشکل ہو گیا۔پل بھر کیلئے سوچا۔پھینک دیں انہیں اور بھاگ جائیں۔کیا کر لیں گی؟ پر سوچ آئی تھی کہ اگر تعاقب ہو گیا تو مارے جائیں گے جو مرضی الزام لگا دیں۔ہماری کس نے سُننی ہے؟

قہر درویش بر جان درویش۔چالیس روبل کے نوٹ دے کر جان کی خلاصی کروائی۔تھوڑا سا آگے چلنے پر سبزی اور پھل مارکیٹ نظر آئی تو اندر جا گھسے۔پختہ چبوتروں پر تازہ خوش رنگ پھلوں اور سبزی کے سلیقے سے لگے ڈھیروں پر قیمتوں کے کارڈ بھی دھرے تھے۔پوری منڈی میں عورتوں کی حکمرانی تھی۔

''او ہو تو یہی بابشکا مارکیٹ ہے۔ہر رُوسی کا مضافات میں چھوٹے یا بڑے گھر کا ہونا ضروری ہے جسے ڈاچا کہا جاتا ہے۔اس کے باغیچے میں سبزیاں پھلدار درخت لگائے جاتے ہیں۔اکثر بوڑھی عورتیں صبح سویرے اپنے ڈاچاؤں سے سلاد اور پھل لا کر فروخت

کرتی ہیں۔کہیں یہ دکانداری منظم صورت میں کہیں فٹ پاتھوں اور چوراہوں پر بکھری ہوئی۔

جنہوں نے ہمیں لوٹا وہ ذرا ماٹھی قسم کی بابشکا ہیں تھیں کہ جو تھوڑے سے مال متاع کے ساتھ سڑکوں پر ڈیرہ لگا لیتی ہیں اور جہاں داؤ چلا مہنگے داموں بیچ بچا کر اپنی دیہاڑی کے ساتھ گھروں کو لوٹ جاتی ہیں۔

مارکیٹ کی عورتیں تو سچی بات ہے بڑی مردمار قسم کی تھیں۔پکّے پیٹھے بنیوں کی طرح اپنے اپنے اڈوں پر ٹھسّے سے بیٹھی تھیں۔گاہکوں میں بھی قسم کھانے کو کوئی مرد نہ تھا۔مؤلیوں کا گچھا پانچ روبل کا تھا۔

دل نے رَج کے اُن کھوسٹ بڈھیوں کو لعن طعن کیا۔

اب دل کو اِس پینتیس روبل کے نقصان کی دل گرفتگی کے اثر سے نکالنے، اِس سارے قضیے پر دو حرف لعنت کے بھیجنے اور دوستووسکی سے ملاقات کی آتش عشق کو پھر سے تیلی دکھانے کی ضرورت تھی۔سو ہم نے پہلے لعنت بھیجی۔پھر تیلی جلائی اور آگ بھڑکا دی۔

تو اب نظروں کے سامنے یہیں کونے پر وہ چار منزلہ عمارت کھڑی ہے جس کے ایک اپارٹمنٹ میں اکتوبر 1878ء میں وہ میرا محبوب لکھاری اپنی فیملی کے ساتھ شفٹ ہوا اور یہی وہ گھر تھا جہاں 1846ء میں بھی اس نے کچھ وقت کرایہ دار کی حیثیت سے گزارا تھا۔گویا یہ گھر اس کی تخلیقی زندگی کی ابتداء اور انتہا تھا۔

مین دروازہ بیسمنٹ کی چند سیڑھیاں اتر کر تھا۔پہلے پوڈے پر قدم دھرنے سے قبل میرا جی چند لمحوں کے لئے چبوترے پر بیٹھ جانے کو چاہا۔

میں اور مہر النساء بیٹھ گئیں۔میں کچھ جذباتی ہو رہی تھی۔نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی میری پلکیں اظہار تشکر کے طور پر بھیگ سی گئی تھیں۔بھلا میری اتنی

اوقات کہاں تھی کہ میں تاریخ وثقافت سے لبالب بھرے اس شہر میں آنے اور اس عظیم مصنف کے در پر حاضری دینے کا سوچ سکتی۔ تیری عنایت ہی ہے نا۔

اور پھر میں بھاری بھر کم چوبی دروازے کو دھکا دے کر فیدور دوستووسکی Fydor Mikhail Dostovsky کے گھر میں داخل ہوتی ہوں۔ سو روبل کا ٹکٹ خرید کر چھوٹی سی راہداری میں کرسی میز بچھائے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کام کرتی خاتون کے گائیڈ کرنے پر سیڑھیاں چڑھتی ہوں اور جب ایک کے بعد ایک پوڈے پر قدم رکھتے ہوئے اوپر اٹھتی چلی جاتی ہوں تو لگتا ہے جیسے اس کے ناولوں کے کردار بھی میرے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔

بڑا کمرہ سامنے آتا ہے۔ یہ ہال کمرہ تھا جس میں رکھے ٹی وی کی سکرین پر اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ڈاکومینٹری چل رہی تھی۔ صوفے پر بیٹھا ہوا، صوفے پر ہی آرام کرتا، کھانے کی میز پر، چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے، دریائے نیوا کے کنارے سیر کے لئے جاتا، کینڈل پکڑے، برفباری کے دوران بیلچے سے برف ہٹاتے، پودوں کو پانی دیتے، کھانا کھاتے، چائے پیتے، لکھتے۔

اس کی زندگی کے بے شمار روپ ہم نے زہر مہرہ رنگے میٹ پر چوکڑی مار کر بیٹھتے ہوئے دیکھے۔ اس کمرے میں ہمارے علاوہ ساؤتھ کوریا کے دو لڑکے اور کرسی پر براجمان موٹی تازی روسی نگران خاتون تھی۔

فلم ختم ہونے کے بعد بھی میں ویسے ہی بیٹھی تھی۔ میری آنکھوں میں محبت اور عقیدت کے دیئے جلتے تھے۔ بند کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر دیکھتی اور یہ سوچتی ہوئی کہ اس گھر میں اس کا دوبارہ آنا کس قدر شدید جذباتی صدمے کا نتیجہ تھا۔

میرے سامنے اس کی بیوی ''اینا'' "Anna" کی وہ تحریر تھی جس میں ممتا کا وہ

دُکھ جھلکتا تھا کہ جب اُن کا سب سے چھوٹا بیٹا لائیوشا Lyosha فوت ہوا۔ اُسے مرگی کی بیماری اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ دونوں میاں بیوی کو وہ گھر جس کے چپّے چپّے پر ان کے لاڈلے بیٹے کی یادیں بکھری ہوئی تھیں کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

بیٹے کے اِس دُکھ نے انہیں ایک نئے تجربے سے روشناس کیا۔ جہاں اُنہوں نے گھر بدلا۔ وہیں وہ ولادی میر سلوویو Solovyov کے کہنے پر آپٹن مناسٹری زیارت کے لئے گئے جہاں ''ایلڈرز'' نے اُن کی پریشان اور غم زدہ حالت پر انہیں اپنی محبت اور دعاؤں سے نوازا۔ دوستووسکی کا یہ روحانی تجربہ اور قلبی طمانیت اُس کے ناول The Brothers Karamazov میں نمایاں ہوئی۔

چھ کمروں کے اپارٹمنٹ میں یہی وہ ہال تھا جس کا ذکر ایرینا نے بہت تفصیل سے کیا تھا۔

میں اُٹھی۔ سامنے دیوار پر پیٹرز برگ کی اٹھارویں صدی کی طبعی صورت کی بڑی سی پینٹنگ آویزاں تھی۔ جب گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ مردوں کے لمبے فراک نما پہناوے اور عورتوں کی زمین بوس ہوتی فراک نما میکسیاں، سروں پر سکارف نما ہڈ اور کوٹ نما گاؤن تھے۔

سینا سکوائیر میں خرید و فروخت کا ایک منظر زندہ تھا۔ ہال نایاب تصویروں، خوبصورت سکیچ پینٹنگز جن میں لندن کا سینٹ پال کتھیڈرل، کرسٹل پیلس، روم کا پیٹر سکوائیر اور میلان کے کتھیڈرل چرچ بہت نمایاں تھے۔

پھر یوں ہوا میں ٹھٹھک کر رُک گئی۔ ایک ایسی تصویر میرے سامنے تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

''یہ ہینز ہولبن دی ینگر'' Hans Holbein the younger کی

''دی ڈیتھ آف جیسز'' The death of jesus پر وہ شاہکار اور نایاب پینٹنگ تھی جس میں اس نے جیسز Jesus کے پورے وجود پر بکھری موت کی اذیت اور درد نا کیوں کو پینٹ کیا تھا۔ جیسز کے جسم کی اذیت کی عکاس ایک ایک ہڈی پسلی، زخمی ہاتھ پاؤں خوفناک کرب و درد سے کھنچا چہرہ، ہر احساس سے بے نیاز نیم کھلی آنکھیں، ناک ٹھوڑی اور منہ نیلاہٹوں میں ڈوبا ہوا۔

یہی وہ پینٹنگ تھی جسے دیکھنے کے لئے وہ خصوصی طور پر باسل (Basel) سوئیزرلینڈ گیا اور اسی کے بارے میں اس نے کہا تھا۔

''اس نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ پر ہولبین ایک حیرت انگیز آرٹسٹ اور شاعر ہے۔''

انٹرنس ہال میں اس کی چھتریاں، ہیٹ اور صندوق دیکھتے ہوئے نرسری میں داخلہ ہوا۔ جب یہ خاندان یہاں شفٹ ہوا، اس وقت لیوبو Liubov بیٹی نو سال اور بیٹا فیودور سات سال کا تھا۔

کمرہ ایک خوبصورت گڑیا، راکنگ ہارس، چند کرسیوں، بچوں کی رائٹنگ ٹیبل اور میز پر رکھے بیٹے کی طرف سے باپ کو لکھے ہوئے لفافے سے سجا ہوا تھا۔

دوستوسکی اپنے بچوں سے کس قدر پیار کرتا تھا اور ان کے بارے میں کتنا فکرمند رہتا تھا۔ اس کا اظہار اُس تحریر سے ہوتا ہے جو ''اینا'' نے اپنی یادداشتوں میں لکھی۔ اگر وہ اپنے علاج یا کاروباری معاملات کے سلسلے میں ملک سے باہر ہوتا تو ''اینا'' کو ملنے والے خطوط اس کی اور بچوں کی محبت سے بھرپور ہوتے۔ وہ اپنے بچوں کو کم عمری سے ہی رُوسی اور یورپی ادب پڑھانے کا متمنی تھا۔ گوگول، پُشکن، ڈکنز Dickens اور وکٹر ہیوگو سے تو بچے چھوٹی عمر میں ہی مانوس ہو گئے تھے۔ وہ اکثر بچوں کو پاس بٹھا کر بائبل کو اُونچے اُونچے

پڑھتا۔ ایک بار بیٹے کی شکایت پر اس نے مجھے لکھا۔

''اینا تم فیودور کے باہر جانے اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنے پر پریشان ہوتی ہو۔ دیکھو وہ بچپنے سے بلوغت میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کی شخصیت کے بارے میں بہت سی گہری باتیں میرے مشاہدے میں آئی ہیں۔ گھبراؤ نہیں شاید تمہیں اس کا احساس نہ ہو کہ میں یہاں اس کے متعلق کتنا فکر مند رہتا ہوں؟ ہمیں ایک طویل مدت تک اس کے ہاتھوں میں کتابیں دے کر اسے پڑھانا ہے۔''

اور یقیناً یہ اسی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس کی بیٹی لیوبو نے بہت سی کتابیں جن میں "Sick Girl" وومین لائر اور ''دوستووسکی اپنی بیٹی کی نظر میں'' بہت مشہور ہوئیں۔

فیودور گھوڑوں میں دلچسپی کے باعث ایک کامیاب ٹریز اور ماہر ہورس بریڈر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور تنقید نگار بھی تھا۔

نرسری سے ہی میں اینا کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔

اینا گریگوریونا Anna Grigorriena کے لئے میرے جذبات میں جو محبت، ستائش اور عقیدت کا دریا سا موجیں مارتا تھا۔ وہ جیسے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے قابو سا ہو گیا۔ کیا عورت تھی وفا کے شیرے میں لتھڑی ہوئی۔ کمرہ سادگی کا نمونہ تھا۔ کھڑکی کے پاس کونے میں رکھی رائٹنگ ٹیبل، ایک الماری، صوفہ نما کرسی میز۔ میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ سکھ کا لمبا سانس میرے اندر سے نکلا تھا۔ رُوس میں ہر تاریخی محل، میوزیم، پارکوں، شاہراہوں پر جابجا صوفے آرام دہ کرسیاں اور بینچ رکھے ہوتے ہیں۔ سیاح پیدل چلتے چلتے تھک جائیں۔ بیٹھیں، ستائیں، سوچیں، خلقت کو دیکھیں، جو مرضی کریں۔ استنبول میں کہیں بیٹھنا تو دُور کی بات کسی دیوار کے ساتھ لمحہ بھر کی ٹیکی بھی ڈیوٹی پر حاضر پولیس والوں کی نگاہ میں فی الفور آ جاتی ہے اور وہ آپ پر کسی شکاری کی طرح حملہ آور ہو جاتا ہے۔

یقیناً میں وہاں بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے اس عورت کی قُربت کی مہک محسوس کرنا چاہتی تھی جو صرف بیس سال کی عمر میں اپنے سے دوگنی عمر کے شخص کی زندگی میں ایک ایسے وقت داخل ہوئی جب وہ مصائب کے ہاتھوں حد درجہ پریشان تھا۔

دوستووسکی کے لئے 1854ء کا سال بہت پُر آشوب تھا۔ اس کی بیوی ماریا بھائی میخائل اور گہرا دوست نامور محقق اور شاعر اپولون Apollon جو اس کے ذاتی اخبار ''دی ٹائم'' اور ''دی آپوچ The Apoch'' میں اس کا معاون تھا یکے بعد دیگرے اسے تنہا چھوڑ گئے۔ انہی دنوں اس نے ایک جگہ لکھا۔

''میری زندگی ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔''

اپنے بھائی کے قرضے اُتارنے کے لئے وہ کمیشن پر لکھنے کے لئے مجبور ہوا۔ وقت کی ایسی ہی کڑی گھڑیوں میں اسے ایک ایسا ناول لکھنے کی پیشکش ہوئی جس کی مدت تکمیل صرف ایک ماہ تھی۔ معاہدے کی رُو سے ناکامی کی صورت میں وہ مستقبل میں اپنے کام کی رائلٹی سے محروم ہو جاتا۔

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

اُس نے اپنے دوست سے مشورہ کیا۔

''ایک سٹینوگرافر رکھو۔''

دوست نے حل بتایا۔

تب چار اکتوبر 1866ء کی ایک ابر آلود دوپہر کو کتابی چہرے پر سجے ستواں ناک اور خوبصورت آنکھوں والی دلکش لڑکی جس کے براؤن فراک کے گلے اور آستینوں پر لگی دیدہ زیب لیسیں لہراتی تھیں اس کے گھر میں سٹینوگرافر کی حیثیت سے داخل ہوئی اور ٹائپ رائٹر پر بیٹھی۔

''The Gambler'' چھبیس دنوں میں مکمل ہوگئی۔

کام کے اختتام پر اُسے احساس ہوا کہ وہ اس مہربان اور ہمدرد لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

''میں اُس سے کیسے بات کروں؟'' اُس کے باریک بھینچے ہوئے ہونٹوں سے تذبذب میں ڈوبا ہوا یہ سوال اُبھرا جو دل کی سرگوشی میں اپنے آپ سے تھا۔

وہ ردّ کیے جانے سے ڈرتا تھا۔ پھر اُس کا عندیہ لینے کے لئے اُس نے فرضی ناول کا پلاٹ گھڑا۔ ایک چوالیس (44) سالہ مرد جو مریض بھی ہے کا بیس (20) سال کی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہونا اور اینا سے یہ پوچھنا کہ ذرا سوچو تو کیا اُمنگوں سے بھری ہوئی اُس نوجوان لڑکی کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایسے مرد کی محبت کا جواب محبت سے دے؟

''کیوں نہیں۔'' اینا نے نگاہیں اُٹھائیں اور اُسے دیکھا۔ اُس کی کشادہ پیشانی پر تفکر بھری لکیریں تھیں۔

''محبت تو ان سب باتوں سے بالا ہوتی ہے۔''

بس تو جیسے سُوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے۔ وہ بھی کِھل اُٹھا اور اپنا آپ کھول کر سامنے رکھ دیا۔

''اینا میں جانتا ہوں میری عمر کا ایک مرد تم جیسی نوجوان لڑکی کے لئے قطعی موزوں نہیں پر پتہ نہیں میرا دل کیوں کہتا ہے کہ تم مجھ جیسے بکھرے ہوئے انسان کو سمیٹ لوگی۔ مجھے پیار دو گی کہ تمہیں پیار دینا آتا ہے۔''

اور اینا نے اُس کے چہرے کو دیکھا جو اپنی چمکتی بھوری آنکھوں میں آرزوؤں کا ایک جہاں سمیٹے اُسے دیکھتا تھا۔

تب اُس نے خود سے کہا کہ اگر وہ نفی میں جواب دیتی ہے تو یہ اُس کی خودداری

اُس کے پندار اور اُس کی عظمت کے لئے کتنا بڑا دھچکا ہوگا۔

"نہیں۔میں اِسے افسردہ اور ملول نہیں دیکھ سکتی۔یہ انسان مجھے بے حد عزیز ہو چکا ہے۔"

بیاہ کا دن پندرہ فروری طے ہوا۔اور رسم کی ادائیگی کے لئے ٹرنٹی کھیتڈرل کا نام تجویز کیا گیا۔

یہ سب تو ہوگیا۔پر کچھ گھمبیر سے مسائل ابھی بھی اُس کے سامنے سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ان میں سرفہرست اُس کا ویڈنگ ڈریس تھا۔

یہ کیسا ہو؟ اور اُس کی خریداری کہاں سے کی جائے؟ دوستووسکی کے لئے تو پیسے کی فراہمی بھی مسئلہ تھی۔

سمجھدار ذہین لڑکی نے اُن بہت سارے سوالوں کہ جنہوں نے اُسے پریشان کر رکھا تھا کا جواب دے کر اُس کے تفکرات کو تحلیل کر دیا۔

"بھئی آخر میں سلائی کڑھائی کی اتنی ماہر ہوں۔اپنا عروسی جوڑا خود ڈیزائن کروں گی اور اُسے سلمہ ستارے سے خود ہی سجا لوں گی۔تم کوئی چنتا مت کرو۔رہا کپڑا تو وہ میرے پاس ہے۔"

شادی ہوئی اور مصائب کا آغاز بھی ہوگیا۔ابھی استقبالیہ دعوت تھی۔جب نئی نویلی دُلہن کو دولہا سنبھالنا پڑا کہ دوستووسکی نے شمپین ضرورت سے زیادہ پی لی۔مرگی جس کا وہ پرانا مریض تھا کا دورہ پڑ گیا۔گھنٹوں وہ درد سے بے حال رہا اور دُلہن اُسے اپنی بانہوں میں اور کبھی اُس کا سر اپنی گود میں رکھے اُسے سنبھالتی رہی۔پہلے ہی دن سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹنے اور اُس کے دُکھ کو بانٹنے کا یہ کام اُسے ساری زندگی کرنا پڑا۔

صحت کا مسئلہ تو ایک طرف۔اس کے ساتھ معاشی مصائب بھی خون چوسنے والی

جونکوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔قرض خواہوں کی خوفناک دھمکیاں، اُن کا آئے دن تنگ کرنا، اُس کی جائیداد ہتھیانے کی سازشیں، بیس (20) سالہ لڑکی اُن سب کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے اپنی ذاتی چیزیں بیچیں اور کچھ سالوں کے لئے شوہر کو اُن کے چنگل سے نکال کر باہر لے گئی۔

بیرون ملک یہ زندگی مُشکلات اور مصائب سے بھری ہوئی تھی۔ پیسے کی تنگی، مشرقی یورپ میں خانہ بدوشوں جیسی زندگی، بسا اوقات کمرے کا کرایہ ادا نہ کر سکنے پر لینڈ لارڈ کی صلواتیں، دوستووسکی کی خراب صحت، اکثر اُس کا جوا کھیلنا اور سب کچھ ہار جانا۔

ان کے پہلے بچے صوفیہ کی سوئیزرلینڈ میں پیدائش اور تین ماہ بعد اس کا مر جانا۔ سب وہ کڑی آزمائشیں تھیں جنہیں اگر اینا نے حوصلے اور محبت کے بل پر سہا تو وہیں اس نے Idiot تخلیق کی۔

مہر النساء کوئی دوبار سارے کمروں کا چکر لگا آئی تھی۔ اور میں ابھی تک وہیں بیٹھی تھی جب اُس نے کہا۔

''سارا دن یہیں گُل کرنے کا ارادہ ہے کیا؟''

میں چُپ تھی۔ اس وقت میرے سارے جذبے اُس عورت کو خراج تحسین پیش کرتے تھے جس نے ساری زندگی کرائے کے گھروں میں گزاری۔ جس نے کسی مہربان اور مشفق ماں کی طرح اُس پر اپنی محبتوں کی بارش کی۔ جس نے اس کے مرنے کے بعد اپنے بقیہ سارے سال اس کے اُدھورے کاموں کو مکمل کرنے اور اپنی یادداشتوں کو مرتب کرنے میں گزار دیئے۔

میں خاموشی سے اُٹھ کر ملحقہ ڈائننگ روم میں آ گئی۔ ڈائننگ روم کی سجاوٹ پیٹرزبرگ کے روایتی گھروں جیسی تھی۔ دوستووسکی کے خاندان کا اندازِ زندگی سادگی سے

بھرپور تھا۔میز پر کپ سجے تھے۔کونے میں دھری چھوٹی میز پر پیتل کا وہ سماوار اور چائے دانیاں تھیں جس کا ذکر اینا کی یادداشتوں میں ملتا ہے۔الماری چینی کے نفیس برتنوں سے سجی تھی۔

خاندان رات کے کھانے پر ضرور اکٹھا ہوتا۔اکثر عزیز دوست اور رشتہ دار بھی شامل ہوتے۔اینا کو اپنے شوہر کا گھر واپسی پر رات کے کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ لانا بہت پسند تھا۔پر اُسے آئے دن دوستووسکی کا بچوں کو ٹریٹ دے دے کر خراب کرنے پر بھی گلہ رہتا تھا۔

چائے اور اُس کا اہتمام دوستووسکی کی زندگی میں بہت اہم تھا۔چمکتے پیتل کے سماوار کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے میرے سامنے اینا کی تحریر تھی۔

اچھی چائے اس کی کمزوری تھی۔سونے سے قبل میں سماوار کو ڈائننگ روم میں ضرور چیک کرتی۔چائے بنانے کا اہتمام خصوصی ہوتا۔سب سے پہلے وہ اُبلتے پانی سے کیتلی کو کھنگالتا،اس کا چمچ مخصوص تھا جسے بچے پاپا کا چمچ کہتے تھے۔

میری نظروں کے عین سامنے وہ چمچ اور چائے دانی تھی۔میں اسے ہاتھ لگا کر چھو نہیں سکتی تھی کہ آگے حد بندی تھی۔وہ تین چمچ چائے ڈالتا اور چائے دانی کا 1/3 حصہ پانی سے بھر کر اُسے نیپکن سے ڈھانپ دیتا۔پورے تین منٹ بعد وہ چائے دانی کے بقیہ کو کھولتے پانی سے بھرتا اور پھر اُسے کپڑے سے ڈھانپتا۔

اس کی بیٹی Liubov لیوبو کا کہنا تھا کہ پاپا ہمیشہ چائے کے رنگ کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔

"ہائے۔" میں نے سرشاری کے سرور آگیں احساس کے زیر خود سے کہا۔

چلو اور کچھ نہ سہی پر یہ قدر تو مشترک ٹھہری کہ زندگی میں اچھی چائے کے سوا کوئی

دوسرا شوق نہیں رہا۔چائے کا رنگ کمزوری اور چائے بنانے اور پینے کا اہتمام خوشی۔

گلاس ہاتھ میں تھامے وہ سٹڈی روم میں آتا اور لکھنے میں محو ہو جاتا۔چائے میں چینی کی ہمیشہ دو کیوبز ہی استعمال ہوتیں۔چائے سے اس کی یہ محبت اس کے ناولوں کے اکثر کرداروں میں جھلکتی۔"The Devils" کے کردار اسے زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔

اس گھر میں سب سے اہم تاریخ ساز جگہ اُس کا سٹڈی روم تھا۔نشست گاہ سے ملحقہ جو اس کی خوابگاہ بھی تھی۔نشست گاہ میں دیوار گیر وال کلاک کے پاس کھڑے ہو کر اور کُرسیوں پر بیٹھ کر تصویریں بنائیں۔خوش ہوئے کہ ہم ایک ایسے کمرے کی فضا میں سانس لے رہے ہیں، جہاں رُوس کے نامور شاعر، فلاسفر، محقق اور حقوق خواتین کی تحریک کے علمبردار آتے اور بیٹھا کرتے۔

سٹڈی روم میں کچھ وقت گزارنے کی ضرورت تھی اور وہ میں نے گزارا۔کمرے کی کھڑکیاں باہر Kuznechny Lane پر کھلتی تھی۔ولادی میر چرچ بھی سامنے تھا جہاں دوستوئسکی اپنے آخری ایام میں عبادت کے لئے جایا کرتا۔

یہی وہ کمرہ تھا اور میرے سامنے ہشت پہلو میز پر دھرا وہ کلاک تھا جس کی سوئیاں 28 جنوری 1881ء روز بدھ کی شام آٹھ بج کر 36 منٹ پر اس کمرے کے مکین کے ساتھ ہی ساکت ہو گئی تھیں۔

کمرہ سادگی کی تصویر تھا۔عین وسط میں رائٹنگ ٹیبل اور دیوار کے ساتھ صوفہ تھا۔ ملمع زدہ فریم میں اس کی تصویر کے عین نیچے لیٹر بکس تھا۔تین خانے والے ریک کے ہر حصے میں کتابیں تھیں۔الماری میں بھی کتابیں چنی ہوئی تھیں۔اس سادہ سے کمرے میں اسی میز پر اس نے اپنا آخری شاہکار ناول برادرز کرامازو The Brothers Karamazov تخلیق کیا۔

پیدائش تو اس کی ماسکو کی تھی۔ 11 نومبر 1821ء۔ بچپن ہی سے اُسے قلم اور کاغذ سے دلچسپی تھی۔ سوچنے کا شوق تھا۔ ماں کے مرنے پر اس کے باپ نے جبراً اُسے ملٹری انجینئرنگ اکیڈمی پیٹرزبرگ بھیج دیا اور گویا اس کی قسمت پیٹرزبرگ سے وابستہ ہوگئی۔ فوج میں اپنی نوکری سے بالآخر ایک دن اس نے یہ کہتے ہوئے استعفیٰ دے دیا کہ میں اپنا قیمتی وقت ضائع کررہا ہوں۔ رشتہ داروں کے اعتراضات پر اُس کا جواب تھا۔

''میں اپنے بارے میں پراُمید ہوں۔ انسان ایک سربستہ راز ہے اور اسے کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

آغاز کا کچھ وقت اُس نے فرانسیسی لکھاریوں کے ترجموں میں صرف کیا۔ یورپ اور رُوس کے رائٹرز کو پڑھا۔ پڑھنے سے اُس نے ہمیشہ ایک رُوحانی آسودگی محسوس کی۔ ابتداء میں اس کے محبوب ڈکنس، گوگول، ہشلراور پشکن تھے۔ پر جلد ہی اُسے احساس ہوگیا کہ حقیقت بذاتِ خود بڑی خوبصورت شاندار اور حیرت انگیز ہے۔ آغاز کا لکھا ہوا سارا کام اس نے ضائع کردیا اور نئے اعتماد اور چیلنج کے ساتھ "Poor Folk" میں ظاہر ہوا۔ اس کا ہیرو کوئی رومانوی کردار نہیں تھا بلکہ معاشرے کا ستم رسیدہ غیر اہم شخص ایک کلرک تھا۔ انسان کے اندر کی سچائی کی تلاش کو اس نے اپنی تحریر کا منتہا ٹھہرایا۔

اور یہ یہی وہ دن تھے جب اس کا تعارف میخائل پیٹراشوشکائے Mikhail Petrashevsky اور اُس کی بنائی ہوئی سوسائٹی سے ہوا۔ میخائل پیٹرزبرگ کا نوجوان ماہر قانون دان تھا۔ یہ تنظیم اس نے سوشلسٹ نظریات اور انقلاب فرانس سے متاثر ہوکر تشکیل دی تھی۔ اس کے ممبران کی زیادہ تعداد بھی اُن نوجوان لوگوں کی ہی تھی جو رُوس کے بہتر مستقبل کے لئے درد رکھنے، انقلاب فرانس اور سوشلسٹ نظریات سے محبت کرنے والے تھے۔ وہ نوجوانوں کو اپنے گھر بلاتا اور رُوسی معاشرے اور اس کے موجودہ حالات پر

لمبی چوڑی بحثیں کرواتا۔ انہی میں دوستوو سکی اور اس کے کچھ دوست بھی تھے۔ وہ اس کے ہفتہ وار اجلاسوں میں نہ صرف روسی بلکہ یورپی لکھاریوں کے ساتھ ساتھ چارلس فوریئر Fourier کی انسانیت کے سنہری دور کی تھیوری پر بھی اظہار خیال کرتے۔

1848ء میں یورپ میں انقلابی تحریک چلی تو نکولس اول نے خوف زدہ ہو کر رُوسی وزارتِ داخلہ کو ایسی تمام تحریکوں کے بارے میں رپورٹ کے لئے کہا جو رُوس میں سرگرمِ عمل تھیں۔ اور نتیجتاً دوستووسکی سمیت میٹنگ کے تمام افراد 23 اپریل 1849 کو گرفتار ہوئے۔ چند ماہ پیٹر اینڈ پال قلعے میں گزارنے اور تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ آنے پر منتقلی سائبیریا کے شہر اومسک Omsk کی سنٹرل جیل میں ہوئی۔

آٹھ ماہ بعد نکولس اول کا اُنہیں عبرت ناک سزا دینے کا فیصلہ منظرِ عام پر آ گیا۔

یہ بائیس (22) دسمبر 1849 کی سرد ترین صُبح تھی۔ سمینو وسکائے سکوائیر میں ایک بڑے شو کا اہتمام کیا گیا تھا جس کا سکرپٹ زار نے خود لکھا اور خود ترتیب دیا۔

سکوائیر کے ڈھلانی چھتوں والی عمارتیں برف باری سے سفید ہوئی پڑی تھیں۔ لوگوں کا ایک جمِ غفیر میدان میں موجود تھا۔ فوج اور پولیس کے دستے مستعد کھڑے تھے۔ پادری موجود اور جلّاد حاضر۔ نکولس اول بہ نفسِ نفیس یہاں تھا۔ اس شو کو ایک عبرت انگیز مثال بنانے کے لئے ریاستی فنڈز بھی بے دریغ استعمال ہوئے تھے۔

مجرموں کی لمبی قطار موت کے انتظار میں کھڑی تھی۔ کیسا دل دہلانے والا نظارہ تھا۔ پلیٹ فارم سے کوئی بیس قدم پرے تین پوسٹیں بنائی گئیں۔ پہلے تین مجرموں کو پوسٹ پر لا کر گاؤن پہنائے جاتے جن کے ساتھ لمبے لمبے ہُڈ ہوتے جو اُن کی آنکھوں کو ڈھانپ لیتے۔ پادری کراس کے ساتھ ہر ایک کے پاس جاتا۔ بازوؤں سے تھام کر پلیٹ فارم پر لائے جاتے۔ فردِ جرم اُونچی آواز میں پڑھی جاتی۔ ڈرم بجتا اور ”موت فائرنگ سکواڈ کے

ساتھ۔'' الفاظ کو بُجھتے اور زندگی پل جھپکتے میں موت کے ہاتھوں جھول جاتی۔

اگلے مُجرم نئی فردِ جرم کے ساتھ۔

دو موتوں کے درمیان بیس منٹ کا وقفہ اور تیاری کے بعد پانچ منٹ کا۔اُس پانچ منٹ کے جس تجربے سے دوستووسکی گزرا وہ اُس کی زندگی کا ناقابلِ فراموش تھا۔

سمینووسکائے سکوائیر کے چرچ کی سُنہری چھت اور گُنبد،لوگ،دُھوپ،چمکتا سورج، ہوائیں،آسمان اور میدان میں موت کے سجے بازار سے پھوٹتی کہیں آس اور امید کی کوئی موہوم سی کرن۔نکولس اول موت سے خاصا محظوظ ہو چکا تھا۔بقیہ کے لئے قید بامشقت کا حُکم دیتا اُٹھ گیا تھا۔

''ایڈیٹ Idiot میں پرنس ماشکن Myshkin کی زبان سے اُس نے اپنے اسی تجربے کو دہرایا ہے۔زندگی ہمارے اندر ہے۔باہر نہیں۔''

Crime and Punishment اس کے بعد لکھی گئی۔

اور اگلے چھ سال اُس نے سائبیریا کے قصبے میں ڈرل اور مارچنگ کرتے ہوئے گزارے،پر یہاں اسے لکھنے پڑھنے کی آزادی تھی۔اپنے ہر خط میں وہ اپنے بھائی کو اپنی پسندیدہ کتابوں اور رسالوں کے نام بھیجتا۔

اور سائبیریا میں اُس نے ''My Uncle's Dream'' اور The ''Village of Stepanchikovo'' لکھیں۔

نکولس اول کی موت نے مُلکی حالات کو تبدیل کر دیا۔اور وہ اپنے پیٹرزبرگ کے دوستوں کی کوششوں کے نتیجے میں رہا ہو گیا۔مئی 1854ء میں اُس نے ماریا سے شادی کی جو بیوہ تھی۔اپنے بھائی کو ماریا کے بارے میں بتاتے ہوئے اُس نے لکھا تھا۔

''وہ صرف اٹھائیس سال کی ہے۔چھ سال کا بیٹا بھی اُس کے پاس ہے۔وہ ایک

ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ہے۔ اور میں نے اُسے مستقبل میں تحفظ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

زندگی کے آخری برسوں میں اس کے پڑھنے والوں کے سامنے اس کا ایک اور رُخ آیا تھا۔ ہمارے اشفاق احمد صاحب کی طرح اُس کا رُجحان بھی رُوحانیت کی طرف ہو گیا تھا۔ لوگوں کے مسائل سُننا، اپنی مشکلات سے بھرے ہوئے ان کے خط پڑھنا، ممکنہ حد تک ان کی پریشانیوں کو دور کرنے اور ان میں آسانیاں بانٹنے کی کوشش کرنا اس کا مطمع نظر ہو گیا تھا۔

اور پھر وہ دن آیا جب اُس نے کہا۔

"آج مجھے مر جانا ہے۔"

طبیعت تو دو تین دنوں سے خراب تھی۔ پھیپھڑوں کی بیماری تو بہت پرانی تھی۔ اینا نے ڈاکٹروں کو بلایا۔ ولادی میر چرچ کے پادری بھی آئے۔

اٹھائیس 28 جنوری کی صبح اس نے کہا۔

"اینا آج مجھے دنیا سے چلے جانا ہے۔ تم انجیل لاؤ۔"

اور اینا اُسی انجیل کی کاپی لے کر آئی جو سائبیریا جاتے ہوئے راستے میں اُسے فونویزینا Fonvizina نے دی تھی جو 14 دسمبر کو زاروں کے خلاف انسانی حقوق کی ناکام بغاوت کے باغیوں میں سے ایک کی بیوی تھی۔ جو دسمبری کہلاتے تھے۔

اس نے ہمیشہ اُسے سنبھال کر رکھا اور جب بھی وہ پریشان یا کسی مشکل میں ہوا اس نے ہمیشہ اُسے کھولا اور پڑھا اور جب اینا پڑھتی تھی۔

"پس جیسس نے اُسے کہا۔ اب ایسا ہونے دو۔"

اور اُس نے آنکھیں کھول کر ایک لمحے کے لئے اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''اپنا تم سنتی ہو۔ Let it be so now''۔

''تم سمجھتی ہو میں مر رہا ہوں۔''

اُس نے آنکھیں موند لیں۔

گھڑی کی سوئیاں ساکت کر دی گئی تھیں۔ یہ اٹھائیس جنوری 1881ء تھا اور وقت آٹھ بج کر چھتیس منٹ کا تھا۔

اور ایک عظیم لکھنے والا دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ترکی کا ہیرا

مولانا جلال الدین رومی

- شمس تبریز جیسے مجذوب کا مولانا رومی کی زندگی میں داخل ہونا گویا مثنوی معنوی کو وجود میں لانے کا ایک خدائی اظہار تھا۔
- رقص درویشاں دراصل اپنے ہر عمل، اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی حرکت سے خدائی محبت اور اس تک پہنچنے کے روحانی سفر کی ایک دلآویز تمثیل ہے۔
- مولانا رومی نے تلاش کرنے والوں کو دل کی خوبصورتی، سچ کی خوبصورتی اور انسانیت کی خوبصورتی کی نوید دی۔

عشق تو یہی ہے کہ (دل) آسمان کی طرف پرواز کرے
نفس کے سینکڑوں پردوں کو چاک کرے
پہلے تو نفس سے رابطہ توڑنا ہے
آخر میں بغیر قدموں کے سفر کرنا ہے
اس دنیا کو ایک غیر مری شے جان
جو کچھ خود پر گزرے اُسے نہ دیکھ
نظر کی حدود سے کہیں آگے دیکھنا ہے
آغوش محبوب کی لہروں میں ڈوب جانا ہے

مولانا جلال الدین رومی

استنبول کے ایشیائی حصے کے سیر سپاٹے سے واپس ہوٹل آئے تو دیکھا بروشر ریسپشن پر پڑے تھے۔ آتے جاتے ہماری بھی عادت تھی لڑکے لڑکیوں سے گپ شپ کرنے معلومات لینے، کچھ اپنے تجربات سُنانے، کچھ اُن کے سُننے تھوڑا سا ہنسی مخول ہڑکوں اور استنبول کی تعریف میں تعریفی کلمات سے خوش کرنے کی کوششیں سب چل رہا تھا۔

بروشر ٹرکش میسٹک Mystic میوزک اور ڈانس کا تھا۔

''اچھا تو یہ وہ درویشوں کا رقص ہے۔ جسے سیما Sema کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہہ لیجیے کہ روحانیت کے سفر کا بیان ہے۔'' میں نے سیما کو دیکھا۔ میری آنکھوں نے اُسے یہ بھی کہا ہاں تو کیا کہتی ہو؟

''چلو تو پتہ جانا شاید مقدر میں نہیں پر اسے تو دیکھ لیں۔''

اُس کی آواز میں قونیہ نہ جاسکنے کا قلق بڑا نمایاں ہوا تھا۔

اتوار، بدھ اور جمعہ۔ وقت دیکھا۔ جگہ پر نظر ڈالی۔ سرکیــــــــجــــــــی ٹرین سٹیشن۔ یورپ کا پہلا ریلوے اسٹیشن۔

''لو بھئی یہ تو نرا گوانڈ میں ہے۔ بیچ بیچ میں سے بھی چل کر وہاں جاسکتے ہیں۔ میٹرو سے تو پانچ منٹ کا فاصلہ ہے اور وقت بھی موزوں ہے۔

بس تو جہاں ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر نکل پڑے۔ بوڑھی ٹانگوں پر ترس کھایا اور میٹرو پر جا چڑھیں۔

ایونٹ ہال Event Hall میں پروگرام تھا۔ ہال بھی بڑا شاہانہ انداز کا تھا۔ دیواریں دیکھوں، دروازوں کو سراہوں۔ گردن کو عقبی سمت نوے کے زاویے پر جُھکا کر چھتوں کی مدح سرائی کروں۔ کوئی تو بتائے آخر کروں تو کروں کیا۔ آنکھوں نے کہا۔

عجب بونگیاں ہانک رہی ہو۔ معماروں کو سراہو۔ بس تو ڈھیر سارا خراج عقیدت انہیں پیش کر دیا۔

کرسیوں پر سارے غیر ملکی تھے سوائے ہم دو دیسی عورتوں کے۔ سازندوں کی پوری ٹیم بمعہ گانے والوں کے جنہیں مترپ Mutrip کہتے ہیں ساتھ ساتھ نشستوں پر بیٹھی حکم کی منتظر تھی۔ کچھ آلات موسیقی تو ہماری شناخت میں آئے۔ جن میں بنسری، رباب، ستار، دف، ڈرم فلیوٹ وغیرہ تھے۔ کچھ سے ہماری شناسائی نہیں تھی۔ مترپ سے آگے درویشوں کی ٹولی بیٹھی تھی۔

اب تک کی زندگی میں درود شریف کوئی ہزار بار پڑھا ہوگا، ہزار بار سُنا ہوگا مگر اُس نے کبھی وہ تاثر نہیں چھوڑا تھا جو اُس لحن داؤدی رکھنے والے شخص نے اُس فضا میں پیدا کیا۔

''سبحان اللہ'' کہتے زبان خشک ہوئی جاتی تھی۔

دفعتاً ڈرم کی آواز نے ایک ڈرامائی تاثر کی فضا کو جنم دیا، جیسے خدا نے کہا ہو، پس ہو جا۔

پھر فلیوٹ پر ایک مختصر سی نغمہ سرائی ہوئی۔ یہ نغمہ جس نے رُوح کو دنیا کے حوالے کرنے کا پیغام دیا۔ جونہی یہ نغمہ سرائی ختم ہوئی درویشوں نے اپنے سروں کو جھکایا اور اپنے چوغوں کو اتارتے، اپنی ایڑیوں پر گھومتے، نیم وا آنکھوں سے دائرے میں داخل ہونا شروع کیا۔

پہلا درویش جونہی اندر آ کر رقص میں خود کو گم کر لیتا۔ دوسرا رقص کرتا کرتا داخل ہوتا، تیسرا، پھر چوتھا۔ یہ قدم انسانیت کی پیدائش کا عکاس تھا۔

درویشوں کے بازو اُن کے سینوں پر بندھے تھے۔ رقص میں یہ کُھلتے گئے۔ دائیں ہاتھ اوپر اٹھتے گئے اور بائیں نیچے ہوتے گئے۔ یقیناً یہ اس خیال کا غماز تھا کہ ہم خدا سے لیتے ہیں اور انسانوں کو دیتے ہیں۔ ہمارے پاس کچھ نہیں۔

اور جب ہم اُس نیم روشن ہلکی سی خنکی والے ماحول میں نوجوان لڑکوں کے سفید فراکوں کے پھولے ہوئے گھیروں کو سراہتے اور انہیں ایک وجد کی سی کیفیت میں والہانہ گھومتے دیکھتے اور نہ سمجھ آنے والی زبان میں ایک مترنم آواز کو سنتے اِس سحر میں گم تھے۔

تب کہیں یادوں کے دریچوں میں مولانا رومی کی جھلکیوں کی قندیلیں سی جل اٹھیں تھیں۔ علامہ اقبال کی عقیدتوں کے قصے تھے۔ ان کی شاعری میں اُن کا اثر، کہیں شمس تبریز کے حوالے، کہیں ان کی ذات سے وابستہ معجزے ذہنی دنیا میں سب قطار در قطار چلے آ رہے تھے۔

سلیمانیہ لائبریری استنبول کی نوجوان انچارج مسز ایمل چیتنی جو مولانا جلال الدین رومی کے بارے میں بات کرتے ہوئے بڑی واضح تھیں۔ اُس کا کہنا تھا ہم اُن سے

صرف اُن تراجم کے ذریعے متعارف ہوئے ہیں جو ہماری مختلف یونیورسٹیوں اور ذاتی طور پر لوگوں نے کیئے۔اُن کا کام فارسی میں ہے جو عثمانی دور میں حکومت اور اشرافیہ کی زبان تھی۔ترکی کے تمام دیہی علاقوں کے لوگوں کیلئے یہ زبان مشکل تھی اور وہ یہ زبان زیادہ بولتے بھی نہیں تھے۔

دراصل اُن کی بہت زیادہ ہردلعزیزی وسط ایشیا،ایران اور برصغیر کے علاقوں میں ہے۔گو اب وہ انگریزی،جرمن،فرانسیسی زبانوں میں تراجم کے ذریعے باہر کی دنیا میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔

تاہم ہم تو یہ دیکھ رہے تھے کہ ترکی کے شہروں میں مولانا رومی کا رقص درویشاں، خدائی محبت اور اُس تک پہنچنے کے روحانی سفر کی دلآویز تمثیل اور لحن داؤدی جیسے آہنگ میں اُن کا کلام پڑھا جانا وہ خوبصورت چیز ہے جسکے لیے دُنیا بھر کے سیاحوں کے پُرے باقاعدہ بُکنگ کے مرحلوں سے گزرتے ہیں اور جم کر شوق و ذوق سے سب کچھ دیکھتے ہیں۔بلا سے کچھ سمجھ آئے یا نہ۔

ہاں البتہ مختلف بین الاقوامی زبانوں میں چھپے بروشرز اپنا کردار عمدگی سے ادا کررہے ہیں۔

تو وہ شاعر کیسے بنے؟اُنکی شاعری اور اُن کے کلام میں سوز و درد، جلنے،تڑپنے اور آہ و فغاں کی کیفیات کیسے پیدا ہوئیں؟وہ تو اِس منزل کے مسافر ہی نہیں تھے۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ شمس تبریز جیسے مجذوب کا ان کی زندگی میں داخل ہونا گویا دیوانِ شمس تبریز اور مثنوی معنوی کو وجود میں لانے کا ایک خدائی اظہار تھا۔وہ نہ ہوتے تو مولانا سب کچھ ہوتے جیسا کہ وہ تھے۔قرآن کو سینے میں سمونے والے حافظ،فقہ و حدیث،شریعت،طریقت میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے۔اور استاد ایسے کہ چلتے چلتے بھی

حکمت ودانائی کے موتی راستوں میں بکھیرتے جائیں۔

پر شاعری کا تو کہیں دور دور تک سان وگمان تک نہ تھا۔

یقیناً وہ وقت کا منتخب لمحہ تھا جب قونیہ کی وہ عظیم صاحب علم ہستی جو اپنے آراستہ پیراستہ دیوان خانے میں شاہانہ کروفر کے انداز میں اپنے طالب علموں کے ساتھ درس و تدریس میں مگن رہتی تھی۔ لمحے بھر میں ہی اُس پھٹے پرانے ملبوس میں وہ کہ جس کے گرد آلود پاؤں ننگے تھے۔ بالوں کی اُلجھی ہوئی لٹوں میں مٹی تھی۔ چہرے پر دھول تھی کے دام گرفت میں آگئی۔

وہ مجذوب کیا تھا؟ کیسے اُس نے انہیں اُس مسند سے اٹھا کر ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جو راگ ورنگ، ناچ گانے اور موج و مستی والا تھا۔ قونیہ کے لوگ پہلے حیرت زدہ ہوئے پھر کراہت اور نفرت کا اظہار کرنے لگے۔ نہ صرف عام لوگ بلکہ عزیز رشتہ دار حتیٰ کہ سگی اولاد بھی۔

اب زندگی کا ایک بالکل نیا رُخ جو معاشرے کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ تھا سامنے آیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ یہی مقصودِ خداوندی تھا۔ یہ شمس تبریز ہی تھے کہ جس نے اپنے مرید کو اسرار و رموز اور طریقت کی تعلیم دی۔ روحانیت کی کٹھن گھیریوں میں ہر طرح اُلجھا کر اس کی منزلیں طے کروائیں۔ عشقِ حقیقی کے آداب سکھائے۔ قربِ الٰہی سے آشنا کیا۔ آزمائش کی کسوٹیوں پر پرکھا۔

ظاہر بین لوگ جن کی ذہنی سطح بہت آگے کی چیزیں نہیں دیکھتی ہیں۔ وہ اِس تعلق کو سفلی سطح پر دیکھنے لگے تھے۔ جب کہ یہ سب خدائی منشاء کے تابع ہو رہا تھا۔ اس کی وضاحت ان دو واقعات سے ہوتی ہے جو شمس تبریز اور مولانا رومی کو پیش آئے۔

پہلا واقعہ اُس برگزیدہ شخصیت شمس تبریزی کے حوالے سے ہے کہ جس نے خدا

کے حضور دُعا کی۔

"اے میرے پروردگار عالم تو نے مجھے مسند ولایت دی۔اب میں تیرے عطا کردہ علم کو کسی ایسے انسان کو دینا چاہتا ہوں جسے تو پسند کرتا ہے۔یہ دعا قبول ہوئی اور غیب سے آواز آئی کہ ایسا شخص تجھے تیرے شہر میں نہیں قونیہ میں ملے گا۔تجھے اس کے پاس جانا ہوگا۔"

اسی طرح مولانا روم کو بھی زمانوں پہلے ایک خواب میں ہی بشارت ہوئی کہ کوئی اُن سے کہتا ہے تم نے دینی اور دنیاوی علوم میں کمال حاصل کرلیا۔تمہاری زندگی قابل تعریف ہے مگر تم معرفت اور طریقت کی منزل سے نا آشنا ہو۔تمہاری روحانی تربیت کیلئے ایک ایسا آدمی تمہارے پاس آئے گا جو معرفت میں کمال کے درجے کو پہنچا ہوا ہے اور ہمارا بہت پسندیدہ ہے۔نام شمس تبریزی ہے۔

بیدار ہونے کے بعد انہیں اطمینان قلب ہوا۔کیونکہ وہ خود بھی اس راستے کے مسافر بننے کے متمنی تھے۔فریدالدین عطار سے سرسری سی ملاقات اور ان کے "اسرارنامہ" نے ان کے اندر اس جذبے کو ابھارا تھا مگر پھر درس و تدریس کی دنیا میں مصروفیت نے وہ خواب ایک طرح بھلا سا دیا تھا۔

اور جب وہ تاریخی ملاقات ہوئی۔اس وقت ایک دنیا دار صاحب علم انسان اپنے کرّوفر شاہانہ کے ساتھ ایک دلفریب ماحول میں درس و تدریس میں محو تھا۔

تبھی ایک مجذوب نے قریب آکر کتابوں کو چھوتے ہوئے کچھ پوچھا۔آپ کو ایک خستہ حال انسان کا یوں آنا پسند نہ آیا۔رکھائی سے۔چیز یست کہ تو نمی دانی (یہ وہ چیز ہے جسے تو نہیں جانتا) کہا اور اندر چلے گئے۔

مجذوب نے کتابیں حوض کے پانی میں پھینک دیں۔واپس آکر دیکھا اور

ناراضگی کا اظہار کیا۔فقیر نے ہاتھ سے کتابیں نکال کر منڈیر پر رکھ دیں۔خشک کتابیں دیکھ مولانا نے حیرت بھرے انداز میں استفسار کیا۔مجذوب نے وہی جواب دہرایا۔چیز یست کہ تو نمی دانی۔(یہ وہ چیز ہے جسے تو نہیں جانتا)

خواب یاد آیا۔پوچھا۔شمس تبریزی ہیں آپ؟

اثبات میں جواب دیا۔یہ وہ واقعہ تھا جس نے کایا کلپ کی۔یہ شمس تھے جنہوں نے انہیں سخن کا شہنشاہ بنادیا۔

یہ بھی خدائی منشا تھی کہ انہیں دنیاوی جاہ وحشمت سے نکال کر اُن میں عجز وفقر پیدا کیا جاتا اور ان کی ہستی کو اِس مرکب میں گوندھا جاتا۔

ایک دن وہ غائب ہو گئے۔یقیناً یہی وہ مقام تھا جو قدرت کے نزدیک منتہائے مقصود تھا۔اس جدائی نے اُن کے اندر وہ آگ بھڑکائی کہ فریاد و نالہ شعروں میں ڈھل گئی۔مولانا کی آفاقی شاعری کا آغاز ہو گیا تھا۔دل کا درد شعروں کی صورت ڈھلنے لگا۔ مولانا روم شاعر بن گئے۔انہوں نے خود اس کا اظہار کیا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم

تا غلامِ شمس وتبریزی نشد

مولوی یعنی میں ہرگز مولانا روم نہ بنتا اگر مجھے شمس تبریز کی غلامی نصیب نہ ہوتی۔

اب جب ہجر اور فراق کی آگ اندر جل اٹھی تھی۔ضبط کا یارا نہ رہا تو زبان اِس جلن کو اُگلنے لگی۔

میں نے سنا ہے آپ سفر کا ارادہ رکھتے ہیں

بخدا یہ سفر نہ کریں

آپ میرے ایک رقیب سے محبت کرنے والے ہیں

بخدا ایسا نہ کریں

آپ نے دنیا میں کبھی دُکھ، تکلیف اور رنجش نہیں دیکھی

پھر آپ دل کو تکلیف دینے والا عمل کیوں کرتے ہیں۔ایسا نہ کریں

ایسا نہ کریں

تصوف کی اِس بلندی نے اُن میں عجز اور خاکساری پیدا کی کہ جلال والی کیفیت ہی نہ رہی۔گالیوں، کوستوں، لعن طعن سب چیزیں ان کے لیے بے معنی ہو گئیں۔

دراصل مولانا رومی کے اندر شاعرانہ جذبات کی جو حس قدرت کی طرف سے عنایت تھی وہ مخفی تھی۔تبریز کی جدائی نے گویا ان سر بند جذبات کا منہ کھول دیا اور لاوہ یوں پھٹ کر باہر آنے لگا کہ صدیاں گزر جانے پر بھی اِن اشعار کا کوئی بدل نہیں۔

ذرا دیکھیے اِن اشعار کو۔

اے دوستو تم جاؤ اور میرے محبوب کو لے کر آؤ

میرے بہانے باز محبوب کو ساتھ لے کر آؤ

اگر وہ وعدہ کرے کہ وہ پھر کسی وقت آئے گا

تو اس کے حیلے بہانوں پر مت جانا

یہ اشعار جن کی پور پور میں عشق مجازی کی جولانیاں نظر آتی ہیں۔دراصل یہی عشق حقیقی کی حشر سامانیاں ہیں۔

شاعر کی ابتدائی شاعری کا آغاز جس دلآویز رنگ میں سامنے آیا۔اُس نے اُسے دنیا کی شاعری میں ایک منفرد انداز سے نمایاں کیا۔غزل کی بنیاد ہی عشق و محبت پر اٹھائی گئی ہے۔اور ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کا ہر شعر جذبوں کی گہرائی میں ڈوبا ہوا ہے۔اپنے اندر معنویت لیے، صوتی اعتبار سے نغمگی لیے، حُسن خیال کی فراوانی لیے اور فکر کی بلندی لیے اور

یہی وہ خوبیاں ہیں جنہوں نے تغزل کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔

ذرا دیکھیے

ماخستگانیم وتوی صدمرہم بیمارما

مابس خرابیم وتوی ھم از کرم معمارما

ترجمہ: ہم تھک کر خستہ حال ہوگئے ہیں تو ہی ہماری بیماری کا علاج یا مرہم ہے

ہم شکستہ حال ہیں اور تو ہی ہمارا بنانے والا ہے

مولانا روم کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے۔1207 میں بلخ جیسی سرزمین جو علم و دانش ،فکروفن اور تہذیب وتمدن کا مرکز تھی ۔جہاں خود ان کا خاندان ان کے والد بہاؤ الدین ولد علم و دانائی ، زہد و پارسائی میں یکتا پورے علاقے میں معزز ومحترم شمار ہوتے تھے ۔درس وتدریس جن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔وہ علم کا دریا تھے ۔اُن سے ملنے کیلئے دور دراز سے آنے والے بھانت بھانت کے لوگوں کا آنا اور اپنے مسائل پر راہنمائی چاہنا، چھٹپنے کے وہ تجربات تھے جنہوں نے لوگوں کے عمومی رویوں کی بہت سی تہیں اُن پر کھولی تھیں،کم سنی میں ہی سمرقند جیسے تاریخی شہر میں جانا اور وہاں قیام کرنا ،اس قیام میں اُنکا وقت صاحب علم لوگوں کے ساتھ ہی نہیں گزارا بلکہ خوازم شاہ کو شہر تاراج کرتے دیکھنا،لوگوں کا خوف وہراس،واپسی کا سفر اور پھر اپنے شہر کے دیگر گوں حالات ۔

ہجرت ایک بار پھر مقدر بنی تھی۔نیشاپور ،بغداد، شام اور مکہ جیسے شہروں کو قدموں نے چوما تھا۔اِن شہروں میں قیام کے ساتھ ساتھ یہاں کی مقتدر ہستیوں سے ملاقاتیں،باتیں بحث مباحثے یہ سب وہ تجربات تھے جن سے وہ اوائل عمری سے آشنا ہوئے ۔یہ اُن کی یادوں میں محفوظ ہوئے اور انہوں نے ان کی فکر کو جلا دی۔یہ چیزیں ان کی شاعری کا حصہ بنیں تو لازمی بات ہے اظہار میں طغیانی جیسی شدت کا آنا عین فطری تھا۔

قونیہ آنا بھی زندگی کا ایک سنگ میل تھا۔

سلجوقی سلطنت کا پایہ تخت قونیہ جس نے اُن کا والہانہ استقبال کیا۔ والد کی وفات کے بعد آپ نے علم بانٹنے کے عظیم سلسلے کو آگے بڑھایا۔ تاہم اُس وقت تک مولانا رومی شاہانہ انداز زندگی کے خوگر تھے۔ طلائی اور نقرئی تاروں سے کاڑھا گیا لباس پہنتے، بدن کو خوشبو میں بساتے، اونچی مسند پر بیٹھتے اور ماحول میں کرّوفر جیسے رچاؤ کا خصوصی اہتمام رکھتے۔ وہ وقت کے مفتی، شیخ اور مستند امام تھے۔

شمس تبریز جیسے مجذوب کا آپ کی زندگی میں آنا ایک ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ یقیناً خدا اُن سے وہ عظیم کام لینا چاہتا تھا جو مثنوی معنوی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اُن کی قربت نے اُن میں صوفیانہ فکر کا وہ رنگ بھرا کہ وہ سب کرّوفر رخصت ہوئے۔ شب و روز رقص میں رہنے لگے۔ دنیا حیران تھی اور نہیں جانتی تھی کہ انہوں نے باطنی دنیا کے اوج کمال کی معراج پالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دیوانِ شمس تبریز غزلوں کا وہ خوبصورت مرقع ہے جسے فارسی ادب کا نگینہ کہنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے جو کہا وہ گویا ان کے اندر کی کہیں گہرائیوں سے اٹھ کر سامنے آیا۔ اسمیں تصوف کا ایسا کونسا پہلو ہے جو زیر مشق نہیں آیا۔

حسن و عشق کے موضوع کو جیسی پذیرائی مولانا کے کلام نے دی ہے۔ اُس کی مثال ملنی بے حد مشکل ہے۔ ذرا دیکھیے تو۔

اے یار ما دلدار ما، اے عالم اسرار ما
اے یوسف دیدار ما اے رونق بازار ما

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

اے شاد کہ ما ہستم اندر غم تو جاناں

ہم محرم عشق تو ہم محرم تو جاناں

ترجمہ: میں اس بات پر خوش ہوں کہ تیرے غم میں مبتلا ہوں

میں تیرے عشق کا رازدار ہوں اور میں اے میرے محبوب تیرا بھی رازدار ہوں

محبت واخوت، امن و بھائی چارہ، صبر برداشت ان کی بنیادی تعلیمات تھیں۔ اُن کی ذات کے گرد سنہرا ہالہ بننے اور ان کی شاعری کو زمانوں کیلئے اثاثہ بنا دینے والی خوبیاں۔

وہ کہتے ہیں محبت کرنے والے بن جاؤ۔ اپنی ذات کی نفی کر دو۔ دل کو تخلیق کرنے والے سے بھر لو۔ بس یہی اُس تک پہنچنے کا مختصر ترین راستہ ہے۔ جس کسی نے اپنا دل خدا کو سونپ دیا۔ حقیقت میں اُس نے اپنی ذات کی مہار اُس کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔

ان کی باتوں میں، اُن کی مثنوی معنوی میں زندگی جو بذات خود ایک متنوع اور لامحدود موضوع ہے۔ اُس کا ہر پہلو نہ صرف بولا بلکہ نمایاں ہوا۔ عشق حقیقی کی رومانیت نے شعروں میں گھل کر ان کا حُسن بڑھایا۔

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

خدا سے اٹوٹ تعلق کی شیرینی نے لوگوں میں مٹھاس بانٹی۔ وہ خدا کی آواز بنے اور انہوں نے تلاش کرنے والوں کو خوبصورتی تحفے میں دی۔ دل کی خوبصورتی، سچ کی خوبصورتی، انسانیت کی خوبصورتی۔

لڑکے اپنے اپنے مدار کے اندر بے خودی کی کیفیت میں مبتلا گھوم رہے تھے، گھوم رہے تھے اور لگتا تھا جیسے وہ ایسے ہی گھومتے گھومتے فضا میں تحلیل ہو جائیں گے اور ساتھ میں ہم لوگ بھی۔

انہوں نے دل مسخر کرنے کو کہا۔ انسان تو ساری تخلیق میں سب سے حسین اور

قابلِ فخر ہے۔وہ کہتے ہیں ۔اگر تم سمندر سے ایک جگ پانی کا بھرتے ہو تو جگ کتنا پانی اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے ۔ایک دن کے گزارے کا۔تو جیسے سمندر جگ کی گنجائش کے مطابق اُسے بھرتا ہےتو ہماری رسائی بھی اوپر والے تک ہماری استعداد کے مطابق ہی ہے۔

رقص میں بے خودی اور مسلسل گھومنا بھی اُس حقیقت کی عکاسی ہے کہ جیسے چاند اور سیارے اپنے اپنے مدار پر گھومتے ہیں۔اسی طرح چکروں میں خدائی تعلق کے احساس کا عنصر کارفرما ہے۔

درویشوں کا نگاہیں اور گردن اٹھا کر اُوپر دیکھنا گویا خدا کی کائنات اور اُس کی دنیاؤں کی عظمتوں اور بڑائیوں کا اعتراف ہے۔رقص کے چکروں میں تیزی اور والہانہ پن اُس خدائے واحد کی لامتناہی کائنات کے درمیان اس کی ہستی میں خود کو گم کر دینے ،مٹا دینے اور محبت کی معراج کو چھو لینے کا تصور ہے۔

اور پھر قرآن کی ایک سورت کے ساتھ یہ رقص ختم ہو جاتا ہے۔

ہم ایک ماورائی دنیا میں سانس لے رہی تھیں۔وہ دنیا جو زاہدوں اور عابدوں کی ہے۔خدا کی پسندیدہ ہستیوں کی ہے جس تک ہم گنہگاروں کی رسائی نہیں۔مگر سچ تو یہ ہے کہ روحانی سفر میں ہستی کو فنا کر دینا ہی منتہائے مقصود ہے۔اُن سب کیلئے جو محبت کے راستے کے راہی بنتے ہیں اور جو اپنے اندر خدا کی تلاش کرتے ہیں۔خدا بھی انہیں نوازتا ہے۔آج دنیا کی کم و بیش ہر بڑی زبان میں مثنوی معنوی ترجمہ ہو چکی ہے۔اِس ترجمے نے لوگوں کو روشنی دکھائی ہے۔اس کے بندوں کو بھٹکنے سے بچایا ہے۔انہوں نے کہا ہے۔

ایں جلالت در دلالت صادق است
جملہ ادراکات پس او سابق است

ترجمہ: خدا کی بڑائی اور شان اس کے ہونے کی سچی گواہی ہے

ہر شعور اور ادراک پیچھے رہ جاتا ہے

ہم بے شک قونیہ نہ جا سکے مگر یہ وقت ہم نے مولانا رومی کے ساتھ گزارا۔

واپسی میں جب میٹرو پر چڑھے تو ایک دلچسپ سا منظر دیکھنے کو ملا۔ ایک نیا نویلا جوڑا اگلے سٹاپ سے سوار ہوا۔ کیسی معصوم سی دُلہن اور دولہا بھی ایسا ہی۔ ہمیں تو دیکھتے ہی کھد بُد ہونے لگی۔ جوڑا شادی کے روایتی لباس میں ملبوس تھا۔ کمپارٹمنٹ میں خاصا رش تھا۔ ہم کھڑے تھے۔ لڑکی کو میں نے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب کرلیا۔ انگریزی تو بڑی بات اُسے تو اپنی زبان میں بولنے کی ہچکچاہٹ تھی۔

اناطولیہ کے ایک دور افتادہ قصبے سے اپنے عزیزوں کے پاس آئی تھی۔ ساتھ جو رشتہ دار عورتیں تھیں وہ کسی سٹوڈیو سے ان کی تصویر اُتروا کر آئی تھیں۔ انگریزی میں وہ بھی کوری تھیں۔ تاہم اُن میں سے ایک تھوڑا سا دال دلیہ کر لیتی تھی۔

جھلمل جھلمل کرتا لباس جو ایک فراک اور تنگ پائینچوں کی پُھولی ہوئی بیگی نما شلوار کی صورت میں تھا۔ سر پر ریشمی سکارف سا۔ معلوم ہوا تھا کہ ترکی میں شادی کی تقریب پلاؤ زردے کی تقریب کہلاتی ہے۔ دیہی علاقوں کی شادی کا دیکھنے سے تعلق ہے۔ روایتی لباس، ناچ گانے اور روایتی کھانے جن میں ترکی پلاؤ کے ساتھ ساتھ زعفران ڈلا زردہ اس تقریب کی خاص ڈش ہے۔

ہمارا اسٹیشن آ گیا تھا۔ اُترنا پڑا۔ جی چاہتا تھا اُس من موہنی سی لڑکی کو تھوڑا اور دیکھتے۔

☆☆☆

یونس ایمرے Younus Emre

ترکوں کا محبوب و مقبول عوامی شاعر

- ہماری نئی نسلیں اُن عظیم شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہیں جنھیں ہم ترجمہ نہیں کر سکے۔
- یُونس ایمرے کے ہاں ذریعہ اظہار دیہی علاقوں میں بولی جانے والی ترکی زبان تھی۔ شاید اسی لیے وہ ایک عوامی شاعر ہیں۔
- یُونس ایمرے کا کہنا ہے دینِ حق سر میں ہے۔ سر پر رکھی جانے والی پگڑیوں اور دستاروں میں نہیں۔

تم اگر دوسروں کو نفرت سے دیکھو گے
بلندی سے نیچے گر جاؤ گے
وہ کہ جس کی لمبی سفید داڑھی ہے
اور جو خاصا معقول نظر آتا ہے
اگر اُس نے کسی ایک کی بھی دل شکنی کی
تو بلا سے وہ مکہ جائے کچھ فائدہ نہیں
اگر سب مذاہب مل کر ایک اکائی کا روپ دھار لیں
تو اس امتزاج سے عشقِ حقیقی پیدا ہو گا
خواہ کعبہ ہو، مسجد ہو یا کوئی اور عبادت گاہ
ہر ایک اپنی اپنی بیماریاں اٹھائے ہوئے ہے

یونس ایمرے

استنبول کی سلیمانیہ مسجد کا بھی دیکھنے سے تعلق تھا۔ پورے دو گھنٹے سیما اور میں نے وہاں گزارے۔ سلیمان ذی شان کا مقبرہ اس پر لٹکا سلطان کا کلاہِ خسروانہ جیسے کہتا تھا۔

"یوں ہی پہلو میں بیٹھے رہو۔ چھوڑو سب۔ جانے کی ضد نہ کرو۔"

سچی بات ہے وہ کوئی عثمانیوں کا ہیرو ہی نہ تھا وہ تو ہماری بھی جانِ جگر تھا۔ ترجمانی تو ہمارے جذبات کی بھی ہو رہی تھی کہ دل ابھی بھرا نہیں۔

تاہم جانا ضروری تھا۔ سلیمانیہ لائبریری راہ دیکھتی تھی کہ ہم کتابوں کی رسیا کب اُن سے ملنے آتی ہیں؟ اب حقیقت یہی تھی کہ سلیمانیہ لائبریری میں جانا اور ایک ہزار سال سے زیادہ کے ترک اسلامی کلچر کے فکری و علمی خزانوں کے مخطوطوں اور مسودات کو دیکھنا گویا اپنے آپ کو اس ماحول میں تھوڑی دیر کے لئے محسوس کرنا ایک طرح خدا کا ایک تحفہ تھا۔ اس کی نظرِ عنایت تھی۔

یہاں وہ دنیا تھی جس میں ڈیرے ڈالنا لکھنے والوں کا دل پسند مشغلہ ہوتا ہے۔یقیناً دل چاہتا تھا کہ بہت سا وقت یہاں گزارا جائے۔لائبریری کی انچارج مسز ایمل بہت سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔سکارف پہنے ہوئے تھیں۔باتیں ہونے لگیں تو احساس ہوا کہ سوچ اسلامی فکر میں گندھی ہوئی ہے۔

ان کے ہاں یہ تاسف بھرا اظہار تھا کہ ہماری نئی نسلیں اُن عظیم شاعروں،ادیبوں اور فنکاروں کے بارے نہیں جانتی ہیں جنہیں ہم ترجمہ نہیں کر سکے۔ہمارا شاندار ماضی تو جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے۔بازاروں محلوں عجائب گھروں کو چھوڑیے ہمارے تو قبرستان بھی ہمارا اثاثہ سنبھالے ہوئے ہیں مگر انہیں پڑھنے والے نہیں۔

وہ ہمارے جذبات کو زبان دے رہی تھیں۔میں ناامید نہیں۔ایک دن وہ وقت ضرور آئے گا جب ہمیں اپنی عثمانی ترکی زبان کی عظمت کا احساس ہوگا۔جب یہ ایک مضمون کے طور پر سکولوں،کالجوں اور یونیوسٹیوں میں پڑھائی جائے گی۔ہمارے امام حاطب (مذہبی) سکولوں میں تو یہ نصاب کا ایک حصہ ہے۔مگر اِسے اسکا جائز حق ملنا چاہیے۔

ہمارے امین کہنے میں ہماری دلی تمنائیں شامل تھیں۔

باتوں کی اس بحث میں اچانک یونس ایمرے Yunus Emre کا ذکر آگیا۔خاتون نے اناطولیہ کے اِس درویش،صوفی اور خداداد صلاحیتوں کے حامل شاعر کا ذکر جس محبت اور شوق سے کیا نے آتش شوق کو گویا بھڑکا سا دیا۔اس کا یہ کہنا کہ قدیم اور جدید ترکی شاعری اور ادب نے یونس ایمرے کے خیالات اور فکر سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ہمیں اپنی کم علمی کا اعتراف ہے یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ ترکی کے کلاسیکل ادب کا کوئی اور بھی بڑا نام ہے۔اس نے ان کی عوامی اور روحدت میں ڈوبی ہوئی شاعری کے چند ٹکڑے سُنائے اور ایک

دلچسپ واقعہ بھی۔

زمانہ تو مولانا جلال الدین رومی کا ہی تھا۔ کہتے بھی انہیں رومی ثانی ہے مگر دونوں عظیم شاعروں میں فرق ذریعہ اظہار کا تھا۔

مولانا رومی کا کلام اُس وقت ترکی کی شہری اشرافیہ کی مروجہ ادبی زبان فارسی میں ہونے کی وجہ سے خاص الخاص تھا جبکہ یونس ایمرے Emre کے ہاں ذریعہ اظہار اُن کی عام لوگوں کی یعنی دیہی علاقوں میں بولی جانے والی ترکی زبان میں ہی تھا۔ زبان سادہ، مفہوم واضح، تشبیہیں استعارے عام فہم اور محاورے، ضرب الامثال، لوک داستانیں، لوک گیت سبھوں کو عام فہم اور مقامی لوگوں کی زبان میں ڈھال دیا۔ اُن کے کلام میں غنائیت اور نغمگی کا بہاؤ اِس درجہ تھا کہ صوفیاء کی محفلوں میں جب گایا جاتا تھا تو لوگ وجد میں آجاتے تھے۔ یونس ایمرے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت شریں گفتار اور لحن داؤدی کا سا کمال رکھتے تھے۔ کبھی اگر دریا کے کنارے قرات سے قرآن پاک پڑھتے تو بہتا پانی رک جاتا تھا۔

بہت دلچسپ ایک واقعہ بھی سُن لیجیے۔ یونس اُمرے کے قونیہ سفر کے دوران کہیں مولانا رومی سے ملاقات ہوئی تو مولانا نے اُن سے اپنی مثنوی کے بارے میں دریافت کیا۔ یونس ایمرے نے کہا۔

''بہت خوبصورت، بہت عظیم، بہت اعلیٰ شاہکار۔ تاہم اگر مجھے اُسے لکھنا پڑتا تو میں ذرا مختلف طریقے سے لکھتا۔''

مولانا نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''بتاؤ ذرا کیسے؟''۔

یونس بولے۔

''میں آسمان سے زمین پر آیا۔گوشت پوست کالباس پہنا اور خود کو یونس ایمرے کا نام دیا۔''

یونس ایمرے کے کلام کی ایک اور اہم خصوصیت ہے کہ آپ اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو اسلام کی تعلیمات کے نزدیک بھی لائے۔

ترکی کے اس مقبول اور اہم ترین شاعر کا زمانہ لگ بھگ 1238 تا 1320 کا ہے۔مقام پیدائش صاری کوئے نامی گاؤں میں ہوئی۔انتقال کہیں اکہتر 71 سال کی عمر میں ہوا۔اور کہیں بیاسی 82 درج ہے۔مانیسا میں وفات ہوئی۔

اس زمانے میں قونیہ پر سلجوق ترکوں کی حکومت تھی۔یہ زمانہ ہنگاموں،شورشوں، بغاوتوں اور مایوسیوں سے بھرا ہوا تھا۔سلجوقوں پر زوال کا وقت تھا۔سلطنت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔حکومتی معاملات ہاتھوں سے نکل رہے تھے۔منگول ایک مہیب طوفان کی طرح اٹھے تھے۔مقامی امراء بغاوتوں پر مائل تھے۔یہی وہ وقت تھا جب اُس کی شاعری نے مایوس اور ناامید لوگوں کو امید کی ایک کرن دکھائی۔

مولانا رومی شمس تبریز سے متاثر تھے۔ایسے ہی یونس ایمرے نے چالیس سال اپنے استاد شیخ تاپدوک ایمرے Tapduk Emre کے قدموں میں گزار دیئے۔اُن کی زیر نگرانی انہوں نے قرآن وحدیث کے علم میں کمال حاصل کیا۔طریقت کے اسرار و رموز سے شناسا ہوئے۔اُن کے کلام میں رباعی، گیت، نظمیں،غزلیں بھی نظر آتی ہیں۔ذرا دیکھیے کلام کی سادگی اور حُسن۔

ایک لفظ ہی چہرے کو روشن بنا سکتا ہے
اُس شخص کیلئے جو لفظوں کی قدر و منزلت جانتا ہے
جان لو کہ لفظ کب بولنا ہے اور کب نہیں

ایک اکیلا لفظ دنیا کی دوزخ کو آٹھ بہشتوں میں بدل سکتا ہے

یونس ایمرے اِس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان کو زندگی محبت و پیار کے اصولوں پر گزارنی چاہیے۔ان کی فلاسفی میں اُونچ نیچ اور تفریق کہیں نہیں۔یہ صرف انسانوں کے اعمال ہیں جو انہیں اچھا یا بُرا بناتے ہیں۔زندگی عفوو درگزر، حلیمی اور رواداری جیسے جذبات کے تابع ہونی چاہیے۔ان کا عقیدہ تھا کہ خدا تک پہنچنے اور بخشش کا راستہ اکابرین دین، مختلف مذہبی اور مسلکی فرقوں کے اماموں کے ذریعے نہیں بلکہ یہ انسان دوستی اور احترام انسانیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ہر مذہب اور ہر مذہبی فرقے کا دوسرے کو جہنمی کہنا اور سمجھنا بہت غلط ہے۔دنیا کا ہر مذہب انسانیت کی بھلائی کا درس دیتا ہے۔ان مذاہب اور انسانوں کے احترام سے خدا سے سچا عشق پیدا ہوتا ہے۔ان کا یہ کہنا کتنا خوبصورت ہے۔دین حق سر میں ہے سر پر رکھی جانے والی پگڑیوں اور دستاروں میں نہیں۔

زندگی کے کڑے حقائق، روایتی اور کھوکھلی مذہب پرستی اور اُس کی آڑ میں انسانوں کا استحصال۔یونس نے اپنی ذات کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔خود اپنے آپ کو رگیدا۔اپنے آپ پر ملامتوں کے کوڑے برسائے۔

یونس ایمرے عشق حقیقی کے پرستار اور اسیر تھے۔شاعری میں صوفیانہ علم، عجزو انکسار اور انسانیت کا بے پناہ جذبہ نظر آتا ہے۔آپ ہی کی وجہ سے ترکی ادب صوفیانہ خیالات سے آشنا ہوا۔آپ کو ترکی صوفی ادب کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔حکومت نے اپنے اس شاعر کو اب قدرومنزلت کی اُس مسند پر بٹھا دیا ہے جس کا تقاضا ان کی شخصیت کرتی ہے۔ کچھ سالوں سے حکومت اور کچھ نجی ادارے باہمی تعاون سے ہر سال ان کے اعزاز میں کانفرنسیں اور خصوصی لیکچرز کا اہتمام کرتے ہیں۔ 1971-1972 کو یونیسکو نے بین الاقوامی سطح پر یونس ایمرے کا سال قرار دیا۔

میں یہاں رہنے کیلئے نہیں آیا — میں تو رخصت ہونے کیلئے آیا ہوں

میں مسائل پیدا کرنے کیلئے نہیں — میں صرف محبت کیلئے آیا ہوں

ان کی شاعری میں جابجا وحدت الوجود کا اظہار ملتا ہے۔

یہ خاک کا پیکر نہیں تھا

میرا نام تو یونس بھی نہیں تھا

میں وہ تھا اور وہ میں تھا

متاعِ عشق جب اُس نے عطا کی

تو اس لمحے میں اس کے پاس ہی تھا

یونس ایمرے ترکوں میں بہت ہر دل عزیز ہیں۔ دراصل اُن کی شاعری عام ترکوں کے قومی مزاج کی خوبصورت عکاس ہے۔ ترک قوم کی دلیری اور خودداری کا اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار خاص و عام کی زبانوں پر ہیں۔ بیرونی دنیا میں اب ان پہچان ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ دراصل اُن کا کلام اپنی مادری ترکی زبان میں ہے۔ ان کے ہم عصر مولانا رومی کا کلام فارسی میں ہونے کی وجہ سے وہ برصغیر او روسط ایشیا کی ریاستوں میں بہت زیادہ ہر دل عزیز ہیں۔ تاہم اب انگریزی ترجمے کی وجہ سے یونس ایمرے کے قارئین ان کی خداداد صلاحیتوں سے آگاہ ہو رہے ہیں۔ اُن کے فن اور کلام کی سادگی، برجستگی اور فلسفے سے واقف ہو رہے ہیں۔

ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی ضرورت ہے

ایک دوسرے کو جاننے کی ضرورت ہے

ایک دوسرے کو پہچاننے کی ضرورت ہے

ایک دوسرے کے لئے کیوں نہ آسانیاں پیدا کریں

آؤ ایک دوسرے سے محبت کریں

جان لو کہ یہ دنیا ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں ہے

☆☆☆

رابندر ناتھ ٹیگور

برصغیر کا نوبل ایوارڈ یافتہ عظیم شاعر

- ایک عظیم اور لافانی شخصیت جن کی شاعری، مصوری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، موسیقی، مقالہ نویسی غرض کہ کون سی صنف ایسی تھی جس کے وہ شہسوار نہ تھے۔
- اپنے والد کی طرح وہ بھی حافظ شیرازی اور مولانا رومی سے بہت متاثر تھے۔ ان کی شاعری میں اس کا اظہار ہوا۔
- ٹیگور کی ذات مذہب، فرقہ بندی، قوم و ملت کی بندشوں کو توڑتی اور انسان کو انسان سے جوڑنے کی ترغیب دیتی ہے۔

میرا دل جب سکڑ جائے

اور وہ سخت ہو جائے

تب لطف و عنایت کی گھٹا بن کر

تیز بارش کی صورت میرے اوپر برس جانا

جب زندگی سے خیر و برکت اٹھ جائے

تب گیتوں کی صورت بوچھاڑ بن کر آنا

جب میرا پریشان دل ایک کونے میں پڑا ہو

تب دروازہ توڑ کر اندر آنا

جب آرزوئیں دل و دماغ کو

لالچ و طمع کے حصار میں لے لیں

اے ہمیشہ بیدار رہنے والے

میرے پاس آنا

اپنی روشنیوں کی چمک دمک کے ساتھ

رابندرناتھ ٹیگور

رابندرناتھ ٹیگور سے میرا پہلا تعارف پانچ جولائی 1969 کی اُس شب ہوا جس کی دوپہر کو میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے گرلز ہوسٹل رقیہ ہال میں بورڈر ہوئی تھی۔ آڈیٹوریم میں اُن کا ڈرامہ چترا انگدا سٹیج ہو رہا تھا۔ رم جھم برستی بارش میں رقص اور ان کی شاعری کے سنگت ڈھاکہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس کی یہ پیش کش حد درجہ کمال کی تھی۔

بنگالی زبان سے اِسے میں نے اُردو میں جیسور کی اُردو اسپیکنگ فاخرہ آصف سے سمجھا جو پانچ چھ گھنٹوں میں میری دوست بن گئی تھی۔ فاخرہ انگریزی میں ایک ایم اے کرنے کے بعد اب بنگالی میں دوسرے ایم اے کے فائنل ایئر میں تھی۔

رات کو جب میں چوبی بیڈ پر لیٹی پہلی بار گھر سے دور قدرے افسردہ سی سونے کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کوشش میں تھی کہ محسوس ہوا جیسے وہ چھوٹا سا کمرہ ایک مدھم سے سرمدی نغمے کے سُر میں بہنے لگا ہے۔ پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ میری روم میٹ حبیب فاطمہ جو فینی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر چھوٹا سا ٹرانسسٹر رکھے اِس میں سے نکلتے بولوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر جانا کہ ٹیگور کی نظم ہے۔ گانے والی کلکتہ کی کوئی گلوکار ہے۔ تھوڑا سا مطلب بھی جانی تھی۔

آسمان کے سوا تمہیں اے سورج
اور کون اپنا سکتا ہے
میں تو تمہارا سپنا دیکھ سکتی ہوں
خدمت نہیں کر سکتی

فینی بیس اکیس سال کی انتہائی شوخ و شنگ، لا اُبالی سی، ہنسوڑ لڑکی جو فاشرہ کی طرح بنگالی ادب میں ایم کے فائنل میں تھی۔ دونوں کلاس فیلو تھیں۔

پھر گاہے گاہے کبھی زبانی کلامی، اکثر و بیشتر تو فینی کے ہونٹوں سے جو کمرے میں چلتے پھرتے

بانگلا مائی
بانگلا جل
امار سونار بنگلا
امی تمائی بھالو باشی

یعنی بنگال کی مٹی، بنگال کا پانی، میرا سنہرا بنگال، مجھے تجھ سے محبت ہے جیسے کئی اور گیت مثلاً

زندگی ہر لمحہ نئے رنگ میں آ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نت نئے روپ میں آ

خوشبو میں آ، نئے ڈھب میں آ

بادِ صبا کے فرصت آگیں جھونکوں میں آ

دل میں لطف و شادمانی کی صورت آ

آ میری نیم باز آنکھوں میں آ

ہر لمحہ نئے رنگ میں نئے ڈھنگ میں آ

اے مرکزِ لطف و عنایت

اے حُسنِ پُر نور

زندگی کے ہر عمل میں

زندگی کے ہر لمحہ جاں فزا میں آ

اپنے چہرے سے نقاب اٹھا

دید سے نواز دے

ہر لمحہ نئے رنگ میں آ

ہر پل نئے ڈھنگ میں آ

لبوں پر تھرکتے رہتے۔ مجھ جیسی مطلب جان جان کر محظوظ ہوتی رہتی۔ یوں کبھی ریڈیو، کبھی ٹی وی پر بھی ایسے نغمے جنہیں رابندر و سنگیت کہا جاتا ہے سننے کو ملتے۔ یہ دل کے ساتھ ساتھ روح کو بھی مسرور کر دیتے۔ تاہم اِس پیاس کو اُس واقعے نے بڑھا دیا تھا جو مجھے آواخر اکتوبر کے ایک دن پیش آیا۔

اس فسوں خیز سی ڈھلتی شام کے منظر نے میرے قدموں کو ساکت کر دیا تھا کہ میں اتفاقاً رقیہ ہال کی مرکزی عمارت کے عقبی لان میں بنے پوکھر (تالاب) کی جانب نکل آئی

تھی ۔تقریباً تین ماہ سے ابر آلود آسمان اور دھواں دھار قسم کی بارشوں کے نظاروں کی عادی آنکھوں کو اب ڈھاکہ کے آسمان کو نکھرا ہوا دیکھنا جہاں ایک جانب پھولتی شفق کے لال گلال رنگوں نے آگ سی سلگا دی تھی۔ ڈوبتی طلائی کرنوں کی دم توڑتی فضاؤں میں نہاتے، ہنستے، مسکراتے سانولے سلونے چہروں والی لڑکیاں جن کے گھٹاؤں جیسے کھلے آوارہ بال، کہیں اُن کے سینوں، کہیں بازوؤں اور کہیں پشت پر بکھرے جیسے شیش ناگوں کا سا تاثر اُبھارتے تھے۔آدھی آستینوں والے بلاؤز میں پھنسے بازو چپو ہاتھوں میں تھامے نوکا (کشتی) کھیتے تھے۔مترنم آوازیں گیتوں کی صورت فضاؤں میں سُروں کے راز کھولتی تھیں۔

مجھے محسوس ہوا تھا پوکھر (تالاب) کا ہلکورے لیتا پانی جیسے ہواؤں میں بکھرے مترنم گیت کی نغمگی پر دھیرے دھیرے رقص کرتا ہو۔کیسا موہ لینے والا منظر تھا جو بندے کو پل بھر میں گھسیٹ کر کسی طلسمی دنیا میں لے جاتا ہے۔بنگال کو حسن فطرت کی سرزمین، گیتوں کی دھرتی، سُروں کی دنیا ایسے تو نہیں کہا گیا۔یہی جادوئے بنگال ہے۔سارے میں بکھرے گیت کے بول، اس کی غنائیت، آواز کا لوچ اور رس جیسے میرے اندر اُتر کر میرے سریر کے ریشے ریشے میں گھل سا گیا۔

مجھے تو صرف اتنی سی مہربانی چاہیے
ایک لمحے کے لئے تیرے پاس بیٹھ جاؤں
اور کام جو مجھے کرنے ہیں
انہیں تو میں بعد میں بھی کر ہی لوں گا
تیری صورت سے اوجھل ہو کر
میرا دل سکون و آشتی سے دور ہو جاتا ہے

آج موسم گرما اپنی آہوں اور سرگوشیوں کے ساتھ

میرے دریچے کے پاس آ گیا ہے

اور شگفتہ کنج کے صحن میں شہد کی مکھیوں نے

اپنا ساز چھیڑ دیا ہے

وقت آ گیا ہے اب کہ

خاموش تیرے چہرے کے سامنے بیٹھ جاؤں

اور پرسکون سی فرصت میں

نغمہ حیات گاؤں

سلہٹ کی خوبصورت مستورہ جو ایک تلے والے میرے فلور پر روم نمبر 28 میں رہتی تھی۔ کشتی سے اُتر کر میرے پاس آئی۔ آتے جاتے میری اُس سے اچھی ہیلو ہائے رہتی تھی۔ بنگالی گیت میں میری اتنی دلچسپی اور انہماک دیکھ کر اس نے پہلے انگریزی میں مجھے اس کا ترجمہ بتایا۔ بتایا کیا اچھی طرح سمجھایا پھر لہکتے ہوئے ایک اور گیت گایا۔

جودی تو رڈاک شنے کیو نہ آشے

تو بے ایکلا چولو ایکلا چولو ایکلا چولو رے

اس کا بھی مطلب سمجھا اور ساتھ ہی میں نے جانا کہ یہ ٹیگور کے گیت ہیں۔ یوں اِن تین ماہ میں مجھے بنگالی کی کچھ شد بدھ ہو گئی تھی۔

اب میری شامیں اکثر و بیشتر پوکھر کنارے گزرنے لگیں۔ لڑکیوں سے ٹیگور اور نذرل اسلام کے گیتوں کو سنتے، بحث مباحثہ کرتے، اپنے کمرے میں ٹرانسسٹر پر کبھی کبھی مدھم آواز میں اِن گیتوں سے محظوظ ہوتے اور کامن روم میں ٹی وی پر پرکشش چہروں کو ان شاعروں کے منتخب کلام کو سناتے دیکھتے میں دونوں شاعروں میں فرق سمجھنے لگی تھی۔ ٹیگور کی

شاعری میں موسیقیت کے جو دریا سے رواں رہتے تھے وہ اپنے سامع کو اپنے ساتھ بہانے پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔

ٹیگور سے محبت، اس کے بارے میں جاننے اور اس کی شاعری سے واقف ہونے، اس کے ڈراموں اور رقص ڈراموں کا شوق بھی مجھے اُسی زمانے میں ہوا۔ فیفی اور فاخرہ دونوں نے اس شوق کو مہمیز دی۔

فاخرہ ڈراموں کی بھوکی تھی۔ جونہی بلبل اکیڈیمی یا کہیں اوپن میں ٹیگور کا کوئی ڈرامہ سٹیج ہونے کی بھنک اس کے کانوں میں پڑ جاتی۔ بس للّنی (بے چینی) لگ جاتی۔ اب کوئی ٹیسٹ ہے۔ کوئی اسائنمنٹ دینی ہے۔ وقت کم ہے۔ کوئی فکر فاقہ نہیں۔ لفنگی تھی پوری۔ میں اس سے بھی بڑی لفنگی کہ دیندار گھر سے تعلق کے باوجود لاہور سینما میں چلنے والی ہر فلم کے پہلے شو میں سہیلیوں کے ساتھ گھر میں میلاد کی کسی محفل، قرآن خوانی کی کسی تقریب میں شرکت کے بہانے ہلّہ بولنے میں مشہور۔ نتیجتاً کبھی بال نچتے اور کبھی برقعے کا اپر سر سے اتر کر گلے میں جھولتا۔

تو اب جب روک ٹوک ہی کوئی نہ تھی تو فاخرہ سے چار قدم آگے ہی چلنا تھا۔ تھی تو فیفی بھی ایسی ہی پر وہ پڑھائی پر سمجھوتا نہیں کرتی تھی۔

''چنڈالیکا'' وہ ڈرامہ تھا جس کا خمار پورے دو دن کسی تیز نشے کی صورت میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔

''میری بات سنو''

کیچڑ میں اُگے کنول کی کوئی ذات نہیں ہوتی ہے۔ بیک گراونڈ میں ٹیگور کی ایک نظم کے مصرعے سے شروع ہونے والے ڈرامے کا مرکزی خیال چھوت چھات کے نظریے کی مذمت اور پیار و محبت آفاقی جذبے جیسے پیغام کا علمبردار تھا۔ کمال کی پیشکش تھی۔

"کال مرگیا۔" ڈرامے کی پیشکش جگن ناتھ ہال کے سٹوڈنٹس کی طرف سے اوپن میں ہوئی تھی۔ ''ڈاک گھر'' اور ''مکتا دھارا'' دونوں بلبل اکیڈیمی میں دیکھے۔

رابندر وشنگیت کے مقابلے جب جب ہوتے۔ فیضی بتاتی اور چل پڑتی۔ بلبل اکیڈیمی میں ہی میری ملاقاتیں ڈاکٹر لطف النساء سے بھی ہوتیں جس نے ٹیگور پر ڈاکٹریٹ کی تھی اور جو یہاں ڈائریکٹر تھی۔

ٹیگور بارے میں نے کسی ایک سے کسی ایک وقت میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے مختلف ٹکڑوں میں سنا۔ میں انہیں لکھ لیتی تھی۔ یہی لکھے ہوئے کاغذ ڈھاکہ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد میرے ساتھ لاہور چلے آئے تھے۔ انہی سنبھالے ہوئے ٹکڑوں کو میں نے کھولا ہے۔

7 نومبر 1969ء

ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی کا دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا ہے۔ اوپر تلے کی کلاسوں نے تھکا دیا ہے۔ میں نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے چادر کو اپنے اوپر ڈال لیا اور آنکھیں ذرا آرام کی غرض سے موند لی ہیں۔

تبھی فیضی کی ''باپ رے باپ'' کی آواز نے چونکا دیا ہے۔ کیا ہوا؟ میری آنکھوں میں استفہامیہ سی علامات محسوس کرتے ہوئے وہ بولی۔

''رابندر ناتھ ٹیگور چودہ بہن بھائی تھے اور وہ ٹھاکر گھرانے کا آخری بچہ تھا۔''

فیضی اپنے سامنے ایک موٹا سا رسالہ کھولے پڑھتے ہوئے چونکی تھی۔

''تو اس میں کونسی تعجب کی بات ہے؟ میری نانی کے گیارہ بچے تھے۔ پرانے وقتوں میں بچوں کا یہی حساب کتاب ہوتا تھا۔ ہاں تم ٹیگور کو پڑھ رہی ہو۔''

''ہاں اسائنمنٹ بنانی ہے۔''

میری دلچسپی دیکھتے ہوئے اُس نے بلند آواز میں پڑھنا اور بتانا شروع کر دیا تھا۔

مہینہ مئی کا تھا۔تاریخ سات اور سال 1861ء ۔کلکتہ شدید گرمی اور حبس کی لپیٹ میں ہے۔شہر کے قدیمی علاقے جوڑا سانگو کی ایک معزز شخصیت ربندر ناتھ ٹھاکر کے گھر چودھواں بچہ پیدا ہوا ہے۔اس نے رسالے کا ایک صفحہ کھولتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے کیا۔

''یہ ہے وہ گھر۔''

ایک عظیم الشان دو منزلہ کلاسیکل طرز تعمیر کی حامل عمارت جس کی بلند وبالا کھڑکیوں کی لمبی آہنی سلاخوں اور چوبی پٹوں نے بڑی انفرادیت دے رکھی تھی۔درختوں اور پھول بوٹوں سے گھری کشادہ انگنائی والی ٹھاکر باڑی۔

ٹوپی اور کامدار پٹی والا گھیر دار مغلیہ سٹائل کا فراک پہنے چودہ سالہ خوبصورت لڑکا بھی فیلی نے دکھا دیا تھا۔

گھر میں رابندر ناتھ کی بجائے رابی کے نام سے پکارا جانے والا یہ بچہ اپنے بچپن ہی سے بڑا منفرد اور عجیب سی عادات کا حامل تھا۔بچے کی حرکات وسکنات بتاتی تھیں کہ ذہانت و فطانت میں غیر معمولی ہے۔روایتی تعلیم سے اُسے کوئی رغبت نہ تھی۔اسکول داخل کروایا تو بھاگ کر گھر آ گیا۔سرے سے ہی منکر ہو گیا کہ اسکول تو جانا ہی نہیں۔میرا تو وہاں دم گھٹتا ہے۔مجھے تو متلی ہوتی ہے۔اورینٹل سیمناری کے بعد بنگال اکیڈیمی اور پھر مشہور زمانہ سینٹ زیویرس میں بھیجا گیا مگر کسی جگہ بھی یہ فطین بچہ ٹکنے کا نام نہ لے رہا تھا۔

کیسا بچپن تھا جو کھلونوں سے محروم تھا۔کھلونوں سے کھیلنے ہی نہیں دیا گیا۔سارا دن گھر کی چاردیواری میں رہتا۔باہر نکلنے کا تب نہ رواج تھا اور نہ اجازت ملتی تھی۔ٹیگور گھرانے کے اصول بڑے پختہ اور سخت تھے۔

فیضی نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''کیا یہ غیر فطری نہیں کہ آپ ایک بچے سے اُس کا بچپن ہی چھین لیں؟''

میں چپ تھی۔ کہیں خیالوں میں ڈوبی کچھ سوچتی تھی۔

فیضی نے سلسلہ گفتگو پھر جوڑ دیا۔

اس بچے کے لئے باہر کی دنیا سے کٹاؤ کیسا محسوس ہوتا ہوگا۔ بڑے کمرے کی کھڑکی سے باہر راہگیروں کو چلتے پھرتے، پھیری والوں کو سودے کے لئے ہانکیں لگاتے دیکھتے اور سنتے، گاڑیوں کو دوڑتے بھاگتے، آسمان پر اڑتے پرندوں، بادلوں کو جھومتے، راتوں کو گھر کی چھت پر چاند اور ستاروں کو دیکھتے، اُن سے باتیں کرتے وہ سوچ وفکر کی کن دنیاؤں میں رہتا تھا۔ اُس کا احساس صرف اُسے تھا۔

یقیناً یہ اس کے احساسات ہی تھے کہ جب اس نے بچوں کے لئے نظمیں لکھیں تو بی چتر سادھ Bichitrsaadh جیسی نظم میں ایک چھوٹے سے طالب علم کے جذبات واحساسات میں اُن کا بچپن ہی تو بولا ہے کہ جہاں بچہ کہیں پھیری والا، کہیں باغ کا مالی اور کہیں پہرے دار بننے پر مچلتا ہے کہ یہ سب کردار اپنی مرضی کے مالک اور کسی کے پابند نہ تھے۔ ذرا ایک بند دیکھیے۔

ایک پھیری والا سر پر اپنی ٹوکری لئے
دیتا ہے صدائیں چوڑیاں لینا
اس کا دل جہاں جانا چاہے جاتا ہے وہ
لوٹ کر بھی اپنی مرضی سے گھر آتا ہے وہ
اس کو کیا پروا گھڑی میں دس بجیں یا ساڑھے دس
اس کو جلد و دیر سے کیا، اس کو کیسی پیش و پس

ایسے میں دل چاہتا ہے سلیٹ اپنی پھینک دوں
پھیری والا بن کے گلیوں میں یونہی پھرتا رہوں

ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ سچ تو تھا کہ ایک عظیم انسان کے بچپن کے اِس پہلو نے کتنا مسرور کیا تھا؟

فینی ابھی کچھ اور پڑھنے، مجھے سنانے اور نوٹنگ کرنے کے موڈ میں تھی۔ مگر باہر اُس کے نام کی پکار تھی۔ دربان لڑکا کہتا تھا۔ ''آپا آپ کا وزیٹر۔'' وہ ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتی اور چپل گھسیٹتی باہر نکل گئی۔

15 نومبر 1969ء

اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔ ڈپارٹمنٹ سے واپس آ کر ابھی میں نے کمرے میں آ کر کتابیں اپنی منی سی میز پر رکھی ہیں کہ جب فاخرہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کوریڈور میں ہی کھڑے کھڑے اُس نے دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر اندر جھانکتے ہوئے پوچھا ہے کہ مجھے کھانے کے لئے جانا ہے کیا؟

میں نے ساڑھی بدلنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے کو ترجیح دی ہے۔ لمبے کوریڈور میں چلتے ہوئے اس نے بتایا ہے کہ آج ٹیگور کے بچپن پر ایک کتاب اُسے لائبریری سے ملی ہے۔ اتنی دلچسپ ہے کہ لائبریری میں بیٹھے بیٹھے اُس نے آدھی سے زیادہ پڑھ بھی لی ہے اور اُسے ایشو کروا کے لے بھی آئی ہے۔ کمال کی کی لکھی گئی ہے۔

اور جب ہم دونوں بھات ماچھ کھاتی تھیں۔ وہ بولی تھی۔ گہرا دکھ اور تاسف اس کے لہجے میں گھل گھل کر باہر نکلتا تھا۔

''اب کون آج کی اندھا تعصب رکھنے والی اس بنگالی نسل کو سمجھائے کہ وہ جو بنگالی ادب کا باپ ہے۔ جس کی عالمانہ عظمت اور شاعری کا اعتراف ایک دنیا نے کیا۔ اُسے

عربی فارسی پر کتنی دسترس تھی اور وہ حافظ کا کتنا بڑا عاشق تھا؟ نہ صرف وہ بلکہ اُس کا باپ دیبـنـدر ناتھ بھی۔ اپنی مادری زبان بنگالی کے علاوہ، انگریزی، عربی، فارسی اور سنسکرت میں غیر معمولی دسترس رکھتے تھے۔ حافظ شیرازی کے دلدادہ تھے۔ ان کی بنگالی سوانح عمری میں حافظ کے اشعار جابجا موتیوں اور نگینوں کی طرح سجے نظر آتے تھے۔

یوں بھی ٹیگور خاندان لباس، آداب، نشست و برخواست اور بود و باش میں مسلمانوں، اُن کی تہذیب، اُن کے فنون لطیفہ سے متاثر اور بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خصوصی نسبت اور تعلق رکھتا تھا۔ اِس گھرانے کی ایسی ہی وجوہات پر ہندو ان کو ''دھریوں'' اور ہندو نما مسلمان سمجھتے اور کہتے تھے۔

باپ نے اپنا کمال فن بیٹے کو چھوٹی سی عمر میں ہی دینا اور اُسے مشرقی علوم میں طاق کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ بلوغت تک آتے آتے اُسے اِن زبانوں پر دسترس حاصل ہو چکی تھی۔

پتلی مسور کی دال والی پلیٹ اٹھا کر فاخرہ نے منہ سے لگائی۔ دو تین گھونٹ بھرے اور دکھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اب ذرا تقابلی جائزہ تو لو۔ تب اور اب کا۔ وہ اگر انقلاب کا زمانہ تھا تو یہ وقت کیا نئے رجحانات کو اپنے اندر سمیٹنے اور وسعتیں دینے کا نہیں؟ وہ کیا بنگالی نہیں تھے؟ تھے مگر صاحب ظرف تھے اور یہ بنگلہ کے پرستار جو اُردو کا گلا گھونٹ دینے کے متمنی ہیں۔ Son of the Soil کے نعرے لگانا ہی بس اُن کا منتہائے مقصود رہ گیا ہے۔

شام کو پوکھر کنارے میں اُس سے 'میرا بچپن' بارے سن رہی تھی۔

پہلی بھرپور یاد جس رُخ سے سامنے آتی ہے وہ شہر ہے کلکتہ شہر کا وہ قدیم ترین حصہ جہاں شاعر نے جنم لیا تھا۔ جہاں بس، موٹر گاڑی، ٹرام کچھ بھی نہ تھا۔ چھکڑے سارا دن

گرد و غبار اڑاتے اور گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر کوچوان تابڑ توڑ چابکوں سے حملے کرتے تھے۔ عورتوں کا اندر باہر جانا دم گھٹا دینے والی پالکیوں میں ہوتا۔ اگر کوئی عورت اچانک غیر مرد کے سامنے آجاتی تو اس کا گھونگھٹ فوراً آدھ گز نیچے آجاتا۔ گھر کی ڈیوڑھی پر بیٹھا دربان پورے گھر کی نگہبانی کرتا۔ ان کرداروں کی تفصیل بڑی دلچسپ تھی۔

شہر میں نہ گیس تھی نہ بجلی۔ جب مٹی کے تیل سے روشنی ہوئی تو پہلے پہل اسے بھی دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ تب گھروں میں نوکر ارنڈی کے تیل کے دیئے جلاتے۔ جس کمرے میں ہم پڑھتے وہاں دو بتیوں کا ایک دیا دیوٹ پر جلتا۔

ماسٹر صاحب ٹمٹماتی روشنی میں "پہلی کتاب" کھولنے کا کہتے۔ پہلے تو میری جمائیاں شروع ہوتیں۔ پھر آنکھیں کبھی بند ہوتیں اور کبھی کھلتیں۔ اب ماسٹر صاحب کی پھٹکار دبے دبے لفظوں میں اس کا فلاں شاگرد پڑھائی میں اتنا ہوشیار، فلاں لکھنے میں اتنا تیز، فلاں کو پتا پڑھنے میں سونا۔ ایسی سب باتیں میرے سر پر سے ہوا کے کسی جھونکے کی طرح گزر جاتیں۔

ان یادوں کا ایک اہم کردار برجو شیو ربڑے دلچسپ انداز میں سامنے آتا ہے۔ ٹیگور کی زبان میں کہ وہ ہم نظر انداز بچوں کی دیکھ بھال یعنی کھانے، نہلانے اور ہمارے دیگر جملہ امور کی نگرانی کے لئے لایا گیا تھا۔ طبیعت بڑی لالچی تھی۔ ہماری تھالیوں میں کبھی کھانا پروس کر نہ رکھتا۔ جب کھانے کو بیٹھتے تو ایک ایک پوری کو دور سے ہاتھ میں گھماتا ہوا دیتا اور پوچھتا کہ "اور چاہیے"۔

یہ "اور چاہیے" جس لب و لہجے میں کہتا اُس کا ایک ہی مطلب ہوتا۔ بس کرو اب۔

میں تو بالعموم یہی کہتا۔ "نہیں اور نہیں چاہیے۔"

میرے دودھ کے کٹورے پر بھی اس کی حریصانہ نظریں منڈلاتی ہی رہتیں۔

یہ کم کھانا بھی کچھ گھاٹے کا سودا نہ رہا کہ زیادہ کھانے والوں سے مقابلے میں توانائی میں کمزور نہ تھا۔

اِس طاقت اور توانائی کا ثبوت اِس بات سے ملتا تھا کہ جب جب سکول سے بھاگنے کو جی چاہتا۔منصوبہ بندی میں کوئی بھی بیماری مثلاً نزلہ، زکام، کھانسی، بخار وغیرہ بھی ماتھے پر آنکھیں رکھ لیتیں۔ٹھینگا دکھاتیں۔اب انہیں بلانے کے لئے میرے طرلے منتیں، کہیں پانی میں بھگویا ہوا جوتا پہن کر دن بھر گھومنا، کاتک کے مہینے میں کھلی چھت پر سونا۔مجال جوؤ سے مجھ پر ذرا سا بھی رحم آ جائے۔مجال تھا جو کچھ ہو جائے۔

کہانیوں کے سننے کا چسکہ اُن کی طلسماتی دنیا، میرے خواب اور سوچیں۔پہلی بیٹھک پر جوشیبور کے پاس جمتی۔رامائن سنتے سنتے کشوری چاٹو جے آ جاتا۔اُس سے رامائن کتھا نظم کی صورت سنی جاتی۔اس کے گلے سے سخن کی لڑیاں جھرنوں کی سی اٹھکیلیاں اور کلیلیں کرتی بہتیں۔یہ محفل جب ختم ہوتی میں ماں کے کمرے میں جاتا۔ماں اُس وقت اپنی کاکی کے ساتھ تاش کھیل رہی ہوتی۔میں جاتے ہی شور مچانا شروع کر دیتا۔وہ فوراً ہاتھ کے پتوں کو پھینکتے ہوئی کاکی سے مخاطب ہوتی۔

”لے جاؤ اور کہانی سناؤ اُسے۔جب تک یہ سو نہیں جائے گا اس کا یہ غل غپاڑہ ایسے ہی رہے گا۔“

ہم لوگ برآمدے میں رکھے لوٹے کے پانی سے پاؤں دھو کر ماں کو بستر پر گھسیٹ لاتے۔اب دیووں کی کہانی، راجکماری کی کہانی کب تک یہ چلتی۔میں تو کہیں خوابوں کی دنیا میں چلا جاتا۔کہانی ہمیشہ میری کمزوری رہی۔یہ دن میں بھی جب میں اکیلا ہوتا میرے ساتھ رہتی۔کبھی پالکی میں، کبھی پیدل، کبھی کسی اڑن کھٹولے پر، کبھی جنگلوں میں، کبھی

دریاؤں پر۔

سچ تو یہ ہے کہ بچپن کی یہ تصوراتی سیر بڑے ہو کر دنیا کے اسفار کی صورت میں مجھے نصیب ہوئی۔ گھر سے باہر نکلنے کی پابندی نے سفر کرنے کی خواہش کو ایڑ لگائی تھی۔ بچپن کی تنہائی، جوانی اور اُدھیڑ عمری میں دوستوں کی معیت میں نئی دنیائیں دیکھنے کی متمنی تھی جس کی تکمیل بہت احسن طریق سے ہوئی۔

کہانیوں کی دنیا میں کھونا مجھے بہت پسند تھا۔ شاید نہیں۔ یقیناً کہانیاں افسانے اور ناول اُسی شوق اور تجسس نے لکھوائے۔

فاخرہ سے میں نے کسی ناول بارے پوچھا جو اس نے پڑھا ہو۔

''ارے ایک دو۔ میں نے تو کئی پڑھے ہیں۔ افسانے بھی بہتیرے۔ ناولوں میں مجھے گھورے باپئرے، جوگا جوگ، دوئی بون اور گورا بہت پسند ہیں۔''

کہیں کابلی والے کا ذکر آیا تو مجھے یاد آیا۔ یہ افسانہ میں نے پڑھا ہے۔ ذہن میں جزئیات بھی اُبھر آئی تھیں۔

''چلو اب سنو۔'' فاخرہ نے پھر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

کہانی کے جلد ختم ہونے پر بھی مجھے ہمیشہ اعتراض ہوتا۔

خوف، ڈر، بے قراریاں، اضطراب سب میرے اندر سے نکل کر ہونٹوں پر سوال جواب کی صورت پھدکتے۔ جہاں کہیں کہانی میں سنسنی خیز موڑ آتا۔ اضطراب میں ڈوبا ہوا جملہ ''پھر کیا ہوا'' فوراً لبوں پر آجاتا۔

ایک اور کام کرنا بھی میرا معمول تھا۔ وہ تھا میری ماسٹری، میری اُستادی۔ گھر کے سارے ستون کھمبے میرے شاگرد ہوتے۔ میں انہیں خوب لتاڑتا، خوب مارتا۔ نہیں پڑھو گے تو نالائقو بڑے ہو کر قلی بنو گے۔ ان کی خوب خوب پٹائی کرتا۔

یہ منظر بھی میرے پسندیدہ منظروں میں سے ایک تھا کہ جب گھر میں مہمان آتے۔ گھر کی ڈیوڑھی کے سامنے بڑی بڑی بگھیاں آ کر رکتیں۔ مرکزی دروازے پر بڑے بھائیوں میں کوئی ایک مہمانوں کے استقبال کے لئے ضرور موجود ہوتا۔ نوکر اُن پر گلاب دانیوں سے گلاب پاشی کرتے۔ ہاتھوں میں پھولوں کے دستے تھماتے۔ بھائی بصد عزت واحترام انہیں اوپر لے جاتے۔ خاطر مدارات کا سلسلہ، روشنیوں سے چمکتے کمرے اور گھر سب مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

گھر دار عورتوں کے سجنے سنورنے کے طور طریقے سنتے ہوئے بھی لطف آیا تھا۔ میں تو ہنستی چلی جاتی تھی۔

گلی میں "بیل پھول، بیل پھول" کی صدا بھی بڑی اچھی لگتی تھی۔ موسم بہار کیا آتا یہ پھول ڈالیاں اور ان کی خوشبوئیں گلیوں کو مہکا دیتیں۔ گھر والیوں کے لانبے بالوں کے بھاری جوڑے اُن کے شانوں پر پڑے بیلے ہاروں سے سج جاتے۔ جدھر سے گزرتیں خوشبوئیں بکھیرتی چلی جاتیں۔ ہاتھ منہ دھونے سے پہلے آئینہ ہاتھ میں پکڑ کر بالوں کو سنوارا جاتا۔ گھر میں خود سے بنائی ڈوری سے جوڑا باندھا جاتا۔ نائن کا گھروں میں آنے کا بھی بڑا رواج تھا۔ یہ بھی ایک کردار تھا۔

میرے بچپن میں چاکلیٹ نہیں ہوتی تھی۔ گلابی ریوڑیاں، خوشبو میں بسے تل سے لدے پھندے چینی کے ڈھیلے سے کس مزے کے ہوتے۔ بھنے ہوئے مسالے والے ٹھونگے، وہ سستا سا تل والا گجا۔ برف کی ہانڈی میں لگی کلفیاں۔ جب پھیری والا آواز لگاتا۔ ہائے دل کیسا اُچھل پھل ہونے لگتا۔

''ہائے ٹیگور کے بچپن کی کچھ چیزیں تو معاشرت کے فرق کے باوجود ہمارے بچپن جیسی بھی تھیں۔'' بچوں جیسی خوشی نے میری آنکھوں سے جھانکتے ہوئے گویا کہا تھا۔

انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں کے ہندوستانی بنگال کی تہذیبی معاشرت کی جھلکیوں کی خوبصورت اور دل کش تصویر نے دل شاد کیا تھا۔شام بہت مزے کی گزری تھی۔کیسا مزے کا بچپن۔

27 نومبر 1969ء

آج رقیہ ہال میں پندرھواڑہ فیسٹ Feast ڈے تھا لڑکیوں نے سر شام ہی ڈائننگ روم کے گرد منڈلانا شروع کر دیا تھا۔کامن روم میں بھی رش تھا۔فاخرہ اور میں بھی انہی لڑکیوں میں شامل تھیں۔ٹی وی پر گیتوں کا پروگرام چل رہا تھا۔دفعتاً ایک دلکش چہرہ اپنی دلکش آواز کے ساتھ نمودار ہوا۔یہ فردوسی بیگم تھیں۔پوربو پاکستان یا پوربو بنگال کی مترنم آواز گیت جو وہ جو گا رہی تھی وہ ٹیگور گیت تھا۔

اُف ایسا لگا تھا جیسے سارا ماحول ایک انوکھے سے سُر میں بہنا شروع ہو گیا ہے۔

فاخرہ گیت کا ساتھ ساتھ ترجمہ کیے جاتی تھی۔

اے دنیا میں نے صبح کے ہنگاموں میں
تیرے باغ سے ایک پھول توڑا
اُسے اپنے سینے پر رکھا
اس کا کانٹا دل میں چُبھ گیا
شام ڈھلی تو میں نے دیکھا
پھول نڈھال تھا پر درد باقی تھا
ایک سے ایک بڑھ کر حسن اور خوشبو میں
تجھ میں پھول تو بہت پیدا ہوں گے
مگر میری گل چینی کا وقت

بہت عرصہ ہوا کہ ختم ہوا

اور اب جب کہ رات طاری ہے

گل نہیں پاس مگر درد باقی ہے

10 دسمبر 1969ء

ڈاکٹر لطف النساء سے تعارف فینی کے توسط سے ہوا تھا جس کے ساتھ میں اکثر ڈرامے دیکھنے اور گیت سننے آتی تھی۔ اس وقت دسمبر کی اُداس سی شام میں بلبل اکیڈیمی کے ٹھنڈے ٹھار بھائیں بھائیں کرتے کمرے ایک عجیب سا یاس فضا میں پھیلا رہے تھے۔ دو کمروں میں کچھ لوگ نظر آئے تھے۔ ایک میں شاید کوئی ڈرامہ ورامہ کا سلسلہ تھا اور دوسرے میں سُر سنگیت کی محفل برپا تھی۔

خوش قسمتی ہی تھی کہ لطف النساء سے ملاقات ہوگئی۔ دراصل یہاں آنے کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔ پرانے ڈھاکہ مشہور مصور زین العابدین سے ملنے اور اُن کا انٹرویو کرنے گئی تھی۔ واپسی پر یونہی ٹیگور کی ہڑک سی اٹھی تھی اور اکیڈیمی چلی آئی۔

لطف النساء محبت کے شیرے سے گوندھی ہوئی عورت ہے۔ اس کے اندر ویسٹ پاکستانیوں کے لئے کوئی بغض اور تعصب ہو تو ہو مگر اس کا چہرہ جیسے متانت کی لطافت اور پیار کی نرم پھوار میں بھیگا بھیگا سا رہتا ہے۔ جب جب بھی ملاقات ہو۔ گندوراج کے پھول کی طرح کھلی نظر آتی ہے۔

آج بھی پچھی ڈال کر ملی۔ زین العابدین سے ملنے کا سن کر خوش اور ٹیگور کے بارے میں میری کچھ جاننے کی خواہش پر مزید خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔

رمضان میں یونیورسٹی بند ہونے اور عید پر گھر جانے کا پوچھنے پر میں نے فوراً کہا تھا۔

"ارے نہیں آپا رمضان تو یہیں ہوسٹل میں اور عید اپنی کلاس فیلو کے ساتھ باریسال منانے جاؤں گی۔ اپنے دیس کے اِس حصے کے رمضان کی رونقیں اور عید کو بھی تو دیکھوں۔"

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

عظیم اور لافانی شخصیت جن کی شاعری، مصوری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، موسیقی، مقالہ نویسی غرض کہ کون سی صنف ایسی تھی جس کے وہ شہسوار نہ تھے۔ قلم اُن کا وہ ساتھی تھا جو کبھی اُن سے جدا نہ ہوا اور زندگی کا وہ کون سا ایسا گوشہ تھا جس پر انہوں نے نہ لکھا۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، تصوف، مذہب، سیاست، اخلاقیات، سماجیات جسے پکڑا اُس کے اندر یوں اُترے کہ وہ تحریر جاوداں ہوگئی۔ جو لفظ چنا اُسے معتبر کر دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھی شاعری کی بنیاد شدید قسم کی جذبات اور تیز حسیات کی مرہون منت ہوتی ہے۔ تخیل کی رنگینی اور زبان کی سادگی جس شاعر کے ہاں ملے گی وہی حقیقی اور سچا شاعر کہلائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں ٹیگور کے ہاں خیالات کی جدّت ہے۔ تیز رفتار تخیل کی جولانیاں ہیں۔ رنگینی ہے، جذبات کی شدت اور احساسات کا تیز بہاؤ ہے۔ خیالات میں گہرائی اور گنگناتی ہوئی سادہ زبان۔ اُس کے انہی اوصاف نے اُسے ایک عظیم شاعر بنا دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جب اُن کی شہرہ آفاق تصنیف گیتا نجلی کا انگریزی ترجمہ یورپ میں پڑھا گیا تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ دنیا نے اُسے کس کس انداز میں تعظیم دی۔ کسی نے کہا۔ ٹیگور شاعر کائنات ہے۔ کسی نے کہا وہ بیسویں صدی کے عظیم ترین شعرا کی قطار میں سب سے آگے ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کی شاعری نے نئی نئی جہتوں کو نئے نئے انداز میں دریافت کیا

اور وہ نئے ۔نئے راستوں پر چلی ۔شاعری کی مروجہ پرانی ریت و روایتیں اور تنگ راستے سبھوں سے اُس نے اپنا تعلق واسطہ نہ رکھا۔

الیگزینڈر سر گیووچ پشکن (Alexander Sergeyvich Pushkin) کی طرح جس نے روسی زبان کو اپنی بے مثال شاعری سے مالا مال کیا اور یورپی زبانوں کے مقابل لاکھڑا کیا۔ٹیگور نے بنگلہ زبان کو وہی درجہ دیا کہ وہ ٹیگور کی شاعری کی بدولت ارتقا کی بلندیوں کو چھونے لگی۔

انگریزی ترجمے نے اُس کی شہرت چاردانگ پہنچادی تھی۔

''آپا یہ ترجمہ کس نے کیا تھا؟''

''ارے کسی نے بھی نہیں اُس نے خود کیا تھا۔دیکھوتو ذرا پتہ نہیں وہ کیوں اس احساس کمتری میں مبتلا تھا کہ اُس کی انگریزی اچھی نہیں ۔ہمت ہی نہیں کرتا تھا۔ایک دن عجیب سی بات ہوئی۔''

یہ چیت کے دن تھے۔آموں کے بور کی خوشبوئیں نتھنوں میں گھس گھس کر عجیب سی کیف آور مستی کے جذبات پیدا کررہی تھیں۔عطر بیز ہوائیں دل کے تار جھنجھوڑے جارہی تھیں۔جب اُس نے گیتا نجلی (بہار کا گیت) اٹھائی۔کاپی قلم پکڑا اور ترجمہ کرنا شروع کردیا۔حتیٰ کہ کاپی ختم ہوگئی تو اُسے جیب میں ڈالی اور لندن جانے کے لئے بحری جہاز میں سوار ہوگیا۔جہاز میں دوسری کاپی بھی بھر گئی۔یہ اتفاق ہی تھا کہ جہاز میں روتھنائن بھی سوار تھا۔اس نے بصد اصرار ترجمہ دیکھنے کی خواہش کی۔پڑھ کرتو وہ حیران رہ گیا۔یہی کاپیاں اس نے ایٹس yeats کو بھجوادیں۔ وہ بھی پڑھ کر گنگ سا رہ گیا۔

ایٹس نے گیتا نجلی کا پیش لفظ لکھا اور کہیں چھوٹی موٹی اصلاح کی۔

''گیتا نجلی اُس کی لافانی شاہکار تخلیق ہے۔ایٹس yeats لکھتا ہے۔

یہ ترجمہ ہر جگہ میرے ساتھ جاتا۔ بسوں، ٹرینوں، ریسٹورنٹوں میں۔ میں ہر جگہ اس کا تذکرہ کرتا اور اسے سراہتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب راستہ چلنے والے انہیں راہ میں گنگنائیں گے۔ کشتیوں پر ملّاح انہیں گائیں گے۔ عاشق اپنے معشوق کے انتظار میں، محبوبہ اپنے چاہنے والے کے انتظار میں، خدا سے محبت کرنے والے اس کے حوالے دیں گے۔"

ڈبلیو بی ایٹس جیسے انگریزی ادب کے عظیم شاعر کا یہ خراج تحسین یقیناً ٹیگور کے لئے بڑا امتیاز تھا۔ ٹیگور کی یہی سحر کاری اُسے ممتاز کرتی ہے۔ مترنم سادہ سا اسلوب منفرد کرتا ہے۔ سندھا سنگیت (شام کا نغمہ) سے اس کی غنائی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ آغاز میں یاسیت کا بھی غلبہ رہا۔ مگر یہ وقت جلد گزر گیا۔ پربھات سنگیت (صبح کا نغمہ) میں ذرا دیکھیے صبح کی روپہلی دھوپ میں پھیلی ہوئی زندگی اس کیلئے کتنی دلآویز ہے۔

میں اور کچھ نہیں چاہتا
بس اگر چاہتا ہوں تو اتنا سا
اسے دیکھتا رہوں
مسحور رہوں
ہر چیز بھول جاؤں
گم سم رہوں

مانسی (محبوبہ) کو پڑھیں تو شاعر کی فنی پختگی کا نقطہ کمال محسوس ہوتا ہے۔

"اے بار پھرا دو مورے" (اس بار مجھے لوٹا دو) اُس کی ایسی ہی ایک شاہکار نظم ہے۔ اسی طرح "لامتناہی راستہ" کا گیت ہے۔ اُس بچی کا گیت جو چھوٹی سی ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

میں اکثر بار اُس لڑکی کو دیکھتا ہوں
محبت سے لبریز آنکھوں والی بچی
میری کشتی سفر پر چل پڑے گی
اور بچی بھی اپنا کام پورا کرے گی
وہ مجھے نہیں جانتی
میں اُسے نہیں جانتا
مگر میں سوچتا ہوں
وہ کسی نامعلوم بستی اور نامعلوم اجنبی گھر میں دُلہن بن کر جائے گی
پھر ماں بنے گی
اور پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا

ٹیگور کا یہ گیت کتنی سچائی اور کڑی حقیقت پر ہے۔

ٹیگور کے نزدیک انسان خدا کا پرتو ہے۔ ہر ایماندار، نیک اور جفاکش انسان میں خدا پنہاں ہوتا ہے۔ اسے خانقاہوں، مسجدوں اور مندروں میں محسوس کرنے والوں سے وہ کہتا ہے۔

یہ عبادت (بھجن) یہ تسبیح خوانی چھوڑ
دروازہ بند کر کے خانقاہ کے ویران اُجڑے گوشے میں تو کس کی پوجا کر رہا ہے؟
آنکھیں کھول اور دیکھ خدا تیرے سامنے ہے
وہ کہاں ہے؟
وہاں جہاں کسان سخت زمین میں ہل چلاتا ہے
جہاں سڑک کی تعمیر کرنے والے پتھر کوٹتے ہیں

دھوپ اور بارش میں کام کرتے ہیں

خدا تو اُن کے پاس ہے

گیتا نجلی کی زیادہ نظمیں اور گیت حمدیہ اور مناجاتی ہیں۔ اپنی عبادت اور سپردگی کے باعث اس کے ہاں یہ پختہ یقین ہے کہ موت کے بعد جو زندگی ملے گی وہ بہتر اور اچھی ہو گی۔ ذرا دیکھیے۔

اے موت تو میری آخری جائے پناہ ہے

آ مجھ سے سرگوشیاں کر

میں تیرا منتظر ہوں

زندگی کے ولولے اور خوشیاں صرف تیری وجہ سے ہیں

پھول گوندھے جا چکے ہیں

دُلہا کے لئے ہار تیار ہے

شادی کے بعد دلہن اپنے گھر جائے گی

رات کی تنہائی میں اپنے خدائے حقیقی سے ملے گی

ایک اور نظم دیکھیے۔

میرا وقت ختم ہوا

مجھے رخصت کرو

اپنا سر جھکاتا اور الوداع کہتا ہوں

میں اپنے دروازے کی کنجی تمہارے حوالے کرتا ہوں

اپنی تمام چیزوں سے دست بردار ہوتا ہوں

دن ڈھل چکا شمع حیات کی لو مدھم پڑی

بلاوا آ گیا اور میں سفر کے لئے تیار ہوں

حسن فطرت سے اُسے عشق ہے۔ یہ صبح شام موسموں کے بدلتے رنگوں کے ساتھ کیسے پرانے پیرہن اُتار کر نئے پہنتی ہے۔ اُن پرانے اور نئے رنگوں میں حُسن و رعنائیوں کے جلوے اس کے دل کی دنیا تہہ و بالا کرتے ہیں۔ اس کا اظہار بھی کیا خوب ہے۔

آسمان بادلوں سے بھرا ہوا ہے

بارش بند نہیں ہوتی

میں نہیں جانتا

میرے اندر کون سی بیتابی ہے

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

طلوع آفتاب زمین کو

زریں تاج پہنانے آیا

اُن کی ازدواجی زندگی بارے کچھ سننے اور کچھ جاننے کی بھی بڑی خواہش تھی۔ یہ تمنا فیمی نے ہی پوری کی کہ اس کا تھیسس تھا ہی ٹیگور پر۔ یوں بھی وہ بہت پڑھا کو لڑکی تھی۔ جھٹ سے اعتراض پھٹ سے نقطہ چینی کر دینا بھی اُس کے لئے کھیل تماشے جیسی ہی بات تھی۔ باتیں کرتے کرتے چٹکلے چھوڑنا بھی اُسے بہت پسند تھا۔ وہ بنگالی و غیر بنگالی تعصب سے بالا بڑی خاص قسم کی چیز تھی۔ فیمی جیسی لڑکیاں ہزار لڑکیوں کے ہوسٹل میں بس دو تین ہی ہوں گی شاید۔

10 فروری 1970ء

جنوری بڑا مصروف مہینہ تھا۔ عید کے بعد سکینڈ ٹرم شروع ہونے والی تھی۔ نپٹتے نپٹاتے فروری آ گیا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ہم کمرے میں اکٹھی تھیں۔ اس نے ٹرانسسٹر کی

نوب بند کرتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ آج نو بجے نہ سو جائیں تو باتیں ہو سکتی ہیں۔"

"فینی، ٹیگور پر بات کرنے کے لئے نیند جیسی چیز کی قربانی کی کیا حیثیت ہے؟"

چلیئے اس عظیم شخصیت کی ازدواجی زندگی کا بھی رخ دیکھ لیں۔ ڈلہن کا نام بھبوتا رینی۔ تیرہ سالہ کم پڑھی لکھی عام سی لڑکی تھی یہ۔ بینی مادھوپ رائے چودھری کی بیٹی تھی۔ ڈلہا اس وقت کوئی تئیس برس کا تھا۔ عمر میں دس سال چھوٹی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ دنیا کے جینئس انسان کی بیوی بن رہی ہے۔ لیکن وقت نے بتایا کہ اس نے خود کو اِس اعزاز کا اہل ثابت کیا۔

ٹیگور نے جوانی کا کچھ حصہ شیلائی داہ اور شہزادپور اپنی زمینداری پر اور کچھ وقت بیرون ملک کے دوروں اور سیر سپاٹوں میں گزارا۔ یہ وہ وقت تھا جب اپنی بیوی کے ساتھ اُن کی ملاقاتیں کم رہیں۔ مگر دونوں کے درمیان خطوط کا تبادلہ ضرور رہا۔

فیبی کی جملہ بازی اس موقع پر بھی ہوئی۔ تاہم یہ ہندوستانی معاشرت کا ایک حصہ تھا اور زمانہ کافی آگے بڑھ جانے کے باوجود آج بھی ایسی ہی صورت حال کسی حد تک ہے۔ میرے ردِ عمل اور جواب نے اُس نٹ کھٹ کو چپ کروا دیا تھا۔

شوہر نے جو نام دیا وہ مرینالنی دیوی تھا۔ اِس نام کا بھرم رکھنے کیلئے اُس کم عمر لڑکی نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی ماں بننے کے باوجود دوسری زبانیں سیکھیں۔ ادب، موسیقی اور آرٹ کی باریکیاں جانیں۔ اپنے شوہر کے مقام اور مرتبے سے آگاہ ہوئی۔

رابندر ناتھ کو اِس منزل تک پہنچانے میں مرینا کے ہاتھ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کبھی شوہر کے کاموں میں مداخلت نہیں کی۔ کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں۔ شانتی نکیتن میں جب کھلے آسمان تلے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو کہیں سے مدد نہ ملی۔ ایسے میں وفا شعار بیوی نے سب زیورات قدموں میں ڈھیر کر دیئے۔ یہ اور بات ہے کہ ٹیگور نے اسے پسند نہ کیا۔ لیکن جب وشو بھارتی (یونیورسٹی) قائم کرنے کا ارادہ کیا تو بیوی کے پیہم اصرار پر یہ مدد قبول لینے پر راضی ہو گئے۔

تاہم یہ بات فینی کے لئے خاموشی سے بتانے پر مرکوز نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کے تبصرے نما اعتراض بھی تھے۔

آخر مرینالنی کا ذکر ٹیگور کی کسی تحریر میں کیوں نہیں ملتا؟ کبھی کوئی چیز اُس کے نام سے منسوب کیوں نہ ہوئی؟ کیوں آخر؟ اُس نے آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں۔ اور تیکھے لہجے میں بولی۔

''ایسی وفا شعار بیوی۔ ٹیگور جب کبھی باہر سے آتے تو وہ اُن کے لئے بہت اہتمام سے کھانا بنواتی۔ ٹیگور بہت سادہ سے کھانے کو ترجیح دیتے۔ مسالوں اور تیل کی زیادتی پسند نہ کرتے۔ مرینا ان سب باتوں کا دھیان کرتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ بہت چاؤ سے دستر خوان سجاتی۔ انہیں کھانے کے لئے آنے کا کہتی۔ اب انتظار میں دیدہ دل بچھائے بیٹھی ہے اور ٹیگور پر تخلیقی آمد کا نزول ہو گیا اور وہ آنے کی بجائے مہا کوی تخلیقی عمل میں مصروف ہو گئے۔ کیسی صابر شاکر عورت تھی کہ پیشانی پر خفیف سی سلوٹ لائے بغیر اِدھر اُدھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ ان کے کاموں میں مداخلت کرنا اس کے لئے گناہ کے برابر تھا۔ کھانا تب پروستی جب وہ اس کا اذن دیتے۔ رات اکثر دیر تک کام میں مصروف رہتے۔ صبح دم بھی جلد اٹھتے۔ غسل، عبادت، ناشتہ، لکھنے کی میز، اُس کی صفائی ستھرائی۔ سردیوں گرمیوں کے کپڑے سب کا دھیان رکھنا نوکر کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ذمہ داری بھی

سمجھتی۔

ٹیگور فطرتاً لاپرواہ تھے۔ تخلیقی عمل سے فارغ ہوتے تو سارے سریر میں کاہلی اور سستی در آتی۔ بھول جاتے کہ جو کچھ تخلیق ہوا اور لکھا گیا ہے اُسے سنبھالنا بھی ہے۔ تاہم یہ مرینا دیوی تھی کہ جو اُن کی چھوٹی سے چھوٹی تحریر کو طریقے سلیقے سے سنبھالتی۔

ٹیگور نے مرینا کو جتنے خط لکھے۔ اس نے اُن کی جی جان سے حفاظت کی۔ ایک خوبصورت منقش صندوقچے میں محفوظ کرتی۔ شوہر کو اُسکے اپنے لکھے ہوئے خطوط کا شمار اب ادبی نقطہ نظر سے ہو رہا ہے۔ ہاں البتہ کہا جاتا ہے کہ رابندر کی مشہور کہانی استری پتر میں مرینا کی ذات کے کچھ عکس ملتے ہیں۔ آخری عمر میں زبان بند ہوگئی تو رابندر نے لکھا۔

اتنی فرصت نہ ملی

یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ تم

دل کی آخری باتیں کہہ جاتیں

خاموش رخصت

ہجر کا درد لئے

میں چاروں اور فضول تسکین کی تلاش کرتا رہا

ایک جگہ اور دیکھیے وہ مرینا کے ہجر میں کیا کہتے ہیں؟

تم اپنا وہ اچھا لگنا میری آنکھوں میں نقش کر کے

میری آنکھوں میں اپنی نگاہ رکھ گئی ہو

آج میں اکیلے ہی دونوں کا دیکھنا دیکھ رہا ہوں

تم میرے من میں بس رہی ہو

میری آنکھوں کی پتلیوں میں اپنی نگاہِ شوق کی لکیر بنا کر

میرے زندگی میں تم جئے جاؤ جئے جاؤ

میرے دل کے ذریعے سے اپنی مراد مانگو

تاکہ میں دل میں سمجھوں کہ نہایت پوشیدہ طور سے

تم آج مجھ میں "بن" کر بس رہی ہو

میری زندگی میں جئے جاؤ جئے جاؤ

15 مارچ 1970ء

اِس ضمن میں جس اور نمایاں شخصیت سے میری بھرپور بات چیت رہی وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ابو سعید چوہدری تھے جو بعد میں بنگلہ دیش بن جانے پر ملک کے صدر بھی بنے۔اُن کے ساتھ ملاقات بڑی دلچسپی کی حامل تھی۔

اُن دنوں ہاتھ کی لکیروں سے میرا عشق جنون کی حدوں تک پہنچا ہوا تھا۔یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وی سی ہمارے ڈپارٹمنٹ کی ایک تقریب میں آئے۔فیکلٹی ممبرز ان کے ساتھ کھڑے تھے جب میں ان کے پاس گئی۔میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور بنگلہ میں کہا۔

"سر مجھے آپ کا ہاتھ دیکھنا ہے۔وقت آپ نے بتانا ہے کہ کب آپ کے پاس آؤں؟"

انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"سر میں بہت اچھا ہاتھ دیکھتی ہوں۔حسینہ واجد کا ہاتھ بھی میں نے دیکھا ہے۔میرے پاس اس کے ہاتھ کے پرنٹ بھی ہیں۔اُس وقت میرے تن پر آبی رنگی منگا ئل کی خوبصورت ساڑھی تھی۔شانوں پر گھنے سیاہ بال لہراتے تھے۔سانولی رنگت کے ساتھ میں مکمل طور پر ایک بنگالی لڑکی نظر آتی تھی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میرے ہیڈ سر نے مسکراتے ہوئے پہلے مجھے اور پھر انہیں دیکھا اور میرا تعارف ویسٹ پاکستانی سٹوڈنٹ کی حیثیت سے کروایا۔

یونیورسٹی لیول کے اساتذہ اور سٹوڈنٹس کے درمیان ہونے والی لطیف سی چھیڑ چھاڑ اور جملہ بازی والے ماحول کے درمیان بالآخر میں نے انہیں رضامند کر ہی لیا۔

ہاتھ دیکھنے، پرنٹ لینے اور اس کے نتائج کو ایک طرف کیجیئے کہ اس خوبصورت سلسلے سے اس کا تعلق بس اتنا سا ہے کہ ان ملاقاتوں کے بعد میں نے انہیں اخبار خواتین کے لئے انٹرویو بھی کر لیا۔ انٹرویو میں ایک صاحب علم شخصیت میرے سامنے آئی تھی۔ جنہوں نے ٹیگور کی شاعری کے کئی اور نمایاں پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں پہلی چیز شاعری کا بے ساختہ پن ہے۔ آنکھ سے نکلنے والے کسی بے اختیار و بے تاب آنسو کی طرح، ہونٹوں پر اپنے آپ ہی بکھر جانے والی کسی مسکراہٹ کی طرح۔ ٹیگور کی شاعری، ان کے گیت، سریلے اور نغمہ بار ہیں، اپنے آپ میں مکمل، ان کی شخصیت کے عکاس، فکر ونظر میں آزاد۔

ٹیگور کی ذات مذہب، فرقہ بندی، قوم وملت کی بندشوں کو توڑتی ہے۔ انسان کو انسان سے جوڑنے کی ترغیب دیتی ہے کہ ٹیگور نے انسان میں انسانیت کے خدا کو دیکھا ہے۔ اسی لیے وہ اس کی توہین برداشت نہیں کرتا۔

ذرا غور کرو شاعر کے اس انداز پر۔

جب میں روشنی کی سنہری باتیں سنتا ہوں
میں محسوس کرتا ہوں
آسمانی فضا کا دل محبت سے بھر گیا ہے
تب میں اس جہان کے ہر ذرّے میں

آ گہی اور عرفان کا پیغام محسوس کرتا ہوں
جب گیت کے اندر سے میں دنیا کو دیکھتا ہوں
تب میں اُسے پہچانتا ہوں
تب اُسے سمجھتا ہوں

ان کے یہاں کوئی مخصوص نظریہ یا نمایاں فلسفہ حیات نہیں ملتا۔ مذہباً ٹیگور کا تعلق برہمو سماج سے تھا۔ یہ فرقہ صرف بنگال میں ہے۔ بنگال کی بیشتر عظیم ادبی و سیاسی شخصیات کا تعلق اسی طبقے سے تھا۔ برہمو سماج صرف وحدانیت خداوندی کا قائل ہے۔ ٹیگور کی فنکارانہ زندگی کے تحت الشعور میں یہ تصور ہمیشہ قائم رہا کہ اُن کا مرکز مسرت بس تخلیق ہی ہے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اسی کا اظہار کریں۔

ایک بار انہوں نے کہا کہ میں اُن سب لوگوں سے جو مجھے مسند پر بٹھانا چاہتے ہیں کہتا ہوں کہ مجھے نیچے زمین پر ہی بیٹھنے دیں۔ وہ جو کھیل کے قواعد و ضوابط طے کرتا ہے اُس نے میرے لئے کوئی بڑا امد برانہ سا کردار نہیں چنا۔ میری زندگی کا رس جو قدرت نے مجھے بخشا ہے وہ اسی مٹی، اسی دھرتی اور اسی گھاس پر ہی نچڑنا چاہیے۔ وہ سب لوگ وہ جو دھرتی پر پہلا قدم اٹھاتے ہیں اور پھر اسی کی گود میں چلے جاتے ہیں۔ میں اُن کا دوست ہوں۔ میں شاعر ہوں۔ میں کوی ہوں۔

اُن کے ہاں مسائل حیات کے تعمیری پہلو تہذیب نفس، کردار کی پاکیزگی، حق گوئی و بیباکی کیلئے ایک دائمی پکار ملتی ہے۔ اس کیلئے وہ اپنے ساتھیوں کو آواز دیتے ہیں۔ کوئی نہیں ملتا تو کہتے ہیں۔

جب تیری پکار پر کوئی نہ تیرا ساتھ دے
تنہا ہی چل تو اکیلا ہی چل

گیتا نجلی زیادہ زیر بحث رہی۔ بہت زیادہ پڑھی گئی۔ انگریزی ترجمے نے دنیا میں گھمادی۔ نوبل انعام یافتہ ٹھہری۔ کوئی شک نہیں کہ وہ ایک شاہکار ہے۔ مگر میرے نزدیک "بلاکا" اس سے بھی بڑا مجموعہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ گیتا نجلی کے نیچے دب سی گئی اور یوں اُبھر کر سامنے نہ آئی جیسے اُسے آنا چاہیے تھا۔

یہ شعری مجموعہ محبت، انسان، خدا اور انسانیت کے گرد گھومتا ہے۔ ٹیگور نے اِس خواہش کا اظہار کیا کہ وشنومت کو وشنو اور برہما کو برہموں کے چنگل سے نکالنے کی ضرورت ہے۔ مسیحیت کو سمجھو۔ اسلام کا مطالعہ کرو۔ محبت لافانی ہے جو خدا اور بندے کے درمیان ہونی چاہیے۔

شبنم سے بھیگا ہوا صبح کا یہ منظر کیسا حسین ہے
درخت سورج کی کرنوں میں جھلملا سے رہے ہیں
اسی لئے میں سمجھتا ہوں
یہ دنیا عالم خیال کے بے کراں سمندر
کی موجوں پر ناچتا ہوا ایک کنول ہے
میں سمجھتا ہوں
میں اسی کا پیغام ہوں
میں اس کے گیت کی تان ہوں
میں زندگی میں روح زندگی ہوں
میں ظلمت کے سینے کو چاک کر کے نکلنے والے اُسی
رقصاں نور کی درخشاں کرن ہوں

میرے لئے یہ امر بھی کچھ تعجب انگیز سا تھا کہ ابوسعید چوہدری اقبال، حافظ اور

مولانا رومی سے بھی بڑے متاثر تھے۔ اقبال کو ٹیگور کے پلے کا شاعر مانتے تھے۔ ان کی گفتگو میں دو تین بار ٹیگور کا ان تین بڑی شخصیات کے ساتھ موازنہ بھی سامنے آیا۔ ٹیگور کے عاشق ایلکس آرونسن کے بارے باتوں نے میرے اوپر فکرو آگہی کے نئے دروازے کھولے۔ آرونس ایک بے چین، مضطرب، علم کی پیاسی روح، تلاش حق کے لئے بھٹکتی کبھی جرمنی کبھی فرانس ٹیگور کے ناول Home and the world سے متاثر شانتی نکیتن آ پہنچی تھی جہاں انہوں نے انگریزی ادب پڑھانا شروع کیا تھا۔ یہاں آرونسن کی ایک تحریر ٹیگور کی شخصیت کے ایک اور پہلو کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری ملاقات جب بھی ٹیگور سے ہوتی۔ مجمع میں یا تنہائی میں، وہ باتیں کر رہے ہوں یا خاموش ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بنیادی طور پر وہ ایک تنہا آدمی ہیں جو اپنے خیالوں میں غرق رہتا ہے۔ گیتوں کو گانے والا۔ خوابوں کا بننے والا۔ وہ مجمع کے لئے کوئی پیغام رسا نہیں ہے۔ جس کی آس میں مجمع اکٹھا ہوتا تھا۔

کیسا شاعر تھا جسے رکشہ چلانے والا اور پتھر کوٹنے والا اگر گاتا تھا تو وہیں حکمرانوں کی آنکھوں کا بھی تارہ تھا۔ دلی کی سیاحت کے دوران اندرا گاندھی میموریل کو دیکھنے گئی تو ان کی سٹڈی میں جو نظم موجود تھی وہ ٹیگور کی ہی تھی۔

جہاں ذہن میں ڈر اور خوف نہ ہو
جہاں انسان سربلند ہو کر جئیجہاں علم کا حصول ہر خاص و عام کے لئے ہو
جہاں یہ ہماری دنیا ٹکڑوں میں بٹ کر تقسیم نہ ہو

☆☆☆

کرونیرتن ابی سکار اور سنیل آریارتن

سنہالی اور تامل زبانوں کے خوبصورت اور ہر دل عزیز شاعر

- کروشاعری نہیں۔ بہترین گلوکار، بہترین اناؤنسر، ڈیبیٹر، میوزک کمپوزر، کرکٹ کمنٹیٹر، ڈرامہ اور سٹوری رائٹر کے طور پر بھی بہت کامیاب تھا۔
- سنیل آر سیا رتن کو فطرت نے نغمہ نگاری کے ساتھ ساتھ دُھن سازی کی بھی اعلیٰ خوبی سے نوازا تھا۔
- روی، بسیلا کورے اور جین فکری اور انقلابی سوچ کی وجہ سے بہت مقبول ہیں۔

ہماری زندگی میں خوشی اور مسرت ہی نہیں
غم، دُکھ اور مصائب بھی بہت ہیں
کہیں یہ ہمارے ماحول سے جڑے ہیں
کہیں یہ لنکا کی روایات سے جڑے ہیں
کہیں اُس ماحول سے جس میں ہم بڑھے پلے ہیں
لیکن کیا ہمیں ان سے فرار ہے
یا کہیں ان سے کچھ بہتر ہے
شاید وہ ایک گیت
جو ہمیں ہماری پرانی یادوں میں لے جائے
پس تو آئیں انہی خیالوں میں کھو جائیں
اکیلے گیت گاتے یا کہیں دوستوں کے ساتھ
باہر اونچے اونچے گاتے

کرونیر تن ابی سکارا

شومئی قسمت جانے کون سی گھڑی تھی جب کہیں ہم سے اپنے لکھاری ہونے کی ڈینگ ماری گئی۔ مسٹر جستن تو شعروشاعری کا شوقین بندہ تھا۔ یوں بھی بڑا محبِ وطن تھا۔ اب انہوں نے کیا سنبھالی، کیا نامل شاعروں کے کہیں شوخ و چنچل، کہیں غم انگیز اور کہیں دردبھری شاعری اور گیت سُنوا سُنوا کر ایک طرف اگر ہمیں قدرت کی اس فیاضی کے اعتراف کو ایک بار پھر دہرانے اور سراہنے کا موقع فراہم کیا کہ ملک چھوٹے ہوں یا بڑے۔ جگہیں بہت ترقی یافتہ ہوں یا کم تر، لوگ دیہاتی ہوں یا پڑھے لکھے، قدرت اپنے ہونے کا ایک اظہار انہیں تخلیقی قوتیں دے کر کرتی ہے۔ اور ایسی ایسی خیال آفرینیاں سامنے آتی ہیں کہ بندہ حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے تو دوسری طرف ایک اجنبی زبان کے گیت اور شاعر سُنوا سُنوا کر ہماری مت ماردی۔

کبھی کبھی جب ہم بوریت محسوس کرتے۔ تب وہ ایک بار کہا بھی کہ جناب ہمیں

اردو کے وہ پرانے گیت سُنوا دیں جنہیں ریڈیو سیلون سے سُنتے ہمارا بچپن گزرا تھا۔مگر انہوں نے ہماری درخواست کورتی برابر اہمیت نہ دی۔اپنے ملک کی محبت میں ڈوبے،اپنے شاعروں کادم بھرتے سری لنکا کا یہ چہرہ ہمیں دکھاتے رہے۔

یوں سچی بات ہے میں تو خود کرونیرتن ابی سکارا Karunaratne Aboysekera، روی ساتھسوم Ravi Sathasivam، سسیلا، سنیل آر سیارتن Ariyaratneاور جین آر سیا گم جیسے بے مثال شاعروں کہ جن کی شاعری، آواز اور دیگر صلاحتیں اتنی زیادہ اور ایسی بے پایاں تھیں کہ بے اختیار انہیں سراہنے اور اپنے اُردو دان لوگوں سے ملانے کو جی چاہتا تھا۔

ان سب کے ہاں فکر کی جو گہرائی نظر آتی تھی وہ بہت متاثر کن تھی۔کچھ ایسا ہی حال بقیہ شاعروں کا تھا۔

تاہم کرو شاعر ہی نہیں تھا۔بہترین گلوکار،بہترین اناؤنسر،ڈیبیٹیر،میوزک کمپوزر،کرکٹ کمنٹیٹر،ڈرامہ اور سٹوری رائٹر کے طور پر بھی بہت کامیاب تھا۔زمانوں اپنی شاعری،گلوکاری،کمپوزنگ اور کرکٹ کمنٹری جیسی صلاحیتوں کے ساتھ سری لنکا کی ادبی اور ثقافتی زندگی کے آسمان کا روشن ستارہ بنا رہا کہ جس کی دھوم ملک میں ہی نہیں ہندوستان تک میں بھی رہی۔

1930 کے لگ بھگ جنوبی سری لنکا کے ایک چھوٹے سے گاؤں رتمالی Ratmaleمیں پیدا ہونے والا کرو اپنے ساتھ بے شمار میدانوں میں مہارت رکھنے کے گنوں کا وصف لے کر پیدا ہوا تھا۔

شاعری کب شروع کی اور گیت گانے کا آغاز کب سے ہوا؟اور لکھاری کب بنا؟ وہ تو خود لاعلم رہا کہ یہ سب کیسے اسکی ذات میں داخل ہو کر اپنے آپ کا اظہار کرنے لگے

تھے ۔تاہم ان سب کاموں کا آغاز یکے بعد دیگرے ہو گیا تھا کہ ہر ایک میں وہ ایک کے بعد ایک اپنے جھنڈے گاڑتا گیا ۔

اُس کے اندر ایک خداداد شاعر تھا ۔اس کا علم محض نو سال کی عمر میں اُس وقت ہوا جب وہ اپنے والدین کے ساتھ کینڈی میں پیرا ہرا (Perahera) (بدھا کا مقدس دانت دکھانے کی سالانہ تقریب) میں گیا ۔ہاتھی کے ہودے میں بیٹھ کر اُس نے ترنم سے بدھا لارڈ کے حضور منظوم کلام گا کر پیش کیا ۔اس کی آواز کا ترنم اور شاعری سبھوں نے لوگوں کو حیران کر دیا ۔اتنا چھوٹا سا بچہ ایسا جاندار کلام اور ایسی موہ لینے والی آواز ۔تقریب بطور شاعر اور گلوکار اُس کا ابتدائی تعارف تھا ۔

کرو کی سیکنڈری تعلیم کولمبو میں ہوئی ۔حد درجہ مودب اور فرمابردار شاگرد ۔چھوٹی سی جگہ سے ایک بڑے شہر میں آکر اُسے ایڈجسٹ ہونے میں ذرا وقت نہیں ہوئی ۔کالج کے تقریری مقابلوں میں حصہ لیتا تو اپنے اشعار بیچ میں شامل کرتا اور تقریر کے دوران سامعین کو بتاتا کہ یہ اشعار اس کے اپنے تخلیق کردہ ہیں ۔

اُس کی شاعری میں اُداسی ،دُکھ اور غم کا عنصر کم عمری سے ہی تھا ۔

وہ مذہباً بدھ تھا ۔نرم خو ،نرم مزاج اور نرم دل رکھنے والا ۔ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی مصداق اُس کی شہرت نے لوگوں کی توجہ کھینچ لی تھی ۔پندرہ سال کی عمر میں اُسے ریڈیو سیلون پر بچوں کا پروگرام کرنے کی پیشکش ہوئی ۔وہ اس عمارت میں داخل ہوا تھا جس نے آنے والے وقتوں میں اس کے اوپر شہرت ،عزت ،دولت سبھی دروازے کھول دیئے تھے ۔

2000 سے زیادہ گیتوں اور شاعری کا خالق ۔جس میں تنوع تھا ۔موضوعات کے اعتبار سے انفرادیت تھی ۔

ایک خداداد صلاحیتیں رکھنے والا شاعر کم عمری سے نئی جدتوں کے ساتھ میدان میں

اُترنے والا شاعر۔نغمہ نگار اب براڈ کاسٹر خاص طور پر کرکٹ کی کمنٹری اوراس فیلڈ میں نئی نئی اصطلاحیں ایجاد کرنے والا بن گیا تھا۔ سنہالی زبان کو اُس نے کرکٹ کمنٹری کرتے ہوئے جس طرح وسعت اور مانوسیت دی وہ اس کا بڑا کارنامہ ہے۔ نئے الفاظ، نئے انداز، بولتے میں زبان سے حرکات کا بھرپور تاثر، آسٹریلیا، انڈیا، ساؤتھ افریقہ، انگلینڈ اور پاکستان کے ساتھ میچوں میں ہمیشہ لوگوں کی خواہش اُسے سُننے اور دیکھنے کی ہوتی۔ ڈائیلاگ، رائٹنگ اور ڈرامے لکھنے میں بھی اُسے کمال حاصل تھا۔ نغمہ نگار تو تھا۔ کمپوزنگ بھی کرنے لگا۔ تب اِس میں بھی بڑا نام پیدا کیا اور بہترین کمپوزر مشہور رہا۔

ذرا دیکھیے اُس کی شاعری کا ایک نمونہ۔

ہماری زندگی میں خوشی اور مسرت ہی نہیں
غم، دُکھ اور مصائب بھی بہت ہیں
کہیں یہ ہمارے ماحول سے جڑے ہیں
کہیں یہ لنکا کی روایات سے جڑے ہیں
کہیں اُس ماحول سے جس میں ہم بڑھے پلے ہیں
لیکن کیا ہمیں ان سے فرار ہے
یا کہیں ان سے کچھ بہتر ہے
شاید وہ ایک گیت
جو ہمیں ہماری پرانی یادوں میں لے جائے
پس تو آہیں انہی خیالوں میں کھو جائیں
اکیلے گیت گاتے یا کہیں دوستوں کے ساتھ
باہر اونچے اونچے گاتے

اماؤنسمٹ شروع کی تو انہیں اپنی صلاحیتوں سے وہ اضافے کیے کہ سری لنکن لوگوں کو کہنا پڑا کیسا فنکار انسان ہے؟ ہمارے دلدار پرویز بھٹی کی طرح کا کہ بات سے بات نکالتا، مزاح پیدا کرتا بات بھی بڑی معنی خیز ہوتی۔

ایک عوامی شاعر جس کے گیت ہر روز گائے جاتے ہیں۔ سُنے جاتے ہیں۔ دکانوں پر، شاہراؤں پر، نئی آوازوں میں ڈھب کر کے نئے رنگ و آہنگ کے سامان کے ساتھ وہ آج بھی اتنا ہی ہردلعزیز ہے جتنا ماضی میں تھا۔ بوڑھے، جوانوں کو آج بھی اس کے گیت تڑپاتے ہیں۔

سری لنکا کی حکومت نے کولمبو کی ایک اہم شاہراہ اس کے نام پر کی ہے۔ بے شمار تمغات اور انعامات سے اُسے نوازا گیا ہے۔ مگر اس کا سب سے بڑا انعام اس کی شاعری اور آواز ہے۔ زندہ رہنے والی جو ہمیشہ نہ صرف اپنے لوگوں کو بلکہ دور دیس کے لوگوں کو بھی کہیں نہ کہیں اُداس کرتی ہے اور کوئی میرے جیسی اُس پر چند لفظ لکھنے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔

روی ساتسوم بھی کمال کا شاعر ہے۔ سری لنکا اس کی زندگی ہے۔ اپنی بیوی تارہ اور بچوں بچے اور سریش سے بھی زیادہ محبوب۔ کمال کا شاعر۔

Sicila Gooray سیسلا گورے جدید شاعری کی بے مثال شاعرہ ہے۔ کالج میں پڑھاتی ہے۔ سوچ میں بڑی انقلابی، عملی زندگی میں روایتی۔ شوہر اور بیٹے کی ممنون کہ ان کی حوصلہ افزائی نے اُسے شاعری پر آمادہ کیا۔ اپنے بارے میں کہتی ہے کہ موڈی ہوں۔ اُس وقت لکھتی ہوں جب تحریک پیدا ہوتی ہے۔

سنیل کو فطرت نے نغمہ سازی کے ساتھ ساتھ دھُن سازی کی وہ خوبی عنایت کی ہے کہ اُس نے سری لنکا کے فلمی گانوں پر زمانوں کے چھائے ہوئے تامل اثر کو ختم کرتے

ہوئے سنہالی کلچر میں ڈوبی ہوئی دھنوں کو فروغ دیتے ہوئے سنہالی موسیقی کی اہمیت کو بڑھاوادیا۔

مسٹر جسٹس کینڈی کی انگریزی زبان کی شاعرہ جین آریسنیا گم Arasanaygam کی شاعری کے بھی بہت مدّاح تھے۔جس وقت ہم کینڈی میں داخل ہوئے۔انہوں نے محبت اور سرشاری میں ڈوبے لہجے میں کہا تھا۔

''کینڈی میری محبوب شاعرہ کا شہر ہے۔یہاں وہ پیدا ہوئی۔کیا شاعری ہے اس کی۔ایک مصور کی طرح وہ چہرے، آوازیں، فضا تقافتی رنگ ڈھنگ، دکھ، حادثات، سماجی اور سیاسی تنازعات کو کس کمال فنکاری سے لفظوں میں پینٹ کرتی ہے۔

وہ ڈچ برگر کلاس سے تعلق رکھنے والی ہے۔جس کے آبا کی کسی دلکش عورت کو ایک ڈچ افسر نے پسند کیا اور بیاہ کرلیا تھا۔جین نے خود ایک تامل سے شادی کی۔مگر قدامت پرست روایتی گھرانہ جنہیں وہ قبول ہی نہیں تھی۔دو بیٹیوں کی ماں جس کی زندگی کو اجیرن بنا دیا گیا۔

ذرا سنیئے۔

کسی نے دروازے کو توڑ دیا تھا
اور جیسے مجھے آزاد کردیا
کہ میں دنیا میں گھوموں پھروں
آزاد اپنی ذات کے خول سے باہر آزاد

1983 میں جب تامل اقلیت اور سنہالی اکثریت میں خون ریز جھڑپیں ہو رہی تھیں۔وہ بھی اِس زد میں آئی اور گھر سے بے گھری اس کا مقدر بھی بنی۔مہاجر کیمپ میں

ڈر خوف، گھر بدری کا دُکھ، اپنی پہچان اور شناخت کا گم ہوجانا یہ سب وہ احساسات تھے جنہوں نے اس کی شاعری کو درد سے بھر دیا۔ اس کی اسی زمانے کی شاعری پر نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔

☆☆☆

سعدی یوسف

عراق کا مایہ ناز انقلابی شاعر

- سعدی یوسف کی شاعری عراق کی سیاسی و آمرانہ سچائی اور عالمی طاقتوں کے مکارانہ اور جابرانہ رویوں کی بے باکی سے عکاسی کرتی ہے۔
- میں دنیا کا شہری ہوں مگر میری اپنی کوئی سرزمین نہیں۔
- ہمیں کاغذ دے دو کہ ہم نظمیں لکھیں جو تمہارے (امریکہ کے) چہرے کو داغ دار کریں۔
- ہم اہلِ عراق جو اس دھرتی کی تاریخ کے وارث ہیں۔ ہمیں اپنی بانس کی معمولی چھت پر فخر ہے۔

وہ ملک جو ہمارا تھا

وہ ختم ہو گیا

اپنی پیدائش سے پہلے ہی

وہ ملک جسے ہم پسند نہیں کرتے

اس کا دعویٰ ہے

کہ خون ابھی بھی ہماری رگوں میں باقی ہے

یہ عراق اب قبرستان کے کناروں پر ہی پہنچے گا

یہ اپنے بیٹوں کی قبروں سے ملک بھر دے گا

نسلوں کے بعد

نسلیں

شاید اپنے جابر حکمران کو معاف کر دیں

مگر یہ وہ عراق تو نہیں ہو گا

کہ جس کا نام کبھی عراق تھا

سعدی یوسف

سعدی یوسف سے میرا بھرپور تعارف کروانے میں ایک کردار قدیم بغداد کے اُن قہوہ کیفوں میں منعقدہ ادبی محفلوں اور شاعروں کا بھی ہے جو میرے لاہور کی ہی طرح ادبی بیٹھکوں، گھروں اور کیفوں میں ادبی نشستوں اور مشاعروں کی صورت نئے اور پرانے شعرا کے اوپر بحث و مباحثے کیلئے اور کبھی اُن کا کلام اور مفہوم سمجھنے کیلئے منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

بغداد میں میری بھی چند شامیں اسی سرگرمی کی نذر ہوئیں۔ بلا سے مجھے سمجھ نہ آتی مگر میرا ٹیکسی ڈرائیور انگریزی میں مجھے بتاتا اور سمجھاتا۔ بہت ساری مدد انگریزی جاننے والے ادیبوں نے بھی کی۔

مگر ہاں رُکیے ذرا۔ چند اہم یادیں بھی یادداشتوں کی گٹھڑی سے باہر نکل آئی ہیں۔ واقعات کے تناظر میں اگر دیکھوں تو کہہ لیجیے کہ یہی پہلی پہلی ملاقات تھی اور تب ہوئی تھی جب ذہنی بلوغت ابھی غیر ملکی کلاسیکل اور جدید ادب کی رنگا رنگیوں کی دنیا میں داخلے سے گھبراتی تھی۔ ماحول اور ناموں کی نامانوسیت ہی مطالعے کے تسلسل میں روڑے اٹکاتی

تھی۔میری توجہ اور یکسوئی بہت جلد اس کی نئی نئی جہتوں کے کشادہ میدانوں میں گھومنے پھرنے اور لطف اٹھانے سے اُکتا جاتی تھی۔

یہ بیسویں صدی کی ساٹھ کی دہائی کے درمیانی سال تھے۔اور میں کچے پکے سے دو ناول لکھ چکی تھی۔

یہی وہ دن تھے جب میرا وہ رشتے کا ماموں ہم سے ملنے آیا۔میں نے شوق و اشتیاق کی بلندیوں سے اِس بے حد دلچسپ کردار کو دیکھا تھا جو کبھی کبھار گھر کی بزرگ عورتوں کا موضوع بنا رہتا تھا، جو بڑے شاعرانہ سے مزاج کا آوارہ گرد اور من موجی سا بندہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں اپنی مرضی سے فوج میں بھرتی ہو کر مصر کے محاذ پر جا پہنچا۔مدتوں تو کچھ پتہ ہی نہ چلا تھا کہ زندوں میں بھی ہے یا مارا گیا۔

درمیان میں ہوا کے کسی معطر جھونکے کی مانند آیا اور بس اپنی باتوں کی خوشبو کہیں مصر، کہیں شام اور کہیں عراق کے حوالوں سے اِدھر اُدھر بکھیر کر چلا گیا۔چاہتے ہوئے بھی میں نے کچھ زیادہ باتیں نہ کیں کہ تہی دامنی کا احساس تھا۔یوں میری بڑی آئیڈیل شخصیت تھی۔رشک سے سوچتی۔

"ہائے کتنا خوش قسمت ہے۔کسی پنچھی، کسی پکھیرو، کسی بنجارے کی طرح زندگی گزارنے والا۔گھومنے پھرنے کے جراثیم تو میرے اندر بھی بڑی وافر مقدار میں تھے۔

پھر کچھ سالوں کے بعد اُن کی مستقل واپسی کا سُن کر میں خود اُنہیں ملنے گئی۔
مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے میری دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی۔سعدی یوسف سے میرا پہلا کچھ گیلا، کچھ سُوکھا تعارف اُنہی کے توسط سے ہوا۔

چھوٹتے ہی جو بات زبان سے نکلی وہ تھی کہ سرتا پا اتنا پیارا انسان کہ جتنا جھوٹ بول لو۔ہاں صورت کا بھی بڑا وجیہہ ہے۔شاعر بھی کمال کا، اپنے نظریات میں پکا بھی بڑا اور

جیالا، جی دار بھی انتہا کا۔ پھر بہت سی چھوٹی چھوٹی تفصیلات بیان ہونے لگیں۔ جانا کہ Without an alphabat. Without a face اُن کی منتخب نظموں کا مجموعہ ہے۔ اسی میں سے ایک نظم انہوں نے پڑھی۔

بہت سا وقت گزرا تو معلوم ہوا

ابن تیمیہ

جیلوں کے ٹارچنگ سیل کا نگران بن گیا ہے

اور وہ المواقف

غلاموں کی بغاوت کچلنے میں مصروف ہے

دمشق کی پولیس

عراقی پولیس

عرب امریکی پولیس

ایرانی اور عثمانی پولیس

ہم پر کتنا ظلم کرتی ہے

ہمارے معصوم اور بے ضرر سے لوگ

اُن کی خطا

تو آؤ وہ کریں جو کرنے کو

ہمارا دل چاہے

ساتھ ہی انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جانتی ہو نظم میں یہ دو حوالے ابنِ تیمیہ اور المواقف کون ہیں؟

کوپلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ میں پڑھنے کی شوقین اب دنیا

کے ادب کو پڑھنے اور اس سے لطف اٹھانے لگی تھی اور خود کو خیر سے خاصی عالم فاضل چیز سمجھتے ہوئے پر اعتماد بھی تھی۔مگر ان کے سوال پر قیں ہو گئی تھی۔ہنستے ہوئے انہوں نے بتایا۔

ابنِ تیمیہ حنبلی فقہ کا ایک بڑا پیروکار تھا۔امام حنبل چاروں فقہی اماموں میں سے سب سے زیادہ سخت اور متشدد نظریات کے حامل تھے۔اور الموافق خلیفہ المتوکل کا بیٹا جو بڑا ہی ظالم اور جابر سپہ سالار تھا۔جس نے جنوبی عراق کے دلدلی علاقوں جو آہواز Al-Ahwaz ضلع کے قصبات تھے میں زنجی قبائل کے غلام لوگوں کی بغاوت کو بڑی سختی سے کُچلا تھا۔یہ زمانہ کوئی نویں صدی کا اختتامی تھی۔یعنی 869 سے 881 تک کا وقت۔

اور وہ سعدی یوسف کیا بات ہے اُس جوان کی۔

میں نے محسوس کیا تھا میرے رشید ماموں کے اندر سے جیسے محبت کے سوتے اُبل پڑے ہوں۔

’’اس کے اندر تو گویا کوئی پارہ بھرا ہوا ہے۔چھوٹی سی عمر سے ہی شاعری،سیاست اور سامراجی رویوں کی مخالفت اس نے اپنا نصب العین بنالیا ہے۔‘‘

اب خلیفہ اور رسیدون سٹریٹ کے قہوہ خانوں میں اِن انقلابی شاعروں کی بیٹھک کی جو تفصیلات تھیں انہوں نے تو مجھ جیسی سیلانی عورت کے اندر طوفان اٹھا دیئے۔

میرے اشتیاق بھرے سوالات کی ماموں سے ایک لام ڈور تھی کہ وہ بھی وہاں جایا کرتے تھے۔

’’ارے وہ سب میرے لنگوٹیے یار تھے۔سعدی یوسف تو میرا بڑا دلارا سا دوست ہے۔میں تو خود عربی میں شاعری کرتا ہوں۔

اب جو منظر کشی کی تفصیل بیان ہوئی اس نے کیا لطف دیا؟ قہوے کی چسکیاں،

سگریٹ کے مرغولے کے دھوئیں میں سعدی یوسف کی شعلہ بار نظم۔ واہ واہ کا سماں ابھی بندھا ہی ہے کہ پولیس کا چھاپہ پڑ گیا۔ اب بغداد کے پرانے محلوں کی بیچ در بیچ گلیوں میں بھاگتے پھرتے۔ کہیں پولیس سے دو دو ہاتھ کرتے۔ کہیں اس کی مار پیٹ کا نشانہ بنتے۔

وہ جمال عبدالناصر کا عاشق تھا۔ ارے وہ کیا ہم تو سبھی اس کے دیوانے تھے۔ پرانے بغداد کی گلیوں میں بھاگتے تو اس کے نام کے نعروں سے گلی کوچے گونج اٹھتے۔ وہ ہمارا محبوب جو تھا۔ سعدی حکام کی نظروں میں بہت کھٹکنے لگا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھی کیا شے تھے۔ بھاگتے پھرتے کبھی دمشق، کبھی قاہرہ۔

عراق جمہوریہ بنا۔ پر کہاں استقامت تھی اس ملک کے مقدر میں؟ عبدالکریم قاسمی کا زمانہ، بغاوتوں سازشوں کے وار کمیونسٹ پارٹی میں شامل دھواں دھار تقریریں کرتے اور لوگوں کو اکساتے۔ شاعر نوجوانوں کا کام انقلابی نظمیں پڑھنا اور چھپتے بھاگتے پھرنا تھا۔ وہ بہت چھوٹی عمر سے ہی سامراجی رویوں کا مخالف اور ترقی پسند نظریات کا پیروکار ہو کر سیاست کی وادی پُرخار میں اُلجھ گیا تھا۔

عراق داخلی کشمکش کا خونین انداز میں اظہار کر رہا تھا۔ صدام بائیں بازو کے ترقی پسندوں کا بیج مار دینا چاہتا تھا۔ ترقی پسند بھی سرکشی اور بغاوت کی انتہاؤں پر پہنچے ہوئے تھے۔ عراق کے شاعروں اور ادیبوں نے جھکنے اور مفاہمت کے الفاظ اپنی لغت سے خارج کر دیئے تھے۔ اقتدار پر قابض ہونے کے بعد صدام کا فیصلہ تھا کہ وہ بائیں بازو کی قیادت کا خاتمہ کر دے گا۔

سعدی یوسف تو بڑی انقلابی نظمیں لکھ رہا تھا وہ راستہ کیسے بدل سکتا تھا؟ بغداد کو خیرباد کہا۔ اور پھر اُسے دوبارہ بغداد اور بصرہ آنا نصیب نہ ہوا۔ اپنے بارے میں اُس نے ایک بار لکھا تھا کہ میں دنیا کا شہری ہوں مگر میری کوئی سرزمین نہیں۔

پھران کا لہجہ افسردگی کی تہوں میں جیسے دھنس گیا تھا جب انہوں نے کہا۔

سعدی تو اب بیروت میں ہے۔وہ بغداد سے عراق سے چلا گیا۔اس کے ساتھی کچھ بھاگ گئے اور کچھ مارے گئے۔اچھا ہوا وہ بھی چلا گیا نہ جاتا تو صدام کے ہاتھوں مارا جاتا۔

انہوں نے اُن کی ایک اور نظم گنگنائی۔یہ عربی میں تھی جس کا مطلب انہوں نے سمجھایا۔عنوان تھا۔"پرندے کی آخری پرواز"

اگر تم چاہتے ہو
تو یاد رکھو
کہ میرے پر پانی میں ہیں
پر کہیں لہروں کے بغیر پانی ہوتا ہے
اور ساحل کے بغیر لہریں کب ہوتی ہیں
میں یہاں آرام کرتا ہوں
مطمئین سا
خوش وخرم سا
میں آخری ساحل پر پہنچ چکا ہوں
چلاؤ نہیں
میری تو سانسوں کی آواز بھی مجھ تک نہیں پہنچتی

وہ دن میرے چند خوبصورت دنوں میں سے ایک تھا کہ میرے سامنے میری خوابوں کی دنیا کے کچھ منظر آئے تھے۔شام اور بغداد میرے خوابوں کی سرزمین ہی تو تھی۔

سعدی یوسف وقت کی تیز رفتاری،غم روزگار کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو کر

یادوں کے اُس صندوقچے میں بند ہوگیا تھا۔ جو کبھی کبھی ہی کھلتا ہے۔

سالوں کے بعد ایک جھٹکے سے کُھلا۔ یہ نوے کی دہائی کا آغاز تھا۔ ایک خاتون دو چھوٹی بچیوں کے ساتھ میرے اسکول آفس میں داخل ہوئی۔ تعارف نے بتایا کہ چھ فٹی قامت کو چھوتی خاتون کویت پر صدام کے حملے سے متاثر لوگوں کی طرح بھاگی ہے۔ خود وہ سکھ، شوہر پاکستانی۔ جائے پناہ سُسرال تھی جو اعوان ٹاؤن میں ہی رہائش پذیر تھی۔ وہ اپنی دو بچیوں کے داخلے کے لیے آئی تھی۔

ایک کربناک داستان سُننے کو ملی تھی۔ بستے رستے خوش و خرم لوگ کیسے اچانک گھر بار چھوڑ کر بھاگے۔ پناہ گزینی کا دکھ جیسے پور پور سے عیاں ہوتا تھا۔

زہرت اظہر خاتون نے اپنا اسلامی نام یہی بتایا تھا کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے جنہیں وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد صاف کرتی۔ کویت کے محکمہ صحت میں اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں اچھی ملازمت پر تھی۔ عربی پر بہت عبور تھا۔ انگریزی میں شاعری بھی کرتی تھی۔

اُس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک مشرق وسطیٰ کی سیاست کے اِس اُتار چڑھاؤ کے پیچ وخم میں الجھی رہی۔ ماموں رشید یاد آئے تھے۔ عراق کی سیاست پر اُن کی باتیں اور تجزیے یاد آئے تھے۔ بڑے دو ٹوک لہجے میں انہوں نے کہا تھا۔

"دیکھنا صدام ایک دن کویت پر قبضہ کر لے گا۔ کویت کی ایک آزاد خود مختار ملک کے طور پر موجودگی عراق کے کسی بھی حکمران سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ کویت تو سو فیصد عراقی شہر بصرے کا حصّہ ہے۔ ہر عراقی کی یہی سوچ ہے۔ دراصل کویت تو ان بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں بنا۔ کویتی شیخوں کی دولت سے برطانیہ کے بینک کالے ہوئے پڑے ہیں۔ ایک دن کوئی نہ کوئی دھماکہ ضرور ہوگا دیکھ لینا۔

اور وہ دھماکہ تو ہوگیا تھا۔

زہرت کے لیے یہ وقت بڑا کٹھن تھا۔ خودمختار عورت روایتی سسرال کی سختیوں، ترشیوں کے مزے چکھ رہی تھی۔ کچھ وقت بعد کویت کو آزاد کرالیا گیا۔ زہرت کا شوہر چلا گیا اور وہ انتظار میں دن کاٹنے لگی کہ کب وہ اُسے آنے کا اذن دے۔ ایک طویل انتظار بعد اِس کے اِس دکھ بھرے دورانیے کا وقت تمام ہوا اور وہ واپس جانے کے لیے بچیوں کے سرٹیفکیٹ لینے آئی۔ ساتھ ہی اس نے مجھے ایک کیسٹ دی یہ بتاتے ہوئے کہ یہ عراق کے ایک بڑے انقلابی شاعر کا کلام ہے جو صدام کے خوف سے جلاوطن ہے۔ اس کے کلام کی یہ کیسٹ اظہر کے ایک گہرے عربی دوست نے دی تھی جو اس شاعر کا بڑا عاشق ہے۔ اظہر اِسے پھینک دینا چاہتا تھا مگر اتفاقاً وہ ان کے سامان میں آ گئی۔ میں اِسے آپ کو دینے کے لیے لے آئی ہوں۔ سچی بات ہے ہمیں تو عراق سے رتی برابر ہمدردی نہیں۔

اور یہ جلاوطن شاعر سعدی یوسف تھا۔ اور یہ اس کی شہرہ آفاق نظم "امریکہ امریکہ" تھی۔

خدا امریکہ کو محفوظ رکھے
میرا گھر، میری جنت
جینز، جاز، خزانوں کے جزیرے
جان سلور کے طوطے اور نیواورلینز New or Leans کی بالکونیاں
اُن سے بے پایاں محبت مجھے بھی ہے
مارک ٹوئن، مسیسپی Mississippi کی دخانی کشتیوں
ابراھم لنکن کے کتوں اور رور جینا تمبا کو
اُن سے بڑا ہی پیار ہے مجھے
لیکن میں امریکی نہیں

پینٹم Phantom پائلٹ کے لیے اتنا ہی کافی ہے
کہ دھکیل دے پتھر کے زمانوں میں مجھے
تیل کی ضرورت نہیں، نہ ہی امریکہ کی
نہ ہاتھیوں اور نہ ہی گھوڑے گدھوں کی
پائلٹ! میرے گھاس پھونس کی چھت والے گھر
چوبی پل اور مجھ سمیت سب کو چھوڑ دو
تمہارے گولڈن گیٹ اور تمہاری فلک بوس عمارتیں
اُن کی ضرورت کب ہے مجھے
اپنا گاؤں چاہیے، تمہارا نیویارک نہیں
تم مسلح سپاہی اپنے نویدا صحرا سے کیوں آئے
تم لوگ اتنی دور سے بصرہ کیا کرنے آئے
ہمارے گھر دروازوں پر مچھلیاں تیرتی ہیں
یہاں سور چارے کی تلاش میں نہیں پھرتے ہیں
میری بید کی چھڑی، جھونپڑی اور ڈوری کانٹا
چھوڑو سب اور چھوڑو مجھے بھی
اپنے سمگل شدہ سگریٹ لے لو
ہمارے آلو ہمیں واپس کر دو
اپنی مشنری کی کتابیں لے لو
اور اپنے کاغذ ہمیں دے دو
کہ ہم تمہیں بدنام کرنے کے لیے نظمیں لکھیں

اپنے جھنڈے کی پٹیاں لے لو
اور ہمیں ستارے دے دو
افغان مجاہدین کی داڑھیاں لے لو
اور ہمیں والٹ وٹ مین کی
تتلیوں سے بھری داڑھی دے دو
صدام حسین کو لے لو
اور ہمیں ابراھم لنکن دے دو
اُسے نہیں دینا چاہتے
تو پھر کچھ بھی نہ دو
امریکہ ہم یرغمالی تو نہیں
اور
تمہارے سپاہی کوئی خدائی خدمتگار نہیں
ہم غریب ہیں مگر ہماری
دھرتی غرقاب دیوتاؤں کی ہے
غڈ رسانڈ دیوتاؤں کی
آگ دیوتاؤں کی
غم کے دیوتاؤں کی
جو خون اور مٹی کے ملاپ سے
نغمے تخلیق کرتے ہیں
ہم غریب ہیں

ہمارا خدا بھی غریبوں کا خدا ہے

یہ نظم نمائندہ تھی اُن مظلوم ،لاچار اور بے بس عراقی لوگوں کے جذبات و احساسات کی۔جن پر امریکہ اور اس کی لونڈی اقوام متحدہ نے زندگی کی بنیادی سہولتوں کی کھلی فراہمی پر پابندیاں لگادی تھیں۔

یہ بہت لمبی نظم تھی۔میں تو دم بخود تھی۔ساکت تھی۔شاعر کی جی داری اور جرات رندانہ پر حیران تھی۔امریکہ تو پھیتی پھیتی ہو کے فضا میں بکھرا پڑا تھا۔شاعر نے کچھ بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔اپنے دل و جگر کا سارا درد باہر انڈیل دیا تھا۔قاری کو آنسو بہانے پر نہیں اُسے بھی اسی درد میں مبتلا کر دیا تھا۔

اور یہی وہ شناسائیاں تھیں۔دل میں اُترنے کی کاوشیں جنہیں میرے دل و دماغ کے ایک ایک خلیے نے محبت بھری پذیرائی دے کر اس کی میزبانی قبول کی تھی۔

پھر ایک تعلق استوار ہوگیا۔محبت کا، پیار اور احترام کا۔جلاوطنی کا کرب گویا ذاتی کرب سا محسوس ہوتا تھا۔ایک بار کسی ادبی پرچے میں ایک نظم پڑھنے کو ملی۔اُسے پڑھ کر لطف اٹھایا۔محبت کی تجدید ہوئی اور اُسے میں نے کسی اثاثے کی طرح سنبھال بھی لی۔آپ بھی ذرا لطف اٹھائیں۔"عورت" کے عنوان سے لکھی ہوئی یہ نظم جذبات کی کیسی عکاس ہے۔

اس کی یادوں سے میں خود کو کیسے نکالوں گا
میں اُسے کس زمین پر دیکھوں گا
اور کس شہر کی کس گلی میں
کیا میں کسی سے اُس کے بارے پوچھوں گا
اور اگر

کہیں مجھے اُس کا گھر مل جائے
کیا میں اطلاعی گھنٹی بجاؤں گا
کون ہے؟
میں کیا جواب دوں گا
اس کا چہرہ میں کیسے دیکھوں گا
اس کی انگلیوں کے درمیان سے
رستے ہوئے وائن جیسے لطیف سرور سے سرشار
کیسے اُسے ہیلو کہوں گا
اور کیسے اُن سب سالوں کا
دکھ برداشت کروں گا
ایک بار
بیس سال پہلے
ایک ائرکنڈیشن گاڑی میں
میں نے اُسے رات بھر چوما تھا

بہتے وقت کا دھارا بھی کیسا ظالم ہے بہتا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک دن فرخ سہیل گوئندی اور اس کی لبنانی بیوی ریما گوئندی سے ملاقات ہوئی۔ فرخ سے میرا ممتا بھرا رشتہ ہے۔ ریما کے پاس سعدی یوسف کی منتخب نظموں کا مجموعہ without an alphabt, without a face انگریزی میں ترجمہ شدہ دیکھی تو ایک دن کے وعدہ پہ لی اور اس کے کچھ حصے فوٹو کاپی کروئے۔

تعارف میں بھی کچھ کردار اِس کتاب نے اور کچھ ماموں رشید کی باتوں نے ادا

کیا۔

عرب دنیا کا چنیدہ اور جدید لہجے میں بات کرنے والا شاعر جس نے کبھی خود کو بڑا نہیں سمجھا ہمیشہ ہی نزار قبانی کی شاعرانہ عظمت کا مداح رہا۔ 1934 میں بصرے کے قریب ابوالخصیب نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں بصرے سے حاصل کی۔ عربی میں ڈگری بغداد یونیورسٹی سے لی۔ شاعری تو چھوٹی عمر سے شروع ہوگئی۔ آزاد نثر میں اظہار خیال جونئی نوجوان نسل کی ایک اپنی اختراع تھی اور جس نے مروجہ روایاتی شاعری کو پیچھے دھکیل کر عربی شاعری میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا آغاز کیا تھا۔ سعدی نے بہت جلد اپنی انفرادیت قائم کر لی تھی۔

وہ ایک شاعر ہی نہیں تھا۔ بہت اچھا نثر نگار بھی تھا۔ جرنلسٹ رہا۔ پبلیشر بنا اور سیاسی کارکن کے طور پر بھی کام کیا۔ عراق ہمیشہ سے اپنے آپ پر نازاں ملک رہا ہے۔ عرب دنیا کے مشہور شہروں کے بارے میں ایک روایت ہے۔ Cairo writes, Beirut publishes and Baghdad reads۔ اور واقعی بغداد اس پر پورا اترتا ہے۔ پڑھنے کا شوقین، کتابوں کا شیدائی اور یہی احساس فخر اس کے شاعروں، ادیبوں اور آرٹسٹوں میں نظر آتا ہے۔ آغاز میں سعدی بدر شاکر السیاب اور عبدالوہاب البیتی کی آزاد شاعری سے متاثر ہوا پھر آہستہ آہستہ ان کے اثر سے نکلتا گیا۔

سعدی یوسف اُس ماڈرن عراقی شاعری کا ایک حصہ بنا جو اس وقت جماعت jam'a at al Ruwwad کے نام سے جانی جاتی تھی۔

سعدی یوسف کی شاعری اپنے ملک کی کہانی کو ناقابل یقین حد تک سچائی کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ یہ شاعری اپنا تعلق قدیم میسوپوٹیمیا کی تہذیبی زندگی سے جوڑتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ اور عراق کے جدید نظریات سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اُسے اس

سرزمین پر پھیلی ہوئی غربت، شخصی حکومت اور جنگیں پریشان کرتی ہیں۔ یہاں اُس کی دو ایسی نظمیں ہیں پہلی "مایوسی" اور دوسری "وژن" کہ جنہوں نے مجھے افسردہ نہیں حد درجہ ملول کیا۔ ان نظموں میں دلی جذبات نے جس انداز میں نوحہ گری کی وہ رلاتی ہے۔

وہ ملک جو ہمارا تھا
وہ ختم ہو گیا
اپنی پیدائش سے پہلے ہی
وہ ملک جسے ہم پسند نہیں کرتے
اس کا دعویٰ ہے
کہ خون ابھی بھی ہماری رگوں میں باقی ہے
یہ عراق اب قبرستان کے کناروں پر ہی پہنچے گا
یہ اپنے بیٹوں کی قبروں سے ملک بھر دے گا
نسلوں کے بعد
نسلیں
شاید اپنے جابر حکمران کو معاف کر دیں
مگر یہ وہ عراق تو نہیں ہوگا
کہ جس کا نام کبھی عراق تھا

پھر وہ ہوا جو طاقت اور تکبر کے نشے میں مست قومیں ہمیشہ سے کرتی چلی آئی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے عراق پر حملہ کر دیا تھا۔

میرے شب و روز اِس بربریت اور المناک سانحے پر ماتم کناں تھے۔ تو ایسے میں رونے کیلئے کاندھا تو ہمدرد کا ہی ہوتا ہے۔ میں بھی اپنے ماموں رشید کے پاس بھاگی

تھی ۔وہ لاہور میں تھے پر اُن کا دل جیسے بغداد کے گلی کوچوں میں بھٹکتا تھا۔سعدی یوسف سے چند دن پہلے اُن کی بات ہوئی تھی وہ لندن کے مضافات او کسبرج میں رہ رہے تھے۔

ہم نے کوئی ایک گھنٹہ بات کی ۔اس کی قلبی کیفیات کا اظہار اس کے ضبط کے باوجود اس کے لب و لہجے سے چھلک چھلک پڑتا تھا۔

وہ جو امن کا بھوکا تھا۔اپنے وطن کے لیے کسی مضطرب روح کی طرح تڑپتا تھا۔اِن قیامت خیز لمحوں میں کسی اسیر پرندے کی مانند پھڑ کتا تھا۔صدام کے تو خیر وہ روز اول سے ہی مخالف تھا۔مگر اس سانحے کی تو اُسے امید ہی نہیں تھی۔

کیسے یاس بھرے لہجے میں کہتا تھا۔

’’ہم تو انہیں نکال کر بہت خوش تھے۔ہم احمق تو جانتے ہی نہ تھے کہ وہ تو گھات لگائے بیٹھے تھے کہ کب پھر موقع ملے اور ہمارے اوپر چڑھ دوڑیں۔‘‘

ٹی وی پر تباہی کے مناظر اور نیشنل میوزیم کی بربادی پر اس کی دل گرفتگی شدید تھی ۔صدام کے انجام سے وہ اگرچہ بہت خوش تھا مگر معصوم عراقیوں کی تباہی پر دکھی اور غمگین تھا۔سامراجیوں کی اجارہ داری پر ،اینگلو امریکی سیاست دانوں کے جھوٹ اور دھوکے پر مبنی بیانات اور مغربی میڈیا کی جھوٹی رپوٹوں کے پلندوں پر مشتعل بھی بہت تھا۔

اُسے دکھ بھرے جذبات کی اِس منجدھار سے نکالنے کے لیے میں نے اُس کے سامنے امید کی شمع جلائی اور کہا۔

’’سعدی تم کڑھنے اور لکھنے کے سوا کیا کر سکتے ہو؟ یہ سوچو یہ صورت عراق کے لیے بہتر بھی ہو سکتی ہے۔تم انشا ءاللہ وطن جاؤ گے۔بصرہ جاؤ گے۔‘‘

وہ ہنسا۔میں نے محسوس کیا تھا۔اس کی ہنسی بڑی مصنوعی اور کھوکھلی سی ہے۔تاہم میں نے یہ بھی جانا کہ انسان کتنا ہی بڑا دانشور، کتنا ہی بڑا لکھنے والا کیوں نہ بن جائے کہیں وہ

کچھ سراب امیدوں کے سہارے بھی ڈھونڈتا ہے۔

"دیکھو نا۔ماموں نے میری طرف دیکھا تھا۔یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ آپ اپنے وطن نہ جا سکیں۔صدی کا چوتھائی حصّہ یعنی پورے پچیس سال ہوتے ہیں وہ عراق نہیں گیا۔اس نے بغداد نہیں دیکھا۔وہ بصرہ نہیں گیا۔بصرہ جہاں اس نے جنم لیا، جہاں اس کا بچپن گزرا، جہاں اس کا خاندان ہے، جہاں اس کی ماں جیسی بڑی بہنیں اس کی راہ تکتی ہیں۔اس کا گہرا دوست الجواری بھی ابھی تک دمشق میں ہی ہے۔

ہاں ماموں نے جب یہ کہا کہ اب جب صدام اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے تو اس کی واپسی کا امکان بھی بڑا روشن ہے۔

چلو میں نے تھوڑی سی خوشی محسوس کی۔

میں سالوں تک یہ نہ جان سکی کہ انہیں اپنے وطن جانا نصیب ہوا یا نہیں۔میرے رشید ماموں فوت ہو گئے تھے۔اگست 2003 میں اُن پر دل کا دورہ پڑا تھا۔اور سچی بات ہے میری زندگی اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا کی تفسیر بنی ہوئی تھی۔ستم ہائے روزگار نے ذرا سی فراغت دی تو دل عراق جانے کے لئے مچلنے لگا۔

سعدی یوسف کے وطن عراق۔اپنے خوابوں کے شہر بغداد کو دیکھنے کی کتنی آرزو تھی۔معلوم نہیں ظالموں نے اُس کا کیا حشر کیا تھا۔

انہی دنوں 2006 کے لگ بھگ جب میں بغداد کے کیلئے کسی ساتھی خاتون کی تلاش میں تھی۔پاکستان کے خوبصورت شاعر شہزاد نیّر نے مجھے طارق علی کی کتاب Bush in Babylon پڑھنے کو دی۔کتاب کے مطالعہ نے مجھے بتایا کہ شاعر تو اپنے وطن جا ہی نہیں سکا کہ نئے آقاؤں کے گماشتوں نے اُسے بین کروا دیا تھا۔

لندن میں اپنے گھر میں بیٹھے جب وہ ٹی وی پر لندن کے ہی ایک ہوٹل میں عراق

غداروں اور عراقی سامراجی پٹھووں کو نئی گورننگ باڈی میں میٹنگ کرتے دیکھتے ہیں تو حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ اُن کے تصور میں ایکا ایکی وہ منظر ابھرتا ہے جو اُن کے بصرہ اور اس کے مضافات میں گرمیوں کی راتوں میں کھلے آسمان تلے سوتے معصوم دیہاتیوں کی نیند خراب کرنے گیڈروں کے ریوڑ آتے تھے۔ یہ کچھ غل غپاڑہ مچاتے، کچھ لڑتے جھگڑتے، کچھ جاگنے والے کسی دیہاتی سے اینٹ روڑا کھاتے تھے تو یہ منظر بھی بعینہٖ ویسا ہی تھا۔ وہ اپنے گہرے دوست مظفر النواب کو مخاطب کرتے ہیں۔

او مظفر النواب! میرے عزیز دوست۔

''اس گیڈروں کی بارات کا کیا کریں۔''

تمہیں یاد ہیں وہ پرانے دن

شام کی لطیف سی ٹھنڈک میں

بانس کی چھت تلے روئی سے بھرے تکیوں سے ٹیک لگائے

قہوے کی چسکیاں

دوستوں کے جمگھٹے میں

رات کتنی نرمی سے ڈھلتی چلی جاتی ہے

جیسے زبان سے نکلے الفاظ

مٹی سے دھوئیں کے مرغولے اٹھتے ہیں

تب

لمبی گھاس اور کھجور کے درختوں کے عقب سے شور آتا ہے

گیڈروں کی بارات

او مظفر النواب

آج کیا گزرا ہوا کل ہے

سچ یہ ہے کہ ہم ان گیدڑوں کی دعوت ولیمہ میں آئے ہیں۔

ان کا دعوت نامہ پڑھا ہے۔

آؤ اک معاہدہ کرتے ہیں

تمہاری جگہ ان سے ملنے میں جاؤں گا

میں ان گیدڑوں کے منہ پر تھوکوں گا

میں ان فہرستوں پر تھوکوں گا

میں انہیں بتاؤں گا

ہم اہل عراق

ہم جو اس دھرتی کی تاریخ کے وارث ہیں

ہمیں اپنی بانس کی معمولی چھت پر فخر ہے

یہ نظم تو منٹوں میں بغداد اور بصرہ پہنچ گئی تھی۔عراق کے گاؤں گاؤں گھومی۔سعدی یوسف پر لعن طعن کی بوچھاڑ برسنے لگی۔دھمکیاں ملنے لگیں۔جن دو ہزار افراد کی عراق میں داخل نہ ہونے کی لسٹیں بنیں اُن میں سعدی یوسف سرفہرست تھا۔جنرل ٹومی فرینکس کے نام سعدی یوسف کا خط بھی بڑا مشہور رہا۔شاعر نے بھگو بھگو کر جوتیاں ماریں۔

اُس کی شاعری کے کوئی تیس 30 کے قریب مجموعے ہیں۔دو ناول اور پانچ کہانیوں کی کتابیں ہیں۔

سعدی یوسف فیض احمد فیض سے نہ صرف بیروت میں مل چکے تھے بلکہ اُن کا وہ سارا کلام جو انگریزی میں ترجمہ ہو چکا تھا بھی پڑھ بیٹھے تھے۔یہی وجہ تھی کہ وہ فیض کے بہت مداح تھے۔

یہ 2008 ہے اور میں الف لیلی کے بغداد میں ہوں۔ میرا خوابوں کا شہر کتنی بار اجڑا اور کتنی بار بسا۔ یہ میرے پسندیدہ شاعر سعدی یوسف کا بغداد ہے جسے یہاں سے جا کر واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ یہ میرے ماموں رشید کا بغداد ہے۔ اس کے گلی کوچوں میں کہیں ان کے قدموں کے نشان، اس کی ہواؤں میں کہیں ان کی آواز کی بازگشت مجھے سنائی دیتی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کی قدامت اور عظمت کے وہ گن گاتے تھے۔

میری یہ کیسی خوش قسمتی کہ مجھے افلاق جیسا بیبا اور پیارا بچہ ڈرائیور کی صورت میں ملا۔ جس نے میری للک دیکھ کر مجھے اس کا چپہ چپہ دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ بغداد ابھی بھی حالت جنگ میں ہے۔ امریکی ابھی بھی ہر اہم جگہ پر جٹ چھا ڈالے بیٹھے ہیں۔ بہر حال معمولات زندگی اسی انداز میں رواں دواں ہیں۔ راتیں جوان اور دجلہ کی رونقیں تاباں ہیں۔ زندگی یقیناً اسی کا نام ہے۔

میں پرانے بغداد کے اُن کیفوں، قہوہ خانوں اور ادبی کافی ہاؤسوں میں جانے کے لیے مری جا رہی ہوں۔ ایک تو میرا ماموں رشید ان جگہوں پر جاتا تھا دوسرا میرے اُس شاعر کی جوانی کا عروج انہی جگہوں پر جبر کے تھپیڑے کھاتے گزرا تھا۔ مجھے مُنتدر ل زیدی سے بھی ملنے جانا تھا۔ وہی دلبر بچہ بش کے منہ پر جوتا مارنے والا۔

افلاق نے مجھے شہدا برج پر مستنصریہ مدرسہ کی ملحقہ مسجد ال آصفہ میں اُتارا۔ بالعموم میں بغداد کی 55 ڈگری پر پہنچی ہوئی گرم ترین دوپہر کے چند گھنٹے کسی مسجد کے ٹھنڈے خواتین والے حصے میں گزارتی ہوں۔

آج لیٹی ضرور تھی مگر نہ آنکھیں بند ہوئیں اور نہ اعضاء نے آرام کی خواہش کی۔ وجہ جانتی ہوں۔ ساتھ ہی المتنابی سٹریٹ ہے نا۔ جہاں کتابوں کی دنیا ہے۔ میں اٹھی اور باہر نکل آئی۔

داخلہ آسمان کو چھوتی محراب سے ہوا۔کہیں کہیں عمارتوں کی بالکونیاں ایک دوسرے سے جھپٹیاں ڈالنے کو مچلتی نظر آئی تھیں۔

عراقی روشن خیال قوم ہے۔اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے پر ناز کرنا جانتی ہے۔انہیں باعزت اور قابلِ فخر مقام دیتی ہے۔ماضی کے متنازعہ شاعر ابونواس ہو، المتنابی ہو بغداد کے کوچہ و بازار میں عظمتوں کے تاج پہنے کھڑے ہیں۔بلا سے کوئی مرتد تھا یا پیغمبری کا دعوے دار۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوفے میں 915 ہجری میں پیدا ہونے والا المتنابی اپنی شاعری میں پختہ کار تھا۔قصیدہ گوئی میں کمال کو پہنچا ہوا تھا۔تقریباً ساڑھے تین سو نظمیں اس کی داستان زندگی کی بہت سی پرتوں کو کھولتی ہیں۔اپنی غیر معمولی ذہانت، حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور کلام کی طاقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

''میں وہ ہوں جس کے لکھے ہوئے کو اندھا بھی پڑھ سکتا ہے۔میری شاعری جادوئی اثر رکھتی ہے۔جسے بہرہ بھی سن سکتا ہے۔جو کام تلوار اور تیر کرتے ہیں۔میرا کاغذ، قلم اور حرف اُس سے زیادہ موثر ہیں۔''

المتنابی بازار اسی شاعر کی یاد میں ہے۔

میں کتابوں کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔یہ کتابوں کا جہان تھا۔یہاں کتابوں کی دنیا آباد تھی۔صاف ستھرے فرشوں پر بکھری ہوئیں تھڑوں پر ڈھیروں کی صورت پڑی ہوئیں تختوں پر بچھی ہوئیں۔برآمدوں کے ستونوں سے ٹکائے عارضی چوبی شیلفوں میں دھری اور بڑی بڑی دوکانوں کی شیشے کی الماریوں میں سجی ہوئیں۔

شاندار مردوں کے پرے کہیں انہیں پھرولتے، کہیں انہیں پڑھتے، کہیں بھاؤ تاؤ کرتے نظر آئے تھے۔کتنی دیر میں نے بھی انہیں دیکھا لیکن وہ زیادہ عربی میں تھیں۔فرنچ

میں تھیں جو میرے لیے بیکار تھیں۔ انگریزی میں جو چند دیکھیں وہ ایسی نہ تھیں کہ میں انہیں جھپٹ کر دبو چتی۔

میں چلتے چلی جاتی تھی۔ برآمدوں کے سایوں میں اور یہ بھی دیکھتی تھی کہ کہیں کہیں اس کے وجود کے کسی چھوٹے سے حصے پر، کہیں بڑے پر جیسے برص کے سے داغ ہیں۔ جلنے سڑنے کے ٹوٹے پھوٹے ہونے کے، شکستگی کے ہڈھالی کے۔ ایسا کیوں ہے؟ بانکپن میں یہ داغ دھبے کیوں؟ رُک کر پوچھا تو جانا کہ کوئی ڈیڑھ سال قبل بم بلاسٹ ہوا تھا۔ جاہلوں نے علم کے اِس مرکز کو تباہ کر دیا۔

لیکن پوری دنیا میں بکھرے عراقیوں کے پیغامات نے اس کے اندر نئی روح پھونک کر اِسے کھڑا کر دیا تھا۔ صفحے جو جلے تھے پھر سے زندہ ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں سج گئے۔ المتنابی کی رونقیں لوٹ آئیں۔

میری اِس خواہش پر کہ کیا وہ مجھے کسی ایسے بندے سے ملا سکتا ہے جس سے میں عراقی ادب کے حوالے سے کچھ باتیں کر سکوں۔

''ضرور ضرور'' بڑا پر جوش سا لہجہ تھا۔

''آیئے'' وہ مجھے ساتھ لیے چلنے لگا۔ کوئی چوتھائی فرلانگ پر ایک بہت بڑی دوکان کے اندر داخل ہوئے۔ اتنی بڑی دوکان تھی کہ میں حیرت سے گنگ اُسے دیکھے چلی جاتی تھی۔ لڑکا مجھے لے کر غربی سمت بڑھا جہاں چند سیڑھیاں اُتر کر ہم ایک تہہ خانے میں اُترے۔ یہ تہہ خانہ کب تھا؟ یہ بغداد کا ادبی چہرہ تھا۔ جہاں چوبی بنچوں پر دھرے خوبصورت گدّے نما کشنوں پر چند لوگ بیٹھے حقے کے کش لگاتے، بحث و مباحثے میں اُلجھے ہوئے دِکھے تھے۔ آٹھ نو کی نفری ناول نگار، صحافی اور شاعروں پر مشتمل جو ولید ال وندادوی، علی جعفر، رُسُل ال قیسی، رعید جرار، لولوا کاظم۔ جنہوں نے پرجوش انداز میں استقبال کیا،

کھڑے ہوئے ،عزت دی۔

میں نے کمرے میں نظریں دوڑائیں ۔مناسب سہولتوں سے سجا سنورا کمرہ جس کی سامنے والی دیوار پر آراستہ بڑی سی تصویر المتنابی سٹریٹ میں بچھے صوفوں پر بیٹھے وزیراعظم نورالمالکی کے ساتھ کتب خانہ الفردوس کے مالک کی تھی جو بڑا نمایاں نظر آتا تھا۔یہ سب مجھے تعارف کے وقت معلوم ہوا تھا۔تصویر کے متعلق بھی وضاحت ہوئی تھی کہ بم بلاسٹ کے بعد حکومت اور وہ سب جنہیں کتاب سے محبت تھی ۔جنہوں نے گہرے دُکھ اور یاس کا اظہار کیا تھا۔وہ لفظ کے تقدس اور اس کی حرمت کیلئے حکومت کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوئے ۔فوری کوششوں سے اس کی بحالی ہوئی ۔صرف ڈیڑھ سال میں انہوں نے اس کی رونقیں لوٹا دیں۔اور تخریب کاروں کو پیغام دیا تھا کہ تمہاری تخریب کاری نے وقتی طور پر حرف جلا ڈالے مگر دیکھو ہم نے انہیں پھر سے زندہ کر دیا ہے۔

گفتگو کے دروازے کھلنے لگے۔ادب اور آرٹ کے حوالوں سے جب باتیں شروع ہوئیں تو وہ سب گفتگو میں یوں شامل ہوئے کہ قہوے کی چسکیاں تھیں اور باتیں تھیں۔

1950 کا زمانہ ادب اور آرٹ کے لحاظ سے ایک طرح نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ادب میں مختصر کہانیوں کے رجحان نے زور پکڑا گو ابھی تک ناول بہت کم کم لکھا گیا تھا۔شاعری میں البتہ نئے رجحان سامنے آرہے تھے۔اس میں آزاد نظم نے زور پکڑا اور اپنا آپ منوایا تھا۔بہت سارے ناموں کا ذکر ہوا۔سعدی یوسف بہرحال بہت بڑا نام تھا۔میری خواہش پر اس کے نئے مجموعے ”تو ملجیا میرا دشمن“ سے رُسل ال قیسی نے شط العرب سے دو نظمیں پہلے عربی میں سنائیں ۔پھر اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔تھوڑی سی مدد رعید جبار نے کی۔

شط العرب

پہلا خواب

درد و کرب اور دکھ بھری راتوں میں
تکیہ پانیوں سے گیلا ہو جاتا ہے
اور جیسے یہ کائی کی سی بو دینے لگتا ہے
میری دائیں ہتھیلی کو
چنبیلی کی سبز ٹہنی چھوتے ہوئے
جیسے کہتی ہو
جاگ جاؤ
میں دریا ہوں
کیا تم مجھے پیار نہیں کرتے
تم بصرہ نہیں جانا چاہتے
تکیے کے پروں پر سوار
دریا اے دریا
میں جاگ گیا ہوں
میرے تکیے پر اک قطرہ پڑا ہے
جو مجھے کائی کی طرح ذائقہ دے رہا ہے
یہ بصرہ ہے

دوسرا خواب

آسمان مجھ پر سایہ فگن ہے
آسمان کے ساتھ چڑیاں بھی سایہ فگن ہیں
میرے دادا میرا ہاتھ تھامتے ہیں
ان کے چہرے پر سرخ کفایہ کا عکس ہے
ذرا فاصلے پر پانی چمکتا ہے
اور دادا میرا ہاتھ پکڑتے ہیں
آؤ تیز چلیں اس سے پہلے
کہ پرندے گھروں کو لوٹ جائیں
آؤ تیز چلیں
اس سے پہلے کہ لہریں ہمارے گھونسلے تباہ کر دے

ایک اور خواب

کوتل ال زین کے ساحلوں پر صبح کیسی خستہ دم سی ہے
میں آہواز جانے کے لیے دوسرے کنارے کی طرف تیرتا ہوں
میرے بالوں میں بارش کے موتی
ستاروں کی مانند چمکتے ہیں
کھجور کے درخت ارغوانی کلغیوں سے سجے ہیں
اور کیرون کا پانی مجھے کیسا محسوس ہوتا ہے
جیسے جیسے
بصرے کا پانی

سعدی یوسف پر اُن کی آرا کا مختصر اظہار بھی تھا۔ دراصل سعدی کی شاعری پر اِس

مختصر سے وقت میں سیر حاصل بحث تو ہو ہی نہیں سکتی۔ زسل ال قیسی نے کہا تھا۔

وہ عرب دنیا کا ایک منتخب نام جس کی زندگی کا ہر اُتار چڑھاؤ، ہر موڑ، ہر تجربہ قاری کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔یہ اتنا سارا مال و متاع اس نے عربی زبان اور لوگوں کو تحفے کی صورت دیا۔ابھی جو دو نظمیں آپ نے سنی ہیں۔ان میں مناظر رنگ، بچپن کی یادوں کی خوشبوئیں اور اس کے کرب کا اظہار نمایاں ہے۔

وطن سے جو قدم نکلا تو دوبارہ یہاں دھرنا نصیب نہ ہوا۔"تو تلجیا میرا دشمن" جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔اس کے اپنے ملک کے لیے محبت اور اپنے لوگوں کی بربادی پر ماتم کی سی کیفیات کا اظہار ہے۔لفظ آپ کو کس جہاں میں لے جاتے ہیں۔جہاں دکھوں کے الیے ہیں۔جہاں خوبصورتیوں کے چہرے ہیں۔

وہ تاریخ سے مکالمہ بھی کرتا نظر آتا ہے۔تاہم اس کی نظموں کو سیاسی رنگ نہیں دیا جاسکتا۔یہ اُس کا وہ اظہار ہے جو اس کے اردگرد موجود تھا۔اور جسے اس کی آنکھ نے دیکھا۔دل نے محسوس کیا اور اس نے اسے زبان دی۔

اگر کہیں امریکی قبضے کا ذکر ہے تو کہیں کسی جھیل میں شام کی گھلتی سیاہی کا رنگ بھی ملتا ہے۔کہیں تتلیوں کے رقص، کہیں طوفان، پانی، بے گھر لوگ۔کہیں ناامیدی اور مایوسی کے بطن سے اُٹھتی امید کی کوئی سنہری کرن خوش آئند پیغام کی آواز بنتی ہے۔

یہ بڑے پیارے لوگ تھے۔باتوں کے رسیا، قہوے اور حُقّے کے دھنی۔گہرے سیاہ قہوے کی جب تیسری پیالی میرے سامنے لا کر رکھی گئی میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا اور خود سے کہا۔

''اِسے تو میں نے چھوا بھی نہیں۔سارا حلق کڑواہٹ سے بھر گیا ہے۔ابھی چینی کی پانچ کیوبز ڈالی تھیں تو یہ حال ہے۔آفرین ہے اِن لوگوں پر جو اِسے پانی کی طرح پیتے

ہیں۔"

سچی بات ہے مجھے تو اُنکے نام بھی یاد نہیں رہنے تھے اگر وہ خود اس کا اس درجہ اہتمام نہ کرتے کہ جو بھی گفتگو میں شامل ہوتا وہ ہر بار اپنا نام اور کام دہرانا نہ بھولتا۔ جس کا فائدہ وقت کی کمی کے باوجود مجھے ہوا تھا کہ جب میں نے رات کو ڈائری میں انہیں قلم بند کیا تو وہ سب اپنے ناموں، کاموں، شکلوں اور آوازوں کی انفرادیت کے ساتھ میرے سامنے تھے اور کہیں ابہام نہیں تھا۔

پہلا شارٹ سٹوری رائٹر عبدالمالک نوری جس کا مدرسہ فکر مروجہ روایت سے بغاوت تھی۔ مختصر کہانی کے حوالے سے جس نے ادب کا یہ باب کھولا تھا اس کا لب ولہجہ علی جعفر کی نسبت زیادہ صاف، تلفظ زیادہ بہتر اور گفتگو آسانی سے سمجھ آنے والی تھی۔ رعید جبار جو خود بھی کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ وہ عبدالمالک نوری کے حوالے سے بات کرتا تھا۔ اس کا بہترین کام نشا د لارض Nashid-al-Ard۔(دھرتی کا گیت) کی صورت سامنے آیا تھا۔ اس میں سوسائٹی کے پسے ہوئے طبقوں کی عکاسی تھی۔ دراصل قانون اراضی ایکٹ نے عراقی معاشرے کی لوئر مڈل کلاس کو جسطرح زرعی غلام بنا کر رکھ دیا تھا اور اعلیٰ تعلیم اور مراعات بالائی اور درمیانے طبقے کے لیے مخصوص ہوگئی تھیں۔ اس سے بے چینی، اضطراب اور جو گھٹن پیدا ہوئی، اس کو نوری نے بہت خوبصورتی سے پورٹریٹ کیا۔ The South wind میں صدیوں کے رائج معاشرتی رویوں پر احتجاج تھا۔

اِسی طرح فہد ال تکرلی Faad-Al-Takarli میں مصنف نے اپنے آباؤ اجداد کی رسوم پر سخت نکتہ چینی کی۔

Safirah Hafiz سفیرہ حافظ نے عورتوں پر ہونے والی سختیوں اور مظالم پر لکھا۔ اس دور میں کیمونسٹ سوچ بھی اثر انداز ہوئی۔ شاعری میں یہ زیادہ کھل کر سامنے

آئی ۔جمیل صدقی الزاہوی، مہدی الجواہری، سعدی یوسف، مظفر النواب یہ سب بائیں بازو کے وہ ترقی پسند شاعر تھے جنہوں نے حقیقتاً ایک عملی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ان کی شاعری اتنی پراثر تھی کہ پوری عرب دنیا میں یہ شاعری گونجی۔آزاد نظم کے شاعروں میں ایک بہت بڑا نام نازک الملائیکہ کا بھی ہے۔جس نے عورتوں کے مسائل، محبت اور عورتوں کی آزادی پر کھل کر جی داری سے لکھا۔

نازک الملائیکہ سے میرا تھوڑا بہت تعارف ضرور تھا مگر رُسُل ال قیسی اُس کا بہت مدّاح تھا اتنا کہ بدر سے بھی زیادہ اُسے سراہتا تھا۔

بدر شاکر اسیاب کا نام بھی بڑا اہم ہے۔اس کی شاعری کے بہت سے مرحلے تھے۔ابتدائی دور اگر رومانوی تھا تو حقیقت پسند شاعر بن کر اس نے کمال کی شاعری کی۔بدر کے ہاں انقلابی ذہنیت تھی۔انہوں نے شاعری کے مروجہ اصولوں اور ان کی بندشوں سے آزاد ہو کر لکھا اور خوب لکھا۔

بدر اور نازک الملائیکہ پر باقاعدہ بحث چھڑ گئی تھی۔اسی طرح ال شعیب کے ہاں موضوعات کا تنوع تھا۔عربوں کے اندر اپنے مستقبل بارے پائی جانے والی بے چینی اور اضطراب، اُن کی جہالت، سادگی اور انہیں ملنے والے دھوکے اور ان پر مغربی تہذیب کی یلغار۔شعیب نے ان احساسات کو بہت خوبصورت زبان اور ادائیگی دی۔

اگر یہاں عبدالوہاب البیاتی کا ذکر نہ کیا جائے۔رُسُل ال قیسی کا لہجہ خاصا جوشیلا تھا تو عراقی شاعری کا باب ادھورا رہے گا۔سوشلسٹ نظریئے کا شاعر جس نے مظلوم اور نچلے طبقے کو جھنجھوڑا مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی عرب شناخت پر بھی زور دیا۔

Exile From Exile کا بھی پڑھنے سے تعلق ہے۔آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اسے پڑھتے ہوئے کہ عربوں کو کیسے دربدر اور دیس بدر دکھایا ہے۔

صوفے کے آخری کونے پر بیٹھے لولوا کاظم بھی اچھا بولنے والے انسان تھے۔صاحب علم تھے مگر یہودیوں سے بہت متاثر لگتے تھے۔مجھے تو گمان گزرا تھا کہ شاید یہودی ہیں۔اور میں نے پوچھ بھی لیا تھا وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''ہوں تو نہیں مگر متاثر ضرور ہوں۔''

اِس دوپہر اور شام کی شکر گزاری کہ سعدی یوسف کے ساتھ میں نے عراق کے اور بھی قابل فخر ادبی چہرے دیکھے۔

دو دن بعد کی ایک شام بغداد کی شہرہ آفاق ال شابندر کافی شاپ جانا ہوا۔ال شابندر کافی شاپ کی کھڑکیوں سے دجلہ لشکارے مارتا تھا۔دومنزلہ عمارت بالکونیوں اور آہنی چھجے دار شیڈوں کے ساتھ کونے پر کولائی کی صورت پھیلی ہوئی تھی۔

موجودہ ملکی صورت پر تھوڑی سی بات چیت کے بعد یوسف سعدی زیر بحث آگئے۔علی ایاد کوئی چالیس کے ہیر پھیر میں ایک دلکش شخصیت جس کی انگریزی بڑی شستہ سی تھی نے بعض پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔

صدام کے زمانے میں اُن کی جلاوطنی خود ساختہ تھی۔وجہ خوف تھا۔مارے جانے کا۔ایک بار نہیں صدام نے کئی بار مظفر النواب اور سعدی کو لکھا۔

''عراق تمہارا منتظر ہے۔تم لوگ ملک کا بیش قیمت سرمایہ ہو۔واپس آؤ کہ ملک تمہارے لیے بہت کچھ کرنے کا خواہش مند ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اگر آتے تو انہیں اعزازات اور انعامات سے ضرور نوازا جاتا مگر چیونٹی کی طرح مسل بھی دیا جاتا۔وہ نہیں آئے۔اچھا ہوا۔انہوں نے جو لکھا وہ ہم نے ہی نہیں پوری دنیا نے پڑھا۔

پھر انہوں نے بہت سی نظموں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سنائے۔''شکریہ تمہارا

امراءالقیس " کیا خوبصورت شہ پارہ نظم تھی۔ پھر "روانگی" سُنی ۔

جلد ہی
سب کمرے بند کر دیئے جائیں گے
آغاز تہہ خانے سے ہو گا
ہم ان کے پاس سے گزرتے جائیں گے
ایک کے بعد ایک
حتیٰ کہ ہم بندوقوں تک پہنچ جائیں گے
پھر
انہیں بھی چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں گے
جیسے ہم نے پہلے کمروں کو چھوڑا تھا
اور چلتے جائیں گے
اپنے خون میں تلاش کرتے ہوئے
یا پھر اپنے نقشوں میں
نئے کمروں کے لئے

☆☆☆

ابونواس

عربی ادب کا عظیم کلاسیکل شاعر

- ہمارے عہد کے مفکر، دانشور، شاعر اور ادیب زیادہ لبرل تھے۔
- دانتے کی ڈیوائن کومیڈی دراصل ابوالعلا المعری کی رسالت الغفران سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔
- نویں صدی کی عرب عورتوں کی روشن خیالی اور دانشوری آج کی عورت کیلئے قابل تقلید ہے۔
- اپنے وقت کا ایک عظیم کلاسیکل شاعر ابو نواس روڈ پر مجھ سے ہم کلام تھا۔

ایک میں کیا بغداد کے بیشتر شعرا اور لکھاری بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عرب دُنیا کی اکثریت کا یہی انداز تھا۔ چلو ابنِ راوندی کو چھوڑو تمہارا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ ولادہ بنت المستکفی کی شاعری کا تو جائزہ لیا تھا۔ تمہیں پتہ چلتا نویں صدی کی عورتوں کی روشن خیالی اور دانشوری کا۔ ابو العلاء المعریٰ کو پڑھنا تھا۔ اس کے ہاں اگر شہوانیت نہیں مگر مذہب پر تنقید ہے۔ خدا پر ایسی نکتہ چینی ہے کہ تم جیسے چھوٹے ذہن کے لوگ پل نہ لگائیں اور مُرتد اور کافر کے فتوے دائر کر دیں۔ جنت اور جہنم کے پسِ منظر میں لکھی گئی اُس کی مشہور نظم ''رسالت الغفران'' کہ جس سے دانتے نے متاثر ہو کر ڈیوائن کامیڈی لکھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے رکا۔ ایک خوبصورت سنہری بالوں اور شربتی آنکھوں والے بچے نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔ تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ہمارے عہد کے مفکر، دانشور، شاعر اور ادیب زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ تم لوگوں کی نسبت زیادہ روشن خیال تھے۔

ابونواس

بغداد کی رات کے اِس پہلے پہر جب میں دجلہ کے پانیوں میں ڈوبی روشنیوں کے عکس، کہیں اُن سے بنتے کہکشاں جیسے راستے، کہیں چمکتے دمکتے چھوٹے چھوٹے کولے سے پانیوں میں مستیاں کرتے، کہیں قریبی ہوٹلوں کی روشنیاں ستاروں جیسے روپ لئے پانیوں میں اُتری ہوئیں، کہیں ننھے منے قمقمے جلتے بجھتے دیکھتی اوران کے لحہ بہ لحہ بدلتے رُوپ اور صُورتوں کے تحیر میں گُم تھی۔

مجھے تو معلوم بھی نہ ہوا تھا کہ کب ایک وجیہہ عراقی بوڑھا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔اُسکا روایتی لباس، اُس کی مخمور آنکھیں، اُسکی سنہری رنگت، اُسکا بانکپن سبھوں نے میری توجہ کھینچ لی تھی۔میں نے قدرے حیرت اور استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا تھا اور اُس کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہشمند ہوئی۔

یقیناً آنکھوں کی زبان اُس نے پڑھ لی تھی۔گھن گرج سی تھی لہجے میں جب بولا تھا۔

''میرے نام سے منسوب جدید بغداد کی اِس اہم شاہراہ ابونواس پر تم کس ٹھسے سے بیٹھی ہو۔اور تم نے نہ مجھے یاد کیا، نہ خراج تحسین پیش کیا۔حد ہوگئی ہے دجلہ کے فراق میں ہی گُھل رہی ہو۔''

''اوہو''میں مسکرائی تھی اور سمجھ بھی گئی تھی کہ میرا مخاطب کون ہے؟

''کمال ہے جب سے یہاں آکر بیٹھی ہوں آپ کے ہی خیال میں تو گم ہوں۔''

شاعر کی جوانی ،اُس کے دلکش خدوخال ،اُس کی شہابی رنگت اور سنہرے بال اگر تب راہ چلتے لوگوں کو متوجہ کرتے تھے تو بڑھاپا بھی کم شاندار نہ تھا۔شاہوں جیسا بانکپن تھا اُس میں۔

سچی بات ہے وجاہت تو آنکھوں میں کُھب گئی تھی۔مرعوبیت نے وضاحت بھی فوراً ہی کرنی شروع کردی تھی۔

''لو میں نے تو جب عراق آنے کا قصد کیا۔عراق سے متعلق لٹریچر اور معلومات کے جھمیلوں میں اُلجھی ۔تم تو اُسی دن سے میرے سامنے آگئے تھے اور میرے ساتھ رہنے لگے تھے۔اور یہ بھی تھا کہ میں ابونواس روڈ پر دجلہ کے کنارے بیٹھ کر تم سے لمبی چوڑی باتیں کرنا چاہتی تھی مگر یہ اِتفاق مجھے مچھلی کے چکروں میں ڈالے ہوئے تھا۔اب تھوڑی سی تفصیل تم بھی سُن لو تا کہ تمہارا گلہ کچھ دور ہوسکے۔

''مچھلی کھلائی ہے آپ کو'' اُس نے گاڑی ایک جگہ پارک کردی تھی۔

''مچھلی''بلڈ پریشر کا بھُوت میرے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

میرے اظہار پر وہ من موہنا سالڑ کا ہنس پڑا تھا۔

''دجلہ کے کنارے بیٹھ کر مچھلی نہ کھائی تو بغداد آنے کا فائدہ۔میں ہلکے نمک کے ساتھ بنانے کا کہوں گا۔''

تو پھر AL MAZGOUF فش ریسٹورنٹ میں آگئے۔ یہ تمہاری ابونواس روڈ ڈانس کلبوں اور کیسنو کیلئے بھی بڑی شہرت رکھتی ہے۔

یہاں دجلے کے کنارے کنارے دُور تک چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ عمارتیں، ہوٹل اور صفائی سُتھرائی کا معیار تو بس اوسط درجے کا ہی ہے لیکن روشنیوں، دجلہ، گھاس کے لان، درختوں کا پانی میں جھکاؤ، ماحول اور لوگوں کے اُبلتے سیلاب نے اِنہیں خاص بنا دیئے ہیں۔ اندر باہر طوفان سا برپا ہے اور لگتا ہے جیسے پانیوں کے اوپر ایک جہاں آباد خود میں گُم ہے۔

ایک کونے میں شطرنج کھیلی جا رہی ہے تو ذرا آگے تاش کی بازی جمی ہوئی ہے۔ فضا میں کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں۔ بچوں والے لوگ ہیں تو محبتوں اور یاریوں والے بھی بہتیرے ہیں۔ شیشہ پینے والے کس مزے سے بیٹھے حقہ پیتے اور موسیقی پر سر دھنتے ہیں۔ موسیقی بہت اونچی پر دلنوازی ہے۔

عراقی موسیقی میسوپوٹیما موسیقی اور عرب موسیقی کا دل کش امتزاج ہے جس پر ایرانی روایتی موسیقی نے بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ یہ افلاق نے مجھے بتایا ہے ابھی۔

یہ عود Oud بج رہا ہے اور یہ مشہور عوڈسٹ Oudist احمد مختار ہے۔

تالاب کے کنارے کھڑا افلاق کچھ بات کرتا ہے۔ میں بھی پاس چلی گئی تھی۔ مچھلیوں کی تو بہار لگی پڑی تھی۔ چھلنی سے تین نوعمر لڑکے گاہکوں کے بتانے پر مچھلیاں پکڑ پکڑ کر اِس زور سے فرش پر مارتے تھے کہ بیچاریوں کو شاید سانس لینا بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔

چاقو سے پیٹ چاک ہوا۔ گند مند نکلا پھر مچھلیاں لوہے کی سلاخوں میں پرو کر کونے میں بنے لکڑیوں کے آلاؤ کے گرد کھڑی کر دی گئیں۔

اور جو لڑکا شیف کا کام کرتا ہے بڑی شان ہے اُس کی بھی۔ پینٹ قمیض پہنے

ایپرن چڑھائے، وجاہت والا جیسے شیف نہ ہو آرٹسٹ ہو۔

''زندگی تو کھانے کیلئے ہے'' جیسے خیال رکھنے والوں کیلئے تو یہ لوگ آرٹسٹ ہی ہیں۔بیٹھنا میں نے وہاں چاہا تھا ''جہاں تیرا نظارہ درمیان میں'' والی بات ہو بغداد میں دجلہ سے بڑا ''تیرا'' بھلا کون ہو سکتا ہے۔یوں یقین ماننا تمہارا خیال بھی تو ساتھ ساتھ ہی تھا۔

ہاں یہ بات بھی تمہارے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں کہ پاکستان میں جو کچھ تم پر پڑھا وہ ادب کے حوالوں سے تو بہت اہم تھا۔مگر مجھ جیسی کچھ تنگ نظر،تھوڑی بہت روایات کی اسیر، کچھ ماڑے موٹے اخلاقیات کے بندھنوں میں جکڑی عورت کیلئے بظاہر کچھ اتنا پسندیدہ نہ تھا۔کہیں رسوائے زمانہ نظروں سے گزرا۔کہیں مذہبی اقدار کا باغی اور کہیں شہوانیت کا مارا ہوا۔پر اندر کی بات بتاؤں کہ میں نے بھی چسکے لے لے کر تمہیں پڑھا اور اپنی ادبی سہیلیوں کو بھی تمہارے شہہ پارے سنائے۔روشن خیال اور ترقی پسند عورتوں نے تمہیں جی بھر کر سراہا۔

خیر لونڈے تو تمہاری شاعری کا ایک مستقل مزاج حصہ ہیں۔ایک ایسی نظم جسمیں عقیدے اور مذہب کی بھی جھلک ہے وہاں یہ دیوانگی کفر کی حد تک چلی جاتی ہے۔پھڑ پھڑ کرتی شاعری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی ہے۔

گزشتہ جمعہ کی شب
اچانک میرا ٹکراؤ ایک ہجوم سے ہوا
ہزاروں لاکھوں لوگ پاگلوں کی مانند
چیختے چلاتے تھے
تو یہ روز جزا تھا

اللہ کے پاس جانے کا

ہمارا وقت آخر

جیسا کہ تمام پیغمبر کہتے ہیں

دنیا کے خاتمے کی علامت

نصب شب کا سورج

یہی ہے وہ

ہم کانپ رہے ہیں

ہمیں اعتراف ہے

میں تو ہنسا تھا اور

میں نے کہا

ارے یہ کب سورج ہے

جو ستارے کی طرح طلوع ہوا ہے

بھئی

یہ تو میرا دوست احمد ہے

جس کی موجودگی

اور جس کے بلوری قدموں کے نشان

مخملی چھپر کھٹ کو روشن کرتے ہیں

جس کے ماتھے پر ستارہ چمکتا ہے

جس کے گالوں پر وینس پھوٹتی ہے

دیر تک میں اس نظم کے حصار میں قید رہی تھی تمہاری علمیت کی داد نہ دینا کتنی

زیادتی کی بات ہوتی میں نے بے اختیار داد دی تھی۔ تمہیں سراہا تھا۔ رومنوں کی پیار و محبت کی دیوی وینس مجھے بھی بڑی پسند تھی۔

تمہاری ایک اور نظم میں پڑھتی ہوں۔ کہنا چاہتی ہوں۔ ابو نواس تمہاری اس نظم کو پڑھتے ہوئے میرے اندر کے شیطان نے اگر چسکہ لیا تھا تو خیر کے تربیت یافتہ پہلو نے فطرت کی خلاف ورزی پر احتجاج بھی کیا تھا۔

آمادگی پر مائل لڑکے سے مجھے پیار ہے
ایک خوبصورت، پروقار، خطرناک، غزال
جس کی پیشانی نقاب میں چھپے چاند جیسی
کوئلے جیسے سیاہ اور بادلوں جیسے گھنے بال
جو اپنے زیر جامے میں کاہلی سے پلٹے مارتا ہے
نہ زیورات کا کوئی مطالبہ
اور نہ ہی پرفیوم کے لئے کوئی تقاضا
نہ کبھی چیتھڑوں سے کپڑوں میں نظر آتا ہے
اور نہ ہی کبھی حاملہ ہوتا ہے

ایک شام جب میں تمہاری ایسی ہی نظمیں پڑھتے ہوئے جہاں تم نرم و نازک لطیف سے جذبات پر بہتے بہتے گندگی کی پاتال میں اُتر جاتے تھے۔ میں نے بے اختیار ہی اُس وقت ہاتھوں میں پکڑے نظموں کے پلندے کو دراز میں گھسیڑ دیا تھا کہ میرا بڑا بیٹا غضنفر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ عالمی ادب کے قدیم و جدید شعرا اور ادیبوں سے شناسا اپنے اس بیٹے سے میں نے تم پر بات نہیں کی تھی۔ مجھے شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔ تم خود بھی تو سوچو نا۔ اب تم جب کہتے ہو

لڑکو آؤ سیدھے میری طرف

میں عیش و عشرت کی ایک کان ہوں

مجھے کھودو

پرانی مدہوش کرنے والی شراب

خانقاہوں میں راہب ہی تیار کرتے ہیں

شیش کباب، بھنے ہوئے مرغ

کھاؤ، پیو اور موج میلہ کرو

اور بعد ازاں

تم میرے ٹول کو

شمپو کرنے کیلئے آسکتے ہو

اور پھر ایسے ہی ایک دن میں نے زچ آکر انہیں بیچ دیا اور خود کو لعن وطعن کرتے ہوئے اپنے اندر کوڑ پٹا۔

''بہت ہو گیا۔ بہت ہو گیا علموں بی بی بس کر اب۔ تھوڑی دیر کیلئے اِس موضوع سے ہٹ کر اُس کی شاعری کی اور خوبصورت پرتیں دیکھ۔ لونڈے بازی پر ہی تیری سوئی اٹک گئی ہے۔

''ابونواس''

میں نے کرسی کی اگلی ٹانگوں پر زور ڈالتے اور پچھلی کو اٹھاتے ہوئے خود کو اُس کے قریب کیا۔

''مجھے یقیناً اپنی خوش قسمتی پر رشک آ رہا ہے کہ آٹھویں صدی کے وسط اور آخری دہائی کا عربی کلاسیکل شاعری کے ایک بہت بڑے نام کا حامل شاعر ابونواس نے مجھے شرف

ملاقات بخشتا ہے اور میرے پاس آ کر بیٹھا ہے۔"

"ابونواس"

میں کچھ جھجھکی تھی۔

"کہو۔جو کہنا چاہتی ہو۔تم ایک دبنگ بندے کے سامنے بیٹھی ہو۔"

"ابونواس میں گنہگاری کچی پکی مسلمان عورت تمہاری شاعری کا جو ورق پھرولتی تھی وہی مجھے مایوس سا کرتا تھا۔ابونواس میں جاہل سی محدود سے ذہنی افق کی مالک تمہاری شراب اور شراب نوشی،لونڈے بازی،پھکو بازی اور خدا سے مخول بازی کو اس طرح ہضم نہ کرسکی جیسے شاید باقی لوگ کرتے ہوں گے۔اب میں بھی کیا کروں تم خمریات(K h a m r i y y a t)(شراب نوشی) مدحققارات(M u d h a k k a r a t)(لونڈے بازی) اور مجنیات(Mujuniyyat)(کفر بکنے والا)کے چکروں سے ہی نہیں نکلتے تھے۔

شاعری کا سارا تانا بانا تو ان ہی موضوعات کے گرد لپٹے رہے۔"

"بس تو اتنا سا علم لے کر بیٹھی ہو۔"

ابونواس نے اپنے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کو مضبوطی سے ایک دوسرے سے جوڑتے ہوئے درمیان میں معمولی سے خلا کا راستہ بھی بند کرتے ہوئے گہرے طنز سے کہا۔

"ایک میں کیا بغداد کے بیشتر شعرا اور لکھاری بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عرب دُنیا کی اکثریت کا یہی انداز تھا۔چلو ابنِ رواندی کو چھوڑو تمہارا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔

ولادہ بنت المستکفی کی شاعری کا تو جائزہ لیا تھا۔تمہیں پتہ چلتا نویں صدی کی عورتوں کی روشن خیالی اور دانشوری کا۔ابوالعلاء المعریٰ کو پڑھنا تھا۔اس کے ہاں اگر

شہوانیت نہیں مگر مذہب پر تنقید ہے۔ خدا پر ایسی نکتہ چینی ہے کہ تم جیسے چھوٹے ذہن کے لوگ پل نہ لگائیں اور مُرتد اور کافر کے فتوے دائر کردیں۔ جنت اور جہنم کے پسِ منظر میں لکھی گئی اُس کی مشہور نظم ''رسالت الغفران'' کہ جس سے دانتے نے متاثر ہوکر ڈیوائن کامیڈی لکھی۔

وہ چند لمحوں کے لئے رکا۔ ایک خوبصورت سنہری بالوں اور شربتی آنکھوں والے بچے نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔ تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ہمارے عہد کے مفکر، دانشور، شاعر اور ادیب زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ تم لوگوں کی نسبت زیادہ روشن خیال تھے۔

وہ تمہارے محبوب فارسی کے شُعرا عُمر خیاّم اور حافظ جن کی شاعری پر تم جیسے لوگ سر دُھنتے ہیں۔ میرے ہی تو جانشین ہیں۔ میری روایات کے امین ہیں وہ۔ یونانی اور رومی شاعروں کو پڑھو۔ دنیا کے فلاسفروں اور دانشوروں کا مطالعہ کرو۔ انکے کام بھی میرے جیسے ہی تھے۔

سچی بات ہے اگر یہ طعنہ نہ بھی ملتا تب بھی مجھے اپنے سطحی سے علم کا بخوبی احساس تھا۔ میرے ہاں دعویٰ تو سرے سے ہی نہیں تھا۔ دعویٰ تو سراسر جہالت ہے۔

میں نے اپنے اِن جذبات کا اظہار بڑے نرم اور شائستگی و متانت میں ڈوبے لہجے اور انداز میں کیا۔ تھوڑا سا زور اس بات پر بھی دیا کہ شاعری کی بہت ساری اصناف میں شاعر کس میں زیادہ گہرائی کے ساتھ سامنے آیا ہے اِسے پرکھنا تو یقیناً نقادوں کا کام ہے۔ عام قاری تو لُطف کیلئے پڑھتا ہے۔

تاہم تاریخ میں درج یہ سچائی اور حقیقت بہت کُھل کر سامنے آئی ہے کہ تمہارے علم کی وسعت بے پایاں، تمہارا حافظہ قوی اور یادداشت غیر معمولی تھی۔ تمہارے عہد کے

نقادوں کی رائے بشمول ابو حاتم المکی

''کہ ابو نواس کے ہاں عمیق گہرائی اور سطحی پن دونوں ہیں۔ابو نواس اگر خود اس کا اظہار نہ کرے تو بسا اوقات سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

یوں تمہاری جی داری اور حوصلے کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ابو العتاہیہ جیسا صوفی خدا پرست شاعر مقابلے پر ہو اور مذہبی لوگوں کی جماعتیں بھی تمہارا تیا پانچہ کرنے پر تُلی رہتی ہوں تب بھی تم کہتے تھے۔

سرور ملتا ہے مجھے
اُن کاموں کے کرنے سے
جنہیں روکتی ہے مقدس کتاب
میں گریزپا ہوں اُن سے
جن کی اجازت دیتی ہے الہامی کتاب

بغداد کے کوچہ و بازار میں اگر ابو العتاہیہ کا صوفیانہ کلام گونجتا تھا

کھا سوکھی روٹی کا ٹکڑا
پی ٹھنڈے پانی کا پیالہ
تنہا بیٹھ اور غور کر
مقصد حیات کو سامنے رکھ
یہ چند گھڑیاں بہتر ہیں
بلند و بالا محلات میں شاہوں کے حضور بیٹھنے سے

وہیں تجھ سے محبت کرنے اور تیرے چاہنے والے تجھے یوں گنگناتے اور گاتے تھے۔

''ابونواس۔''

فائدہ اٹھا اپنی جوانی سے

جان لے یہ باقی نہیں رہے گی

صبح و شام کی شرابیں ملا

نشے کا لطف اٹھا

اور مخمور ہو

''چچ چچ چچ۔''

ایسا طنزیہ اور تمسخرانہ انداز تھا۔نگاہیں جو چہرے پر جمی تھیں وہ ان احساسات سے لبالب بھری تھیں۔بڑی خفت سی محسوس ہوئی تھی۔ایک تو گرمی اوپر سے شرمندگی۔مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

''اندھا تھا ابوالعتاہیہ۔اندھے زندگی بسر کرتے ہیں۔گزارتے نہیں۔میں نے زندگی اُس کے حُسن ورنگوں کے ساتھ بھرپور انداز میں گزاری ہے۔کوئی بار بار ملنے والی چیز تھی یہ۔''

میں خاموش ہوگئی تھی۔یقیناً میں اُس وقت اُسے وہ سب نہیں سُنانا چاہتی تھی جو میرے قلب و ذہن میں شور مچائے جاتا تھا۔چاند چہرے جیسے لڑکے، ان کے مرمریں بدن،زیرجاموں کی نزاہت اور اس کے جاندار بوسے۔

''ابونواس زمانہ قدیم سے جدید تک دنیا بھر میں شہرت کے اعتبار سے مقبول ترین کئی ایک الف لیلوی کہانیوں میں تمہاری حس ظرافت،تمہارا مزاح اور تمہاری ذہانت بہت دلنشین انداز میں سامنے آئی ہے۔اپنی کوئی ایسی ہی کہانی آج کی رات دجلہ کے کنارے مجھے سناؤ۔

ابونواس کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا۔

''یہ الف لیلوی کہانیوں کا عشق ابھی بھی قائم ہے؟''

''لو کیسی بات کرتے ہو کہانیوں کا عشق بھی کبھی مرتا ہے۔''

چلئے کہانی شروع ہوئی صیغہ غائب میں۔

ابونواس بہت چالاک ہوشیار آدمی تھا۔خلیفہ نے اُس کی چالاکیوں کے بارے میں سُنا۔ہوشیاریوں کے متعلق جانا۔غیر معمولی ذہین اور فطین آدمی ہے۔درباریوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے۔

''پیغام بھیجو اُسے۔خلیفہ ملنا چاہتا ہے۔فوراً لیکن اُسے بتا دو کہ وہ میرے پاس اُس وقت نہ آئے جب سُورج چمکتا ہو۔اور جب اندھیرا ہو تب بھی نہیں۔

ہاں اُسے بتاؤ کہ اُس نے میرے پاس اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے نہیں آنا ہے اور نہ ہی اُسنے کسی جانور پر سوار ہو کر آنا ہے۔

اور ہاں یہ اُس پر واضح کردو کہ اگر اُس نے میرے ممنوع کردہ کسی بھی طریقے کو اپنایا تو بس پھر جلاد اُسکا گاٹا اُتارنے کو تیار بیٹھا ہے۔

وہ آئے جلد اور بہت جلد۔''

اب ابونواس نے جالی کا بڑا سا بیگ لیا۔اس میں بیٹھا۔یار بیلیوں سے کہا اسے اونٹ کی گردن سے رسے کے ساتھ لٹکا دو۔یوں وہ جُھومتا جھامتا ایک ایسے وقت میں جب آسمان پر ہلکے سے بادل تھے اور ہلکی ہلکی بارش تھی خلیفہ کے پاس پہنچ گیا۔خلیفہ اُسکی ہوشیاری پر حیران رہ گیا تھا۔

خلیفہ تو حیران تھا ہی۔اکیسویں صدی کی یہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی عورت بھی حیران تھی۔ماحول کے رنگا رنگی نے چند لمحوں کیلئے توجہ بانٹ لی تھی۔پلٹی تو دیکھا کہ اُس

کی مخمور آنکھیں جیسے یادوں کے جوار بھاٹے میں ہچکولے لے رہی تھیں۔ذرا سا رخ پھیرنے پر ہی سبب جان گئی تھی۔افلاق نے سامنے ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سنیئے انہیں۔علی ال الزاوی Ali Al Essawi۔اس کا یہ گانا پوری عرب دنیا میں ہٹ ہوا ہے۔

مکام Maqam جیسے سریلے شریں دل کی دنیا زیروزبر کرنے والا آلات موسیقی اور مکتوبہ Makhtooba جیسا گیت۔لوگ جھوم رہے تھے۔من چلوں کی سیٹیاں تھیں۔ہیجان تھا۔پر میں دیکھتی تھی ابونواس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے خفیف سے رنگ تھے۔

میں سمجھ گئی تھی علی ال الزاوی کی پرفارمنس پر ناک بھوں چڑھی تھی۔

پھر جیسے وہ خوابناک سی آواز میں بولنا شروع ہوئے۔

"ہمارا نوجوان زُلزل عود Oud بجاتا تھا تو گلیوں میں چلتے لوگوں کے قدموں کو زمین جکڑ لیتی تھی استادوں کا استاد جس نے بے شمار راگنیوں کو ایجاد کیا۔اسحاق اُسی کا شاگرد تھا اور اُس میرے ہم عصر ابراہیم موصلی کے گانے پر تو پرندے پھڑ پھڑاتے ہوئے نیچے گرتے تھے۔دجلہ کا پانی ساکت ہو جاتا تھا۔ہوائیں چلنا بھول جاتی تھیں۔اُس کی انگلیوں کی پوروں سے سُر پھوٹتے تھے۔راگنیاں جنم لیتی تھیں۔وہ سُر اور گلے کا بادشاہ تھا۔"

ہمارے سامنے چلتے ٹی وی کی آواز کسی نے اونچی کر دی تھی۔توجہ منعطف ہو گئی۔

بھرے بھرے گالوں اور موٹی آنکھوں والی ایک مغنیہ مریم فارس سامنے تھی۔کیا طرحدار لڑکی تھی۔شانوں پر بکھری گھنگریالی زلفوں پر کہیں شام کی لالیوں کا گمان پڑتا تھا۔نیم عریاں جسم اور اداؤں کا بانکپن۔

میں نے چہرے کے تاثرات سے یہ جانا تھا کہ اُن آنکھوں میں نئے رنگ و آہنگ کو دیکھنے کا شوق ضرور تھا پر گیت کی شاعری کے معیار پر اعتراض تھا۔

''زبیدہ والا قصہ نہیں سنائیں گے۔''

زوردار قہقہہ فضا میں گونج گیا تھا۔

''میری دُکھتی رگوں پر آپ کی انگلیاں ہیں۔''

''بخدا نہیں۔''

میں بھی ہنس پڑی تھی۔

''دن تو موسم بہار کی رتوں والے تھے۔کونپلیں پھوٹتی تھیں اور دجلہ بہت گدلا گدلا سا تھا۔پانی کے بہاؤ نے اس سال ابھی سے ہی آخری کناروں کو پچھاڑنا شروع کر دیا تھا۔

شام کی سنہری کرنوں میں خلیفہ کا محل، دجلہ کے پار برامکیوں کے شاندار محل فن تعمیر کے وہ نادر نمونے کہ جو بندے کو رُک کر دیکھنے پر مجبور کرتے تھے۔باغ میں دنیا جہاں کے درختوں کی نادر اقسام، کیاریوں میں کھلے سینکڑوں اقسام کے پھولوں کی مہکار، جھاڑیوں کی قطع برید، کہیں سانپوں، شیروں، چیتوں، موروں کی صورت باغبانوں کی فنکاری کے عکاس، گھاس کے قطعوں میں موتی بکھیرتے حوض جن میں ناچتی مچھلیاں۔دجلہ کے اوپر مرغابیوں کی ڈاروں کو پر پھڑپھڑاتے ہوئے قطاروں کی صورت اڑتے شام کی زرنگار کرنوں میں دیکھنا۔واللہ کسقدر دل خوش کن منظر تھا۔

میں خلیفہ کے بُلاوے پر اُن سے ملاقات کیلئے آیا تھا اور چند لمحوں کیلئے رُکا تھا۔ بالکونیوں سے باہر کے منظر جیسے چوکھٹوں میں نصب تصویروں کی مانند مجھے دِکھے تھے۔

کمرے میں تنہائی تھی۔نبیذ سے بھری صراحی اور فواکہات کی سینی سامنے تھی۔میں نے مزاج شاہی کی افسردگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”واللہ امیر المومنین آپ بھی کیا چیز ہیں؟ فردوس بریں میں رہتے ہیں۔ ذرا نگاہ اٹھا کر تو دیکھیے۔ باہر کے منظر اُمنگیں جگانے اور جذبات اُبھارنے والے ہیں اور آپ ہیں کہ ملول بیٹھے ہیں۔“

میں نے اپنا تازہ کلام سنایا اور کہا۔

”جعفر برمکی نے کنیز خریدی ہے۔ چہرہ جس کا تُرک شہزادیوں کا سا، جسم رومی نازنینوں جیسا، نین حجازی دوشیزاؤں اور کمر یمنی مُیاروں جیسی ہے۔ حضُور اس گناہ ثواب کے چکروں کو چھوڑیئے۔ یہ دو روزہ زندگی ہاتھ سے گئی سو گئی۔ لُطف اٹھایئے۔ شراب سے، شباب سے اور سے کی ساعتوں سے۔

ابراہیم موصلی اور ابنِ جامع کو بلوائیں۔ راگ و راگنیوں سے دل بہلائیں۔ پری چہرہ نازنینوں سے اپنی راتوں کو آباد اور شاد کریں۔“

خلیفہ کی افسردگی دُور ہوئی۔ مُسکرایا، ہنسا اور شاد کام ہوا۔

میں گھر لوٹا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دستک ہوئی۔ سمجھا کہ غلام خلیفہ کی جانب سے انعام و اکرام لے کر آئے ہوں گے۔

کُنڈی کھولی۔ غلاموں کی ایک لام ڈور تھی جو دروازے کو دھکے مارتی اندر آئی۔ مجھے پکڑا۔ وہ پٹائی کی کہ چارپائی پر پڑنے اور تیل ہلدی لگانے والی بات ہوگئی تھی۔

معلوم ہوا کہ ابونواس کے محل سے نکلتے ہی زبیدہ خاتون غُصّے سے لال پیلی ہارون کے کمرے میں آئی اور پوچھا۔

”ابونواس آپ سے کیا باتیں کرتا تھا؟“

زبیدہ بڑی زبردست اور ڈاڈھی ملکہ تھی۔ خلیفہ تو پل بھر میں ہی منکر ہوگیا۔ وہ بپھری۔

''امیر المومنین کمال کرتے ہیں۔میں نے خود اپنے کانوں سے اُسے تمہیں بہکاتے اور گناہ کی ترغیب دیتے سُنا۔تم سے اتنا نہ ہوا کہ اُسے پھٹکار دو اور نہیں تو ڈانٹ ڈپٹ دو۔''

ہارون ہنسا۔''بھئی زبیدہ سچی بات ہے۔ایسی اچھی اچھی باتوں پر ڈانٹنے کا کیا کام۔''

اور زبیدہ نے اپنے ملازموں سے ابونواس کو ایسی چھینٹی لگوائی کہ بیچارہ دو ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔

مجھے مزہ آیا کیونکہ ایک خوبصورت قہقہہ فضا میں دیر تک گونجا۔

خلیفہ کو ایک دن پھر میری ہڑک اٹھی۔بلا بھیجا۔ایسی خستہ حالی دیکھی تو پوچھا۔

''ابونواس تمہیں کیا ہوا؟ بیمار تھے کیا؟''

''امیر المومنین بس کچھ مت پوچھیے۔''

میں ساری بات چھپا گیا کہ میں نے دونوں کمروں کے بیچ دروازے میں رکھے چوبی پردے کے پیچھے جان لیا تھا کہ وہاں کون ہے؟

''ہاں ابونواس اُس دن کی طرح کچھ مزے مزے کی باتیں ہو جائیں۔کچھ ذکر پری پیکروں اور پری وشوں کا کہ طبیعت اُداس ہے۔تمہاری باتوں سے شاید راحت و سرور نصیب ہو۔''

''ہاں تو امیر المومنین اُس دن میں آپ کو بتا رہا تھا کہ عربی میں ایک کہاوت ہے کہ جس کی دو بیویاں اُس کی کیا زندگی؟ اِدھر جھوٹ اُدھر جھوٹ۔اِدھر کچھ اُدھر کچھ۔جس کی ہوں تین بیویاں وہ بیچارہ تو گویا دُکھوں کی سان پر چڑھ گیا۔اور جس نے کی چار وہ بنا مظلوم۔نہ زندوں میں نہ مُردوں میں۔

تو امیر المومنین میں نے تو دنیا کو دیکھتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بیوی بس ایک ہی، دل کی وہی رانی۔"

ہارون الرشید نے پہلے تو حیرت سے آنکھیں پھاڑیں پھر چیخا۔

"ابونواس تم بکواس کرتے ہو۔قسم لے لو مجھ سے جو تم نے اُس دن ایک بھی ایسی بات کی ہو۔"

"امیر المومنین' ابونواس عاجزی سے جھکتے ہوئے بولا۔

"آپ کو میری باتیں بھول گئی ہیں شاید۔میں نے اُس دن آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ بنی مخزوم قریش میں افضل ترین زبیدہ خاتون دختر قاسم اُس قوم کے خوشنما پھولوں میں سے سب سے حسین پھول۔اُس دن مجھے محسوس ہوا تھا کہ آپ کا دل دوسری عورتوں کی طرف مائل ہے۔میں آپ کو سمجھانا چاہتا تھا کہ زبیدہ خاتون ہی آپ کے قلب و جان کیلئے راحت کا سامان ہے۔"

ہارون الرشید غصے میں چلایا۔

"ابونواس تم جھوٹے ہو۔خدا کی لعنت ہو تم پر۔"

ابونواس نیم ایستادہ ہوا۔کورنش بجالاتے ہوئے بولا۔

"امیر المومنین آپ مجھے وقت سے پہلے مروانا چاہتے ہیں۔آپ چاہتے ہیں کہ یہ جو میں لنگڑاتا ہڈیاں گوڈے رگڑتا آپ کے حضور حاضر ہو گیا ہوں۔اس سے بھی جاؤں۔رحم کیجئے مجھ پر۔"

اُسی وقت پردے کے پیچھے سے زبیدہ کی ہنسی سُنائی دی۔

"ابونواس تم سچے ہو۔تم نے یہ سب کہا ہوگا۔امیر المومنین چونکہ پریشان تھے انہوں نے یہ سب باتیں اپنے پاس سے گھڑیں اور تمہارا نام لگا دیا۔"

بالکل، بالکل، درست، درست کہتا میں اپنے گھر دوڑتا گیا۔ گھر پہنچا تو دروازے پر زبیدہ کے غلام خلعتِ فاخرہ اور زرِ نقد لئے کھڑے تھے۔

کئی ماہ بعد خلیفہ کو یہ سب معلوم ہوا۔ بہت ہنسا۔ انعام و اکرام سے نوازا۔"

"وہ کلام الیل والا کیا قصہ تھا؟ اُسے بھی تو سنائیں۔"

"ارے بھئی اُن دِنوں محل میں آرمیدیا کی چند کنیزوں کا بڑا چرچا تھا۔ آرمیدیا کی لونڈیاں بڑی مہذب اور شائستہ سمجھی جاتی تھیں۔ محل میں بچوں کی تربیت کا بیشتر کام اُن کے سپرد تھا۔ ایک رات ہارون نے تنہائی میں ایک طرحدار اور دل کش کنیز سے کچھ شرارت کرنی چاہی۔ اُس نے صبح پر ٹرخا دیا۔ اگلے دن ہارون نے اُسے بلوایا اور وعدہ یاد دلایا۔ آرمیدیائی لونڈی نے ادائے بانکپن سے کہا۔

کلام الیل یمحوہ النہار۔

ہارون مسکرایا۔ اُسے لونڈی کی بات بہت پسند آئی تھی۔ بغداد کے سب شاعروں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ اس پر گرہ لگائیں۔

"جانتی ہیں یہ بازی کس نے جیتی؟ انہوں نے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا تھا۔ میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ فوراً اپنے سینے پر فخریہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"ارے بھئی میں نے۔ یعنی ابونواس نے۔ میں نے تضمین کے مصرعوں میں ہارون الرشید کی دراز دستی کا سارا حال بیان کر دیا تھا۔

"تو اب رخصت۔ تمہاری مچھلی بس آیا ہی چاہتی ہوگی۔"

میں نے نگاہیں اٹھا کر دُور پھینکیں۔ افلاق تو مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

"کیا مجھے تھوڑا سا وقت اور نہیں عنایت کریں گے۔"

میرا انداز بڑا ملتجی سا تھا۔

کچھ اپنے بارے میں بھی بتا دیں۔ خود سے ملا دیں۔

''ارے بھائی ہماری زندگی بس ایسی ہی اُجڑی پُجڑی سی تھی۔ جسکا نطفہ تھا۔ اُس کی صورت تو کبھی دیکھی ہی نہ۔ بس سُنا کہ مروان دوم کی فوج میں ایک سپاہی ہے۔ اور نام بھی معلوم نہیں ایک بار ماں نے "حبشی" بتایا تھا۔ میری ماں گلبان ایرانی اور پیشے کی جولاہی تھی۔ کھڈی پر بڑا خوبصورت کپڑا بُنتی تھی۔ صورت کی اتنی حسین کہ ہواؤں میں اڑتے پرندے دیکھ لیں تو غش کھا کر سیدھے اُس کے قدموں میں گریں۔ نام تو میرا ماں نے الحسن ابن حبشی ال حاکمی رکھا۔ میں خوبصورت تھا۔ سنہری بالوں میں گُنڈل پڑتے تھے اور دو لٹیں شانوں پر گرتی تھیں تو گاؤں کے من چلوں نے ''ابونواس'' کہنا شروع کر دیا۔

ہاں پیدا کہاں ہوا؟ کچھ پتہ نہیں۔ کسی نے دمشق کہا۔ کسی نے بصرہ اور کچھ اہواز کہتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟ مجھے تو خود معلوم نہیں۔

ابونواس نے منہ بنایا۔ ہاتھوں کی انگلیاں نچائیں سارے چہرے پر نفی کا تاثر بکھیر دیا۔

ماں نے مجھے یمن کے کسی تاجر کے پاس کیوں بیچ دیا؟ میں کبھی سمجھ نہیں سکا۔ چھوٹا سا تھا۔ کیا میری روٹی اُس پر بھاری تھی؟

یمن کے اِس تاجر کی دوکان بصرہ میں تھی۔ کھانے پینے کی یہاں کھل ڈل تھی۔ خوب قد کاٹھ نکالا۔ یوسف اوّل جیسا تھا۔ ذہین بھی بہت اور حسین بھی بہت۔ راہ چلتے رُک کر دیکھتے ضرور تھے۔

اور پھر اُس نے مجھے دیکھا۔ ولیبہ ابن احباب نے یہ شاعر تھا۔ اُسنے مجھے خریدا اور اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ پڑھائی لکھائی، گرامر، صرف ونحو۔ کوئی دو سال بدوؤں میں بھی

رکھا کہ زبان خالص ہو جائے۔

یہ ولیمہ ہی تھا جو مجھے بغداد لایا۔ یہیں میں نے شاعری شروع کی۔ مزاح سے بھرپور۔ صحرائی روایات کے برعکس، شہری زندگی کی عکاس جسمیں نوخیز لڑکوں کی محبت اور شراب تھی۔

میں باغی تھا۔ روایات کا، اقدار کا، مذہب کا۔ سُرور ملتا تھا جب مُلّا چیختے چلاتے تھے جب لعن طعن ہوتی تھی۔

قصیدہ کو تھا اپنے سرپرستوں کا۔ برامکیوں کیلئے کیوں نہ لکھتا۔ وہ تو نگینے تھے جو عباسیوں کو مل گئے تھے۔ عربوں کا عروج اپنی جگہ، اُنکی فتوحات کے پھیلاؤ کی اہمیت کا اپنا مقام۔ اُنکی زبان کی وسعت، مذہبی رواداری، آئین و دستور کی بالادستی نے دوسری قوموں پر اُنہیں غالب کیا یہ سب حقائق مسلّم۔ لیکن ایرانیوں کے تہذیب و تمدّن کی شائستگی، بزمی اور لطافت بھی اپنی جگہ بڑی نمایاں تھی۔ برامکی ایرانی جنہوں نے اپنا رنگ انکے رنگ میں شامل کیا اور اُسے مزید نکھارا۔

برامکی میرے محسن تھے۔ مجھے نوازتے تھے۔ جعفر برمکی نے جب اپنا وہ شاندار محل بنایا جو شان و شوکت کے اعتبار سے خلیفاؤں کے محلوں سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔ اور ہاں دیکھو یہ میری چھٹی حس تھی۔ یا تم اِسے میرا وجدان کہہ لو کہ جیسے مجھے ان کے عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ ہوا۔ محل کو دیکھتے ہی بے اختیار میرے ہونٹوں پر یہ اشعار تھرتھرانے لگے۔

اے محل شکستگی کے آثار تجھ پر ظاہر ہیں
میں نے تیری دوستی میں خیانت نہیں کی
اے برمک کی اولاد جب تم دُنیا سے گُم ہو جاؤ

تم پر ہمیشہ سلامتی رہے۔ دنیا تمھیں یاد کرے۔

ہارون الرشید کو مجھ پر اتنا تیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُسنے بھی تو احسان فراموشی کی انتہا کردی تھی۔"

"ابو نواس ہارون الرشید پر تمہارا اتنا غصہ درست نہیں۔ طاقتور شاہوں کی کتاب میں یہ درج ہوتا ہے کہ صرف انہیں ہی مرکز رہنا ہے اور جب کوئی دوسرا مرکز بننے کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہی ہوتا ہے جو برمکیوں کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے اختیارات اور شاہانہ اظہار کی تمام حدیں پھلانگ لی تھیں۔"

"ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ہجو لکھی تھی، ہارون الرشید کی ہجو، جو بغداد کے گلی کوچوں میں زور و شور سے گونجی۔ خلیفہ نے مجھے دیس نکالا دے دیا۔ پھر بھاگنا پڑا تھا اور میں مصر بھاگ گیا تھا۔

میری بہترین شاعری امین کے دور میں لوگوں کے سامنے آئی تھی۔"

"ابو نواس اگر کچھ کہوں تو سُنیں گے نا؟ تم نے امین کا اُستاد ہونے کے ناطے اُسے بھی شراب پر لگا دیا تھا۔ امین بہت خوبصورت اور وجیہہ لڑکا تھا۔"

"تمہاری عدالت میں ہوں۔ جو چاہو کہہ سکتی ہو۔"

"نہیں نہیں ابو نواس۔ میں نے تو جو ماڑا موٹا پڑھا ہے اُسی کی روشنی میں تم سے بات کرتی ہوں اور تصدیق چاہتی ہوں۔"

"تو پھر سُنیں۔ یہ امین ہی تھا جس کی شعر گوئی کی اصلاح پر زبیدہ نے مجھے مامور کیا۔ میں نے اصلاح کی۔ غلطیاں بتادیں تو نوجوان شہزادے نے مشتعل ہو کر مجھے بندی خانے میں ڈال دیا۔ ہارون کو پتہ چلا تو بیٹے پر ناراض ہوا اور مجھے رہائی دلوائی۔

چند ہی دنوں بعد جب میں خلیفہ کی خدمت میں حاضر تھا انہوں نے بیٹے سے کہا

کہ اپنا تازہ کلام ابونواس کو سناؤ۔ امین نے ابھی دو تین شعر ہی پڑھے ہوں گے جب میں کھڑا ہو گیا۔ ہارون نے بے حد تعجب سے میری طرف نگاہیں کیں اور استفسار کیا کدھر؟ میں نے کہا بندی خانے جانے کیلئے۔

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ بھئی ہم تو ایسے ہی تھے نڈر اور بے باک سے البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ امین کے مرنے پر جو نوحے میں نے تخلیق کیئے وہ عربی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ زبیدہ کے نالے اور بغداد کی گلیوں میں گونجتے نوحے میری شاعری کے صدقے تھے جنہوں نے مامون کو فتح یاب ہو کر بھی بغداد میں داخل ہونے سے مہینوں روکے رکھا۔ خائف تھا وہ۔

مامون میرا نام سُننا نہیں چاہتا تھا۔''

''ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابونواس تم آخری عمر میں تائب ہو گئے تھے۔ بڑے مذہبی اور خدا پرست بن گئے تھے۔''

''یہ ہوائی تو میرے کسی دشمن نے اڑائی ہو گی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ جیل اور بڑھاپے نے پریشان کر دیا تھا۔ انعام کے لالچ میں مدح سرائی بھی کی۔ اور ہاں ایک بہت بڑی حماقت بھی سرزد ہوئی کہ مامون کے درباری مشیر نے چالاکی سے علی ابن طالب کے خلاف ہجو بھی لکھوالی اور اُسے بغداد کے کوچہ بازار میں نشر بھی کر دیا۔''

''کہتے ہیں زہر دیا گیا تھا تمہیں۔ اسماعیل بن ابوسہل مرکزی کردار تھا۔''

''زہر ملا۔ یا جیل میں ہی طبعی موت مرا۔ بس دنیا سے جانے کا بہانہ ہی چاہیئے تھا۔ وہ مل گیا اور چلا گیا۔

لو تمہاری مچھلی آ گئی ہے۔ کھاؤ۔ میں چلتا ہوں۔'' ایک ہاتھ میری طرف بڑھا تھا جسے میں نے محبت سے تھاما۔

بڑی سی سینی میں ٹماٹر، پیاز، کھیروں اور چٹنی کے ساتھ تجی مچھلی آ گئی تھی۔

افلاق بتا تا تھا کہ مچھلی الاؤ پر روسٹ کے بعد مرچ مصالحوں کے ساتھ گرم کوئلوں ملی ریت میں دم پخت کی جاتی ہے۔

اب ذائقے کے بارے میں کیا کہوں۔استنبول کا پرنس آئی لینڈ یاد آ گیا تھا۔کہ تب بھی جی چاہا تھا اٹھا کر باسفورس میں پھینک دوں۔میں تو چاہتی تھی۔سیما ہی نہیں مانی۔ اور اب بھی اگر افلاق ساتھ نہ ہوتا تو دجلہ میں پھینکنا ضروری تھا۔

افلاق بیٹوں جیسا ہی تھا۔ذائقے سے آشنا بھی۔تو ہرج ہی کیا تھا کہ اُسے مچھلی بھی کھلاتی جاؤں اور باتیں بھی کرتی جاؤں اور اُس شخصیت کو تھوڑا سا اور یاد کر لوں۔

اُس کے مرنے پر جب گھر کی تلاشی لی گئی تو بدخواہوں اور حاسدوں کو صرف کاغذوں کا ایک دستہ اور کہانیوں کی ایک کتاب کا بیرونی کور ہی ملا تھا۔دستے میں صرف و نحو اور گرامر کی چند تراکیب درج تھیں۔وہ ٹھیک کہتا تھا۔اُس کی شاعری سے متعلق ہر بات کی تان اس کے غیر معمولی گہرے اور ذومعنی اظہار پہ ہوتی تھی۔

اپنے عہد اپنے وقت کا ایک بڑا شاعر ابونواس۔

☆☆☆

بانی عراق جرٹروڈ بیل

بیسویں صدی کی ایک عظیم لکھاری، دلیر سیاح، ایک منفرد کردار اور بہترین منتظم جس سے میں
بغداد میں ملی اور جس کی کہانی کا انجام لاہور آ کر جانی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

- مجھے مشرق کا سحر، اُس کے صحراؤں کا طلسم، اس کے لوگ اور ان کے کلچر کی رومانیت بہت ہانٹ کرتی ہے۔
- میں جیسے جیسے "حافظ" کی شاعری کو پڑھ رہی ہوں حیرتوں میں گم ہوتی جا رہی ہوں۔ ہم کیسے لوگ ہیں جو اُس کے مقام سے ہی آگاہ نہیں۔ اُس کی نظموں میں موسیقیت کا ایسا رچاؤ ہے کہ آپ کا جی انہیں بے اختیار گنگناتے رہنے کو چاہتا ہے۔
- مجھے بغداد سے اتنی محبت ہے کہ بغدادیوں کو بھی نہیں ہوگی۔ کوئی بغدادی اِسکے حُسن کو اُن نظروں سے نہیں دیکھتا جن سے میں اسے دیکھتی ہوں۔ دریا کی خوبصورتی، پام کے باغوں کا حُسن، کھجور کے درختوں کا بانکپن، صحرا کی دل آویزی۔ سب مجھے گرفت میں لے لیتے ہیں۔

The woman who made Iraq یعنی بانی عراق جیسا ٹائٹل اُسے عراقی عوام نے دیا تھا۔ صحرائی بدو اور علاقائی شیخ اُسے کوئین آف دی ڈیزرٹ کہتے تھے۔ Shaper of the nations اور فی میل لارنس آف عریبیا کا خطاب اتحادی فوجوں کا عطا کردہ تھا۔ وہ کنگ میکر تھی۔ اُسے بے تاج ملکہ بھی کہا جاتا تھا۔

جرٹروڈ بیل

The woman who made Iraq یعنی بانی عراق جیسا ٹائٹل اُسے عراقی عوام نے دیا تھا۔ صحرائی بدو اور علاقائی شیخ اُسے کوئین آف دی ڈیزٹ کہتے تھے۔ Shaper of the nations اور رفیق لارنس آف عریبیا کا خطاب اتحادی فوجوں کا عطا کردہ تھا۔ وہ کنگ میکر تھی۔ اُسے بے تاج ملکہ بھی کہا جاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں تو اُس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ کہیں ایک آدھ بار رسی سا پڑھا ہوگا تو وہ میرے حافظے میں کہیں نہیں تھا۔

پہلا تعارف بُرے سے تاثر کا حامل تھا۔ دمشق جاتے ہوئے جہاز میں ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی چھوٹی جثی ٹمیار کٹارا سے نین نقش والی دمشق یونیورسٹی میں جغرافیہ کی اُستاد نے شام کے بارے میں باتیں کرتے کرتے اچانک کہا۔

''یہ کمبخت مارے ذلیل انگریز اور فرانسیسی انیسویں صدی کے آواخر سے ہی

فاحشاؤں جیسے کردار لیے مشرق وسطیٰ پر رالیں ٹپکاتے پھرتے تھے۔اُس منحوس ماری جرٹروڈ بیل Gertude Bell کو کیا کہوں۔نابکار کہیں کی کیسے اُس نے میرے اتنے خوبصورت ملک کی شکل وصورت بگاڑ دی۔کیا مردمار عورت تھی؟بصرے کو بغداد سے ملایا۔موصل اس میں شامل کیا۔کویت کو علیحدہ کردیا۔اردن کا ٹوٹا الگ کیا۔"

میں نے اُس کی طرف دیکھا تھا۔مجھے احساس تھا۔یقیناً میری آنکھوں میں لاعلمی کے رنگ ہوں گے اور میری پلکوں پر سایہ کرتے ناواقفیت کے عکس اور کہیں یہ خفت بھرا احساس بھی کہ چلی ہے شام اور عراق کی سیاحت اور ان پر لکھنے کو اور حقائق جانتی ہی نہیں۔

اس کے لہجے میں جاندار قسم کی تلخی تھی۔

"برٹش گورنمنٹ کی ایجنٹ، اُس کی منتظم اعلیٰ، اُس کی بادشاہت کے ستونوں کو مشرق وسطیٰ میں گہرے گاڑنے میں برٹش عزائم کی معاون، لارنس آف عریبیا اور ونسٹن چرچل کی ساتھی اور پورے جزیرہ نماعرب کے صحراؤں، میدانوں اور شہروں کے چپے چپے کو اپنے پیروں تلے روندنے اور علاقے کے شیخوں اور صحرائی قبائل کے سرداروں کو جاننے اور تعلق والی جو شرق وسطیٰ پر ایک اتھارٹی کی سی حیثیت رکھتی تھی۔

مگر ان سب کے باوجود اُسے عراق سے محبت تھی۔وہ بغداد کی دیوانی تھی۔وہ دفن بھی یہیں ہے۔"

جرٹروڈ بیل میرے اندر اتری ضرور پر اگلے بہت سارے دنوں میں شام کے شہروں کی سیاحت اور بغداد کی سرزمین پر قدم دھرنے کے بعد تک وہ ذرا دل سے اوجھل سی رہی۔

یہ اور بات ہے کہ جونہی میں عراق آرکیالوجی میوزیم میں داخل ہوئی اور گھومتے گھومتے میوزیم کے داہیں حصے میں جا گھسی تو ٹھٹھک گئی۔وہاں جرٹروڈ بیل کانسی کے مجسموں

اور آرٹسٹوں کے کمال فن کی صورت میں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھی۔اس کی لکھی گئی ڈھیروں ڈھیر کتابیں اس کے استعمال کی اشیاء سبھوں کو میں نے دیکھا۔اُس پورشن میں سب سے خوبصورت وہ لفظ تھے جو اُسے خراج پیش کرتے تھے میں نے انہیں پڑھا اور جی جان سے سراہا۔

This window is in remembrance of Gertrude Bell versed in learning of the East and of the West, writer, Poet, Historian, Antiquary, gardner, mountaineer, explorer, lover of nature of flowers and of animals incomparable friend, sister and daughter.

مجھے پتہ چلا تھا کہ اس شاندار میوزیم کو بنانے میں اُسکی انتہا درجے کی دلچسپی، آثار قدیمہ اور خاص طور پر میسوپوٹیمیا کی سرزمین پر بکھرے ہزاروں سالہ تاریخی ورثے سے اُس کی بے پناہ محبت اور لگن نے یہ عظیم کارنامہ اُس سے کروایا۔

افلاق میرے ٹیکسی ڈرائیور کے پاس اُس سے متعلق کافی معلوماتی ذخیرہ تھا۔

''چلو میوزیم کے ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے کہا تھا جو یہ بتائے اِسے تو سنوں۔پھر کسی اور کو بھی ڈھونڈوں گی۔''

پتہ نہیں میرے وجدان نے مجھے سگنل دیا تھا کہ اِس تاریخ ساز شخصیت کے پیچھے بہت دلچسپ کہانیاں ہوں گی۔

ہم دونوں نے قہوے سے بھری گلاسیاں اٹھائیں۔سپ لیتے اور میں نے آنکھیں اور کان افلاق کے چہرے پر لگا دیئے۔

1868 پیدائش کا سال اور جگہ انگلینڈ کی کاؤنٹی ڈرہم Durham۔خاندان

سٹیلsteel کا بیوپاری۔دولت کا کچھ یہ حال کہ آج کے بل گیٹس سے ملایا جاسکتا ہے۔ذہانت بھی بہت، دلیری بھی اوراعتماد بھی اعلیٰ کا۔سوتیلی ماں فلورنس نے محسوس کرتے ہوئے تربیت سازی کی کہ اپنی ماں ماریا تو اُس کی کمسنی میں ہی فوت ہوگئی تھی۔آکسفورڈ یونیورسٹی میں ماڈرن ہسٹری میں ایم اے میں ٹاپ کرنے والی وہ پہلی طالبہ تھی۔

''مجھے مشرق کا سحر، اُس کے صحراؤں کا طلسم، اس کے لوگ اوران کے کلچر کی رومانیت بہت ہانٹ کرتی ہے۔پہاڑوں کی دنیا کی ہیبت اورانہیں سرکرنے کا میراجنون ہے۔''

ایسی باتوں کااظہاراکثراُس کے ہاں ہوتا۔

''مجھے ایران جانا ہے۔انکل فرینک Frank Lasceller کے پاس۔

فارسی زبان سیکھنے کا آغاز کرتے ہوئے اُس کا گویاایک اعلان تھا۔

چھ ماہ بعدتہران کی ایک بہت خوبصورت سی شام کوسفارت خانے کے ہال میں استقبالیہ پر کھڑے خوبرو نوجوان Legation سیکریٹری ہنری کاڈوگن Cadogan نے ایک دل کش لڑکی کوقیمتی فراک میں سجے فراک میں برطانوی سفارت کارسرفرینک اورلیڈی فرینک کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ہال کی کھڑکیوں سے آتی شام کی کرنوں میں اُس کے تیزسرخی مائل بال یوں چمکتے تھے جیسےاُن میں آگ لگی ہوئی ہو۔اُس کی ابھری ہڈیوں والے رخساروں پر چمکتی نیلگوں سبزی مائل آنکھیں کانچ کی طرح چمکتی تھیں۔اُس کے دلکش خدوخال اوراُس کے گلے میں پہنے قیمتی موتیوں کاہاراُسکی گردن میں لپٹابہت قیمتی نظرآتا تھا۔

ہونٹوں پردھیمی سی مسکراہٹ بکھیرے اُس نے پذیرائی کی اوروقت رخصت وہ ذرا سااُسکی داہنی جانب جُھکااورسرگوشی کےانداز میں بولا۔

''ایک چھوٹی سی خواہش، ایک چھوٹی سی درخواست اسے پذیرائی دینا۔ تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

جیرٹروڈ نے رُخ پھیرا اور اُسے بغور دیکھا۔ ایک دلکش نوجوان شوق و اشتیاق کی لو سے دمکتی آنکھیں اُس پر جمائے پوری طرح متوجہ تھا۔

جیرٹروڈ کو بھی ہنری پسند آیا تھا۔

اب ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ پکنک پارٹیاں، رائیڈنگ، لمبی لمبی سیریں، شاموں کی کافی پارٹیاں اور طویل باتوں کے سلسلوں میں جہاں وہ اپنے بارے میں اُسے بتاتی کہ اُسے کوہ پیائی سے لے کر صحراؤں میں گھومنے پھرنے۔ آثار قدیمہ، نئی نئی زبانوں کو سیکھنے، دنیا کو دیکھنے، دنیا کی مختلف قوموں، گروہوں، فرقوں کے لوگوں سے ملنے اور اُن کے کلچروں سے آشنا ہونے کا کتنا شوق ہے؟

ہنری اُسے رشک سے دیکھتے ہوئے سوچتا اور دھیرے سے کہتا۔

''جیرٹروڈ تمہارے اور میرے شوق کتنے ملتے ہیں اور ہمارے خیالات میں کتنی ہم آہنگی ہے؟ اور زبانیں تو تم ابھی بھی چھ سات روانی سے بول سکتی ہو۔''

تب وہ کھلکھلا کر ہنستی اور کہتی۔

''نہیں ہنری یہ تو کچھ بھی نہیں۔ بیس تو کم از کم آنی چاہیں۔ ابھی تو میری فارسی بھی اتنی اچھی نہیں۔ مزید مہارت کی ضرورت ہے۔ یوں مجھے یہ زبان بہت پسند آئی ہے۔ میٹھی اور اپنی پشت پر بھاری اثاثہ لیے۔ ویسے ہنری مجھے مڈل ایسٹ بہت فسینیٹ کرتا ہے۔ میں نے اب اس کی سیاحت کرنی ہے۔''

ہنری اس کی خوبصورتی سے کہیں زیادہ اُس کے بھیجے میں چھپے دماغ سے متاثر ہوا تھا۔ وہ ذہانت کی انتہاؤں پر تھی۔

ایسی ہی ایک ملاقات میں ہنری نے کہا تھا۔

"جیرٹروڈ مجھے لگتا ہے تم نے کوئی عظیم کام کرنا ہے۔تم بہت خاص اور انوکھی ہو۔میں تمہیں بہت پیار کرنے لگا ہوں۔تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس نے چچا اور چچی کو آمادہ کیا اور منگنی کر لی۔مگر جب اُس نے اپنے باپ کو اس کے بارے میں لکھا۔تو بل کا جواب بہت دل شکنی والا تھا۔

"میں نے اُسے قطعی پسند نہیں کیا۔ہنری بہت عام سے خاندان کا لڑکا ہے۔معاشی طور پر بھی فیملی مظبوط نہیں۔اور خود ہنری کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔اتنی کم تنخواہ میں میری بیٹی کا گزارہ نہیں ہوگا۔یوں بھی وہ جوئے کا دلدادہ ہی نہیں بلکہ عادی کھیلنے والا ہے۔تم خود سوچو جیرٹروڈ میں تمہیں کسی جواری کے ساتھ تو نہیں بیاہ سکتا۔ہمارا خاندان اعلیٰ وکٹورین اقدار کا حامل ہے۔"

خط ہاتھوں میں تھامے اور اُسے پڑھتے ہوئے جیرٹروڈ نے خود سے کہا تھا۔

"اف کاش مجھے اپنے باپ سے اتنی محبت نہ ہوتی اور میرا خاندان وکٹورین اخلاقیات اور روایات کا ایسا اسیر نہ ہوتا۔"

تاہم اُس نے ردعمل کے طور پر کچھ نہیں کہا۔منگنی توڑی اور واپس انگلینڈ چلی گئی۔

پر وہ بہت غمزدہ تھی۔دل شکستہ سی۔فلورنس سوتیلی ماں جانتی تھی کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک لڑکی ہے۔وہ خود بھی پلے رائٹر تھی۔شائد اسی لیئے اُس نے کہا۔

"تمہارا باپ تمہارے لیئے ہیرا سے لڑکے کا متمنی ہے۔اس ڈپریشن سے باہر نکلو اور لکھو۔تم نے ایران کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔یہ سب لوگوں کو دکھاؤ۔

آہستہ آہستہ اُس نے خود کو آمادہ کیا اور Persian pictures لکھی۔پہلی کتاب ہی نے اُسے بطور لکھاری مستند کر دیا تھا کہ اس کے انداز بیان میں جذب کرنے کی

فراوانی تھی۔فارس مغرب کیلئے اتنا زیادہ مانوس نہ تھا۔اُس کی تحریر ایران کے شاندار ماضی کی اساطیری کہانیوں کے پیچ وخم سے گزرتی قاری کو اُس کی عظمتوں سے مرعوب کرتی اُس کے موجودہ زوال اور اسباب سے آشنا کرتی تھی۔ایران کے چہرے پر نمایاں اُسکی سیاسی تہیں،اُس کا اسرار،اس کا طرز تمدن ،خواتین کے رویئے،اُن کی بود وباش ، اُن کا حُسن جمال، زمین کا قدرتی اوراس پر انسانی ہاتھوں کا دیا گیا حُسن ،محرم اور رمضان کی رونقوں کی تفصیلات دلچسپی سے معمور پڑھنے والے کو قید کرتی تھیں۔

مذہبی تہواروں کی تفصیلات میں اسلام اور عیسائیت کے تقابلی جائزے میں دونوں مذاہب کے فرق اور مماثلتوں کی تفصیلات حیران کن تھیں۔

یہ ایک ایسا سفرنامہ تھا جسمیں مشرق کی دنیا اپنی چھوٹی چھوٹی تفصیلات اور رازوں سے سامنے آئی تھی۔

اس کی دوسری تخلیق Poems from Diwan Hafiz.1897 میں شائع ہوئی۔جو اُس کی فنی مہارت کا ایک اور ثبوت تھی۔

باقاعدہ ترجمے سے پہلے پیش لفظ میں اُس نے حافظ کی زندگی کے نمایاں پہلو اور ان کے کام کا تنقیدی جائزہ لیا۔نظموں کے ساتھ ساتھ لکھے گئے اس کے نوٹس میں حافظ کے ہم عصر شعرا کے تقابلی جائزوں میں اُس کے اندر کے علم کی وسعت اور گہرائی کھل کر سامنے آئی۔کہیں وہ اُس کا موازنہ Dante دانتے سے کرتی ہے۔کہیں وہ اُسے گوئٹے سے جوڑتی ہے،اور کہیں Villon سے۔کہیں خیالات کی رو میں اُسے احساس کی وہ جھلک نظر آتی ہے جو مغرب کی مشرق سے inspiration سے جڑتی ہے۔

یہاں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس کی موت کے بعد بیسویں صدی کی وسطی دہائی میں ایک پبلشنگ ادارے نے اس کی اِس کاوش کو حافظ ایک عظیم صوفی شاعر، حافظ کی

تعلیمات، حافظ کے حالات زندگی وغیرہ کو مختلف عنوانات کے تحت اسّی نوّے کے صفحات پر مشتمل خوبصورت فارسی خوشخطی کے ساتھ ساتھ مختلف کتابوں کی صورت شائع کیا جو بہت پسند کی گئیں۔

وہ حافظ شیرازی کی بہت مداح تھی۔حافظ کے بارے میں اُس کا اپنے والد کو ایران سے لکھا گیا ایک خط شاعر کی عظمت اوراس کے کمال فن کا ثبوت ہے۔

لکھتی ہے۔

''میں جیسے جیسے "حافظ" کو پڑھ رہی ہوں حیرتوں میں گم ہوتی جارہی ہوں۔ہم کیسے لوگ ہیں جو اُسکے مقام سے ہی آگاہ نہیں۔اُس کی نظموں میں موسیقیت کا ایسا رچاؤ ہے کہ آپ کا جی انہیں بے اختیار گنگناتے رہنے کو چاہتا ہے۔دنیا کا مقبول ترین اور محبوب ترین جیسے شاعروں کا شاعراور Tongue of the invisible کہنا چاہیے۔میں اُس کے دیوان کا ترجمہ کروں گی تا کہ مغرب اُسے جان سکے۔''

جب وہ دیوان حافظ کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھی اُسے معلوم ہوا تھا کہ ہنری نمونیے سے فوت ہوگیا ہے۔

چند لمحوں کیلئے اُسے ماحول اوراپنا وجود یکسر ساکت محسوس ہوا تھا پھر جیسے اُس کے لبوں نے خود سے سرگوشی کی تھی۔

''دیکھوابھی تو سال ہی گزرا تھااوروہ دنیا سے بھی چلا گیا۔''

بہت دنوں وہ حافظ کے شعروں کو پڑھتی خاص طور پراُس کے اِن اشعار کوزیرلب گنگناتی رہی۔غم زدہ ہوتی رہی۔

بُلبل کے دل سے نکلے خون کے قطروں نے
سُرخ گلاب کوزندگی دی

اُسے توانائی دی

اے موت کی ہواؤ

تم تو میری امیدیں بھی لے اڑیں

پھر پہاڑ اوران کی مہم جوئی نے توجہ کھینچ لی۔پہلے فرنچ الپس کی Meijeچوٹی سر کی تو حوصلہ بڑھا بعد میں سوئزالپس نگاہوں میں آگئے۔

اس نے بہت سی چوٹیاں سر کیں۔ایک کو تو اُس کا نام بھی دیا گیا۔Gertrudspitze

اکتیس سال کی عمر میں اُس نے مشرق کا رُخ کیا۔یروشلم اور دمشق میں اُس کی سہیلیوں نے اُسے لکھا تھا۔

''تم آؤ یہاں۔بہت حیران کن تجربات سے ملوگی۔''

اب وہ نئی زبانیں سیکھنے میں جُت گئی۔اُس نے ٹرکش سیکھی،عبرانی اور عربی میں مہارت حاصل کی اور یروشلم آگئی۔

مڈل ایسٹ اُس کیلئے تحیرات کی سرزمین تھی۔شہروں کی سیاحت کے بعد وہ صحراؤں میں نکلی۔

افلاق نے کافی کا آرڈر دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔

تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے پر بھی ایسی عورت نہیں ملتی۔مشرق وسطیٰ کے صحراؤں کی سردی اور گرمی دونوں انتہاؤں پر۔وجود کو جلانے اور منجمند کرنے والی موسمی شدتیں۔کیا شیر دل عورت تھی؟گھوڑوں،خچروں،باورچی،گائیڈ،خیمے،کتابیں نقشے اور دیگر سیاحتی لوازمات کے ساتھ نکل پڑتی۔

سر پر دھرے ہیٹ کے ساتھ کفایہ سے سر ڈھانپتی۔لمبے سکرٹ پہنتی۔چہرے پر

جالی دار نقاب ڈالتی اور صحراؤں میں سے گزرتے ہوئے مقامی قبائلی سرداروں اور شیخوں سے ملتی۔ ہمیشہ پروٹوکول کا دھیان رکھتی کہ اُسے شیخوں کے سامنے کیسے پیش ہونا ہے؟ اور انہیں کیسے عزت و تکریم دینی ہے؟

وہ زیادہ وقت مقامی لوگوں کے ساتھ گزارتی۔ فرانٹے کی عربی بولتی۔ جگہوں کے بارے جانکاری حاصل کرتی۔ اُن کے خیموں میں، اُن کے گھروں میں، اُن کے سے انداز میں چوکڑی مار کر بیٹھتی۔ انکی تاریخ، اُن کے رسم رواج سے آگاہی حاصل کرتی۔ گاڑھے اور کسیلے قہوے کے گلاس پر گلاس پیتی۔ بڑی سی سینی میں روسٹ بکرا اور چاول جنہیں وہ اُن کے ساتھ ہی قالین پر بیٹھ کر ہاتھوں سے کھاتی اور انگلیاں چاٹتی۔

مُدہف (مہمان گھر جو نرسلوں اور جیوٹ کے ریشوں سے بنایا جاتا ہے) میں ٹھہرنا اُسے بہت پسند تھا۔ جب بھی ایسا موقع آتا وہ اپنے میزبانوں سے stuffed بکرے کی فرمائش کرتی جو اُس کی دُم اُس کے منہ میں ڈال کر اس کی آنکھیں نکالے بغیر روسٹ کیا جاتا تھا۔ سگریٹ پیتی اور حقے کے کش بھرتی۔ اکثر بون فائر میں ان کے ساتھ ڈانس کرتی، گانے گاتی۔ وقت رخصت انہیں قیمتی تحائف اور قیمتی بندوقوں سے نوازتی۔

وہ حیرت سے اُسے دیکھتے۔ ایک اکیلی نوجوان خوبصورت عورت تن تنہا اتنے شدید موسم میں کیسے سفر کرتی ہے؟ ہاں تو اب یہ بھی جان گئی تھی کہ گھڑ سواری کے دوران گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے اُونگھ کیسے لی جاتی ہے؟ کوئین اف دی ڈیزٹ کا خطاب اُسے اِن ہی قبائلی سرداروں اور شیخوں نے دیا تھا۔

The Desert and the Sown بھی اُس کا ایک بے مثل تاریخی شاہکار ہے۔ جو تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ تقریباً ڈیڑھ سو انتہائی اعلیٰ درجے کی تصویروں سے مزین ہے۔

وہ ایک نڈر، دلیر، جی دار اور وسائل رکھنے والی سیاح تھی۔ اُس کا بڑا مقصد کرداروں کا مطالعہ، جگہوں کا مشاہدہ اور رسم و رواج سے آگاہی تھی۔

جگہوں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ اُس کا زیادہ فوکس لوگوں پر رہا۔ ان کے اطوار و کردار پر اُس کی گہری نظر اور عورت ہونے کے ناطے عائلی زندگی کے بہت سے پہلو جنہیں پردہ دار روایتی اسلامی معاشرے میں صرف ایک عورت ہی دیکھ سکتی ہے۔ اُس نے انہیں دیکھا اور پوری تفصیل سے زیر تحریر لائی۔ اِن قبائلی معاشروں کی یہ وہ حقیقی تصویر تھی جس نے اُسے باقی سیاحوں سے منفرد کیا کہ تہذیبی اور تمدنی زندگی کا ایک اہم پہلو گھریلو معاشرت ہوتی ہے۔ دیواروں کے اندر کی زندگی کیسے سانس لیتی ہے اور اُسے کیسے بسر کرتی ہے۔ عورت ہونے کے ناطے جیرٹروڈ نے عرب قبائلی زندگی کو اس کے پورے رنگوں سے دیکھا اور اُسے بیان کیا۔

قدرت نے اُسے ایک خاص نوع کی حِس مزاح سے نوازا تھا۔ پہاڑوں اور صحراؤں کے لوگوں سے اپنے اسفار کے دوران ملاقاتوں میں وہ اپنے مخاطب سے لفظوں کا ایک ایسا ڈرامائی کھیل کھیلتی کہ اُن کی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی۔ کسی منظر کا بیان ہو۔ کسی شخص سے گفتگو ہو۔ آثار قدیمہ کے کسی حصے کی روئداد ہو۔ منظر آنکھوں کے سامنے مجسم ہوتے تھے۔

Amurath to Amurath اُس کا ایک اور شاہکار سفرنامہ ہے جو حلب سے شروع ہو کر دریائے فرات کے ساتھ ساتھ چلتا دیاربرک Diyaberk سے قونیہ تک جاتا ہے۔

The Thousands and one churches جیسی کتاب ولیم ایم ریمزے اور اس کی مشترکہ کاوش سے لکھی گئی۔ اس کی تصاویر اور تفصیلات ایسی معلومات

فراہم کرتی ہیں جو بہت قیمتی ہیں۔آغاز کے بازنطینی اور عیسائیوں کے اناطولیہ کے ریجن میں پوسٹ کلاسیکل یادگاریں جن میں بہت سی اب نا پید ہیں۔اور جو ہیں اُن کے نئے نام ہو گئے ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ اِن علاقوں سے، بغداد اور عراق سے محبت کرتے کرتے اُسے ایک جیالے سے محبت ہو گئی۔یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ وہ برٹش تھا۔اُس کی چوڑی چھاتی تمغوں سے سجی ہوئی تھی۔بڑا بہادر، جیالا، دلیر اور دلبر سا مشرق وسطیٰ میں برٹش آرمی کا میجر چارلس ڈوگی ولی Doughty Whlie۔

دونوں مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھے تھے۔دونوں کی دلچسپیاں اور شوق ملتے تھے۔جرٹروڈ کو اپنے اندر بہت ہیجان بھری کیفیات کے مدّ و جزر کا احساس ہوا تھا۔چارلس میں وہ سب کچھ تھا جس کے خواب جرٹروڈ جیسی خاتون دیکھتی تھی۔ایک آئیڈیل مرد۔

مگر یہ کیسا المیہ تھا کہ وہ شادی شدہ تھا اُس کے اندر سے ہُوک سی اٹھی تھی۔تاہم پھر بھی وہ خود کو اس کی محبت میں گرفتار ہونے سے روک نہ سکی۔دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے تو لمبے لمبے خط لکھتے۔

جرٹروڈ کے خطوط ایسے شاہکار ہوتے کہ جنہیں وہ بار بار پڑھتا اور اُس کا جی نہ بھرتا۔پندرہ ہزار خط جو اُس نے اپنے والد، والدہ، سہیلیوں اور چارلس کو لکھے۔یہ وہ آئینہ تھا جس میں اُس زمانے کے سارے عکس موجود تھے۔برطانیہ اور اس کے حواریوں کی چالیں، ریشہ دوانیاں، لارنس آف عریبیہ اور چرچل کے کردار۔مقامی آبادی، مذہبی رہنماؤں کے باہمی اختلافات، کیمونسٹ عناصر کا اثر و نفوذ۔بغداد اور دمشق کے شب و روز۔یہ خط نہیں تاریخ تھے۔اس کے علاوہ سولہ ڈائریاں۔خطوط کو پانچ چھ والیوم کی

صورت میں چھاپا گیا۔اور یہی صورت ڈائریوں کی ہوئی۔مغرب کا عام قاری تو انگشت بدنداں تھا۔اُسکے تحریری شہ پاروں نے مشرق کو اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔جنگی جرنیلوں اور سیاسی مُہروں کیلئے اُس میں جاننے اور سمجھنے کیلئے بہت کچھ تھا۔

یہی وہ دن تھے جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور جرٹروڈ نے سوچا اس کے مادرِ وطن کو اس وقت اس کی ضرورت ہے۔وہ فرانس پہنچی۔ریڈ کراس میں زخمیوں اور گم شدہ سپاہیوں کے اندراج کرنے کی ڈیوٹی دینے لگی۔

ایسے ہی دنوں میں اُسے چارلس کا خط ملا۔اُس نے لکھا تھا۔

''میں تمہیں مس کر رہا ہوں جرٹروڈ۔ملنا چاہتا ہوں۔اگلے چند دنوں تک مجھے گیلی پولی کے فرنٹ محاذ پر جانا ہے۔''

چار دن انہوں نے لندن کی گلیوں،سڑکوں پر گھومنے پھرنے،ڈھیروں ڈھیر باتیں کرنے ریسٹورنٹوں میں کھانے کھانے میں گزارے اور پھر جدا ہوئے۔

مئی کے پہلے ہفتے کے آخری دنوں میں جرٹروڈ لندن آئی تھی۔خوبصورت موسم کا سارا حسن جنگ کے بادلوں میں گم ہوا پڑا تھا۔لندن ریڈ کراس آفس میں جب وہ فائلیں دیکھ رہی تھی۔دفعتاً آفس کی انچارج نے باتیں کرتے کرتے جزیرہ نما گیلی پولی کے محاصرے میں اُن برٹش سینئر آرمی افسروں کی ہلاکت کا ذکر کیا تھا جن کے بارے میں اطلاعات کل شام موصول ہوئی تھیں۔بریگیڈیئر جنرل اور بریگیڈیئر میجر کے مرنے کے بعد کمان لیفٹیننٹ کرنل چارلس ڈوگی نے سنبھالی تھی۔تاہم اپنی تمام تر دلیری کے باوجود وہ اور اس کے ساتھی مارے گئے۔وہ ساکت بیٹھی اُس کے لبوں کو ہلتے دیکھتی تھی۔اندر اُٹھتے طوفان کے جھکڑوں کی شدت کے کسی ہلکے سے عکس کو اُس نے چہرے پر پھیلنے نہیں دیا۔

اور جب روزمرہ کے اس کوفت بھرے تھکا دینے والے ڈیسک ورک کو نپٹا کر

وہ وغ اٹھی ۔اُس نے لمبی آہ بھر کر خود سے کہا تھا۔

''محبت میرے نصیب میں نہیں۔''

جیسے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

اور وہ بغداد آ گئی۔

''یہ کیسی حیرت انگیزی بات ہے۔مشرق نے میرے دل کو گھائل کر دیا ہے۔مجھے ہمیشہ اس کی خوبصورتی اور سحر جکڑ لیتا ہے۔گھر تو وہاں ہے جہاں تمھارا دل ہے۔میں خود سے پوچھتی ہوں۔میرا دل کہاں ہے؟''بغداد میں۔مجھے بغداد سے اتنی محبت ہے کہ بغدادیوں کو بھی نہیں ہو گی۔کوئی بغدادی اِسکے حُسن کو اُن نظروں سے نہیں دیکھتا جن سے میں اسے دیکھتی ہوں۔دریا کی خوبصورتی ،پام کے باغوں کا حُسن، کھجور کے درختوں کا بانکپن ،صحرا کی دل آویزی۔''

یہ اپنے والد کو اُس کا لکھا ہوا ایک خط تھا۔

اور یہ 1916 کے دن تھے۔برٹش آرمی بصرہ پر قابض ہو چکی تھی۔مگر اُسے بغداد آنے میں بہت دشواریاں نظر آ رہی تھیں۔ہائی کمان اُس کی صلاحیتوں سے آگاہ تھی۔اِن علاقوں میں اُس کی ہر دل عزیزی سے واقف تھی۔مقامی با اثر لوگوں سے اُس کے رابطوں کو جانتی تھی۔

''ہمیں محفوظ راستے بتاؤ۔بغداد تک پہنچنے میں تمہاری رہنمائی چاہیے۔''

جنرل کلیٹن Clayton کا پیغام اُسے ملا تھا۔

اُس نے نقشے اور ڈائریاں اٹھائیں اور بصرہ پہنچ گئی۔برٹش آرمی کم سے کم جانی و مالی نقصان اور مزاحمت کے بغداد پر قابض ہو گئی تھی۔برطانیہ کی ہائی کمان نے اُسے باقاعدہ اورینٹل سیکریٹری کا درجہ دیا۔

برطانیہ انٹیلی جنس سروس کو اس کی صلاحیتوں کا بہت اچھی طرح علم ہو گیا تھا کہ عربوں سے ڈیل کرنے میں انہیں اس کی کتنی شدید ضرورت ہے۔اُس کا زبان پر عبور اور صحرائی قبائل کے بارے علم منفرد تھا۔عراق کے ساتھ اور ہاشمی خاندان کے ساتھ بہر حال اسکی ہمدردیاں تھیں۔شریف مکہ کے بیٹوں فیصل اور عبداللہ کو عراق اور اردن کے بادشاہ بنانے میں اُس کا بنیادی کردار تھا۔

برطانوی مینڈیٹ کو پس پردہ قائم رکھنے اور عراقیوں کو فرنٹ لائن پر رکھنے میں اُسے اصرار تھا۔قاہرہ کی کانفرنس میں وہ واحد خاتون عورت تھی جسکی نئے ملکوں کو بنانے اور مستقبل کی صورت پر دوٹوک حتمی اور قابل عمل رائے تھی میسوپوٹیمیا کا چیف پر سی کوکس اور ونسٹن چرچل اُس سے متفق تھے۔

کنگ میکنگ جیسے مشکل مرحلوں سے گزرنے ،اختیارات عراقیوں کو منتقل کرنے میں اُس کی حیثیت لازماً کلیدی رہی تھی۔"الخاتون الخاتون" کہتے عراقیوں اور"اُم المومنین" کہتے کہتے شامیوں کی زبانیں خشک ہوتی تھیں۔بے تاج ملکہ جیسی حیثیت تھی۔

پر ان مرحلوں کے بعد تلاطم خیز زندگی میں تھوڑا سا ٹھہراؤ آ گیا۔ڈپریشن کا شکار ہوئی مگر اُس نے اپنی دلچسپیاں آرکیالوجی میوزیم بنانے میں ڈھونڈ لیں۔ایک بہت بڑے کام کی تکمیل ہو چکی تھی۔اور یہ سال 1926 تھا۔اور وقت بہت بدل گیا تھا۔بادشاہ کو اس کی ضرورت کم کم محسوس ہوتی تھی۔اُس نے خواب آور گولیاں زیادہ کھالی تھیں۔جو جان لیوا ثابت ہوئیں۔اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئی۔یہیں بغداد میں برٹش قبرستان میں دفن ہے۔

مگر کہانی ختم کرنے سے قبل افلاق نے کہا تھا۔

’’ایک عجیب سی بات ہے کہ پچاس سال کی عمر میں وہ تیسری محبت میں مبتلا ہوئی۔

افلاق نے کہانی ختم کردی تھی پر میں ساکت بیٹھی تھی۔تیسری محبت یہ ایک اور

حیرت انگیز انکشاف تھا۔ یوں بھی عورت ہونے کے ناطے اس کی زندگی کے کچھ خاص حصّوں کے بارے میں میں بہت متجسس تھی۔ اُن کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

دفعتاً میرے ذہن میں برق سی کوندی۔ بغداد کی ایلیٹ فیملی کی عورتیں جن کے ہاں بیسویں صدی کی دوسری تیسری دہائی میں اُس کا آنا جانا اور میل ملاقات تھی انہیں ڈھنڈوا جائے۔ گو 1920 اور 2007، درمیان کا بہت سا وقت۔ بغداد کے پلوں کے نیچے تو ڈھیروں ڈھیر پانی گزر چکا ہے۔ کھوج کروں گی بھی تو اس کی کوئی ساتھی ملنی ناممکن۔ مگر شاید کہیں ایک نسل سے دوسری اور تیسری تک کسی تعلق، کسی واسطے، کسی فخر یا اعزاز کے ساتھ کوئی اہم، کوئی خاص واقعہ، خاندان میں گردش کرتا رہا ہو اور کوئی راوی کچھ رازوں سے پردہ اٹھا دے۔

''اب اس کی قبر دیکھنی تو بہت ضروری ہوگئی ہے۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ کون سا مسئلہ ہے۔ آرمینین چرچ کے پاس ہی باب شورجا Shorja کے نزدیک ہے۔ شام کو کسی بھی وقت چلے چلیں گے۔''

وہ دن بھر میرے ساتھ رہی تھی۔ میں نے طے کیا تھا کہ جیسے میں پرانے دمشق اور حلب کے گلی کوچوں میں عالیشان گھروں کے کھلے دروازوں سے اندر داخل ہو جاتی تھی۔ رہتل، وسیب کے سارے نظاروں کے مزے لوٹتی تھی۔ اکثر کھانا بھی ان کے دسترخوان پر کھاتی تھی۔ یہ طریقہ یہاں بھی آزماؤں۔ مگر دو قباحتیں سامنے تھیں۔ موسم کی شدت اور بغداد کے نازک حالات۔ پاکستان کا سُن کر کہیں دہشت گردوں کی ساتھی جان کر ہی نہ دھتکاری جاؤں۔ بہتر ہے کہ افلاق کی مدد لوں۔

میرا مسئلہ شاید افلاق کی سمجھ سے باہر تھا۔ بیٹے جیسے لڑکے سے میں کیا کھل کر بات کرتی کہ میرے اندر کون سا نسوانی اسرار جاگا ہوا ہے۔

میں ہوٹل آئی۔اتفاق ہی تھا کہ مروان سیٹ پر تھا۔میں نے اُسے آج کی کارگزاری سے مطلع کرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

میری بات کا جواب دینے سے پہلے اُس نے ستائشی انداز میں کہا تھا۔

''کیا عورت تھی؟ اپنے وقت کی ذہین ترین اور چالاک ترین جس کا دماغ دنیا کے کسی جینئس مرد کا تھا۔وہ اِس علاقے کے چپے چپے کو جانتی تھی۔ایک بار ہمارے میسوپوٹیمیا کے ایک ممتاز شیخ سے اُس کے علاقے کی جغرافیائی حدود کے متعلق پوچھا گیا۔اُس نے کہا تھا۔

''جیرٹروڈ بیل سے پوچھو۔ڈوب مرنے کی بات تھی ہاشیخوں کیلئے۔''

میری خواہش کا سُن کر اُس نے کہا تھا۔

''مشکل لگتا ہے۔دراصل ہمیں اس کے بارے تھوڑی بہت معلومات اِس لیے بھی ہیں کہ ہم سیاحتی پیشے سے منسلک ہیں۔وگرنہ عام لوگ نہیں جانتے ہیں۔یوں عراق کے ممتاز احمد شیلابی خاندان کی بزرگ بی بی جو صدام سے پہلے کے بغداد کی معتبر اور امیر ترین عورت شمار ہوتی تھیں اوراعظمیہ کے ڈیر Deer پیلس میں کسی ملکہ کی طرح رہتی تھیں۔اُن کے ہاں اُس کا بہت آنا جانا تھا۔اس خاندان کی لڑکی تمارہ بھی بہت سرگرم ہے۔ممکن ہے وہ کچھ جانتی ہو۔''

میری بے تابی اور شتابی کا کچھ یہ عالم تھا کہ بس نہ چلتا تھا ابھی اٹھ کر منصور سٹی چلی جاؤں جہاں اُن کا محل نما گھر ہے۔مروان مزید بتا رہا تھا۔

''گذشتہ سال اُس نے گورا قبرستان میں جیرٹروڈ کی قبر کے آس پاس یاسمین کے پودے اور کھجور کے بیشمار درخت لگوائے تھے۔''

منصور ڈسٹرکٹ گرین زون سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔بغداد کی ہائی کلاس

سماجی زندگی کا ایک اہم حصہ یہاں رہائش پذیر تھا۔ یہ ڈپلومیٹ، بزنس کلاس اور اعلیٰ درجے کے ہنرمندوں کا بھی گھر تھا مگر بموں کے دھماکوں kidnapping اور سُنّی تشدد پسندوں نے اِسے غیر محفوظ بنا دیا ہے۔

منصور میں تمارہ شیلابی سے تو ملاقات نہ ہوئی کہ وہ استنبول گئی ہوئی تھی۔ ہاں البتہ اس کے محل نما گھر کے سیکورٹی گارڈوں اور اسلحہ بردار محافظوں سے ضرور ملاقات ہوئی جنہوں نے مجھے پاکستانی جان کر مسکراہٹیں بکھریں اور افسوس بھی کیا کہ وہ اپنے پاکستانی مہمان کی خدمت سے قاصر رہے۔

تاہم بغداد پریس کلب میں حسین السیدی جیسے صاحب علم لکھاری اور صحافی سے باتیں ہوئیں۔ حالات حاضرہ سے متعلق بہت سی باتوں کے بعد جب میں نے جرٹروڈ بیل کے تیسرے عشق والے موضوع کو چھیڑا اور مروان اور افلاق کی گفتگو سے حاصل کردہ ابن سعود بن عبدالعزیز اور شریف مکہ کے بیٹے امیر فیصل کے نام ان کے سامنے رکھے۔

''ابن سعود''

اُن کے گول مول سے چہرے پر نفی کے بھرپور تاثرات بکھر گئے۔ میں نے فوراً کہا تھا۔

''ابن سعود کے بارے میں تو بہت اونچی رائے رکھتی تھی وہ۔ اُس کا اعتراف تھا کہ اپنے ہم عصر لیڈروں میں وہ بہت منفرد تھا۔ کہیں وہ اُس کی شاندار قامت اور وجود بارے رطب اللسان تھی اور کہیں اس کے بھاری پپوٹوں کے نیچے اس کی سنجیدہ اور ذہین آنکھوں، سپاہیانہ دلیری و شجاعت اور سیاسی بصیرت کے گُن گاتی تھی۔

''تو اِس کا مطلب ہے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ بس محبت میں گرفتار ہو گئی۔ بھئی سمجھو وہ ایک عظیم لکھاری بھی تھی۔ کرداروں کو حُسن و خوبی سے بیان کرنا جانتی تھی۔ یوں بھی

ابنِ سعود اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس کی تیز اور تیکھی آواز سے اُسے کوفت ہوتی تھی۔ جب وہ بے تکلفی سے اُسے کہتی۔

"عبدالعزیز۔ عبدالعزیز دیکھو اِسے۔ اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ ابن سعود کوفت بھرے انداز میں بات کو ٹال جاتا تھا۔

ہاں فیصل کے سلسلے میں کہا جا سکتا ہے مگر میں اِسے قربت رفاقت کے تعلق کا نام دیتا ہوں۔ اس کی چند وجوہات بھی ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں ان فاتح اتحادیوں کی بندر بانٹ میں شام پر مسلط فرانسیسوں نے تو فیصل کو دمشق سے سال بھر کے اندر ہی دھکا دے کر نکال دیا تھا۔ برطانیہ نے تھوڑی سی شرم وحیاء کی۔ جرٹروڈ بیل نے اِسے تین صوبوں پر مشتمل اس نئے ملک جس کی حدود کی لائنیں خود اُس نے کھینچی تھیں پر بٹھایا۔ مقامی اشرافیہ اُس کی کچھ خاص حامی نہ تھی۔ مگر درمیان میں جرٹروڈ بیل تھی جس پر عرب شیخ بھی اعتماد کرتے تھے اور برٹش کیبنٹ cabinet بھی۔

عراق جھنڈے کی ڈیزائن کاری دونوں نے مل کر کی تھی۔ بغداد کے ماضی سے اُس کی پوری جانکاری تھی۔ کالی پٹی عباسی دور، سبز پٹی امیہ اور سفید فاطمیوں کی نمائندہ بنی۔ اونچ نیچ، توڑ جوڑ کے سبق وہ سب اُس نے اُسے پڑھائے تھے۔ برطانیہ کی پشت پناہی بھی فیصل کو سو فیصد حاصل تھی۔ اور جس صبح فیصل کی رسم تاجپوشی تھی اُس نے تقریب کے اختتام پر کہا تھا۔

"یہ کنگ میکنگ تو نرا عذاب ہے۔ اِس کھینچا تانی نے مجھے تھکا دیا ہے۔"

ابھی اِس بیاہ کا ہنی مون پریڈ چل ہی رہا تھا کہ جب شیعہ سنی عوام متحد ہو کر اس سامراجی غلبے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ سارے میسوپوٹیمیا کے شہروں میں محمد

البعیدی کی شاعری گونج رہی تھی۔

اے عراقیوں اٹھ جاؤ اب
آگ لگا دو
خون سے ذلت کے دھبے دھو دو
ہم غلام ہیں؟
جو گردنوں میں طوق پہنیں
ہم قیدی ہیں جو پاؤں میں بیڑیاں پہنیں
ہم کیا عورتیں ہیں؟
جو آنسوؤں کو ہتھیار سمجھتی ہیں
ہم یتیم ہیں؟
کہ ہمیں عراق کیلئے مینڈیٹ چاہیے۔

جب ہوا ہیں اور فضا ہیں ایسی ہوں تو ظاہر ہے انحصار بڑھ جاتا ہے ہمہ وقت مشورے رائے۔یوں بھی فیصل عرب خوبصورتی کا شاہکار نمونہ تھا۔ایسے میں محبت تو ہو جاتی ہے نہ۔پالک کتے بلی سے بھی پیار ہوتا ہے نا۔

"بڑے المناک انجام سے دوچار ہوئی۔"میرے لہجے میں گلے گلے تک تاسف تھا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔بڑا نارمل سا لہجہ تھا ان کا۔بہت اونچے جا کر جب بندہ زمین پر آتا ہے تو ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ڈپریشن کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔فیصل کو اس کے مشوروں کی ضرورت اب کم کم ہوتی تھی۔برٹش ہائی کمیشن آفس میں نئے نئے لوگ آ گئے تھے۔آرکیالوجی میوزیم اُس کا ایک بڑا کام مکمل ہو گیا تھا۔وہ بیمار رہنے لگی تھی۔چین سموکر

تھی۔ پھیپھڑے متاثر ہو گئے تھے۔تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہم جیسے لاکھوں بغدادیوں سے زیادہ بغدادی تھی۔

پاکستان آ کر بھی وہ مجھے اکثر یاد آتی۔ میں تنہائی میں ایک سوال ضرور اپنے آپ سے کرتی۔ زندگی سے بھری ہوئی، آزاد معاشرے کی ایک مکمل عورت کیسے ممکن ہے کہ اُس کے اندر مرد کی قربت کی تمنا نہ مچلی ہو اور اُسنے اِسکی تکمیل نہ کی ہو۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھے جم خانہ لائبریری سے جارجینا ہوول Georgina Howell کی کتاب The Queen of the Desert ملی۔ اپنے کزن کی ممبر شپ پر میں نے اِسے ایشو کروایا۔

پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتی گئی پڑھتی گئی۔ پھر رُکی۔ ایک بار، دو بار، تین بار پڑھا۔ چوتھی بار اور پانچویں بار کا پڑھا ہوا آپ بھی پڑھیے۔

یہ ذکر ہے اُس شام کا جو بادلوں سے بھری ہوئی تھی۔ جرٹروڈ چارلس سے مل کر لندن میں اپنے ذاتی اپارٹمنٹ میں کوئی گھنٹہ بھر پہلے آئی تھی۔ چارلس ڈوگی کو آج رات دس بجے کی ٹرین سے محاذ پر جانا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سٹول پر بیٹھی وہ اپنے بالوں میں لگی پنیں نکال رہی تھی جب اُس نے ایک نرم اور دھیمی سی دستک سُنی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ چارلس مسکراتے ہوئے اندر آیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ چپ چاپ۔

جرٹروڈ سے کہا ہی نہیں گیا کہ ابھی تو میں تمہیں رخصت کر کے آ رہی ہوں۔ لباس بھی تبدیل نہیں کیا۔ پھر چارلس کے توانا بازوؤں نے اُسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

”جرٹروڈ پتہ نہیں کیوں لگتا ہے تمہیں شائد پھر نہ دیکھ سکوں۔ تین گھنٹے کا مارجن تھا۔ جی چاہ رہا تھا یہ وقت بھی تمہارے ساتھ گزاروں۔“

اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور بازوؤں کے ہالے میں سمیٹتے ہوئے اُسنے اُسے بھی ساتھ ہی بیٹھا لیا۔پھر وہ لیٹ گیا۔اُس نے اُسے بھی اپنے ساتھ لپٹا لیا۔اُس کے ماتھے اور پھر اُس کے گالوں پر بوسے دینے کے بعد جب وہ ذرا سا آگے بڑھا تب اُس کے بازوؤں میں گھرے اُس کی محبت کی گرمی میں پگھلنے اور ڈوبنے کے بجائے اُس نے دھیرے سے سرگوشی میں کہا تھا۔

''نہیں۔چارلس نہیں۔ہرگز نہیں۔

پھر اُس نے اُس کے والہانہ بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو آہستگی سے پیچھے ہٹاتے اپنے جسم کو اکڑاتے ،اس کی گرفت میں سے نکلتے اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''چارلس میں ورجن ہوں۔''

☆☆☆

جان کیٹس

پانیوں پر لکھے ہوئے نام والا

- کیٹس، شیلے اور بائرن کو میں نے اپنی بچی کے ساتھ پڑھا اور ان کی محبت میں گرفتار ہوئی۔
- جوزف سیورن جیسا پرستار بھی کہیں مقدر والوں کو نصیب ہوتا ہے۔
- فینی براؤن سے اُسے محبت نہیں عشق تھا۔
- ستارے جیسا بننے کی تمنا اور لافانی ہونے کی خواہش۔

روشن ستارے

روشن ستارے کاش میں آرٹ کی طرح امر ہو جاتا
میں بھی فطرت کے کسی رسیا کی طرح
جاگتے رہنے والے کسی رشی منی کی طرح
رات کے خوبصورت جلووں میں کبھی اکیلا تو نہ ہوتا
اس ابدی حسن کو آنکھیں کھول کھول کر دیکھتا
دھرتی کے انسانی ساحلوں کے گرد
رواں پانیوں سے وضو تو کسی پادری کا ہی کام ہے

جان کیٹس شیلے میوزیم روم

یہ بتانا مشکل نہیں کہ سات سمندر پار والے اُس خوبصورت موٹی آنکھوں، کھڑی ناک اور گھنگریالے رومانوی کلاسیکل شاعر کیٹس سے میرا عشق کب شروع ہوا؟ بلکہ اس میں اگر تھوڑا سا اضافہ کروں تو یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس دوڑ میں اس کے دوست شیلے اور بائرن بھی شامل تھے۔ گو کیٹس ہمیشہ میری کمزوری رہا تاہم شیلے بھی کم نہیں۔ ہاں البتہ اس رومینٹک تکون نما مثلث کا تیسرا اسرا لارڈ بائرن کہیں تھوڑا سا پیچھے ہے۔

سچی بات ہے اِس تفصیل کے ساتھ میں نے کہاں پڑھنا تھا انہیں اگر میری بیٹی انگریزی ادب میں ماسٹرز نہ کرتی اور کنیئرڈ کالج میں لٹریچر کی مس کوثر شیخ اُس کی استاد ان شاعروں کی عاشق صادق نہ ہوتی۔ اُن کے عشق میں ڈوبے اس کے طویل لیکچر اور آئے دن کی آسائنمنٹوں نے بیٹی کے ساتھ ساتھ اُس کی ماں کو بھی پڑھنے ڈال دیا تھا۔

اسلامیات اور تاریخ جیسے مضامین کے ساتھ بی اے اور ایم اے کرنے والی ماں

کو احساس ہو گیا تھا کہ انگریزی ادب سے شناسائی اُردو ادب میں اپنا قد کاٹھ بڑھانے کیلئے کتنی ضروری ہے؟ اسی لیے چور رالوں پنڈ کا ہلی کے مصداق بیٹی طالب علم سے زیادہ ماں اُستاد ریفرنس بکس کیلئے بھاگی بھاگی پھرتی تھی۔

مطالعے نے اُن کی زندگیوں کے ایک ایک گوشے سے شناسائی کروا دی تھی۔ دل کی مسند پر البتہ دو نے تو قبضہ کر لیا تھا۔ ساری ہمدردیاں اور محبتیں سمیٹ لی تھیں۔ جان کیٹس اور پرسی Percy Bysshe Shelley دونوں جوانا مرگ۔ ایک تپ دق سے اور دوسرا ڈوب کر۔

روم اور یہیں وہ سپینش سٹیپ زوالا گھر جہاں کیٹس نے اپنی بیماری کے دن کاٹے اور ختم ہوا۔ شیلے بھی اٹلی میں ہی ڈوب کر مرا۔ دونوں دفن بھی روم کے پروٹسنٹ قبرستان میں ہیں۔ ایک کی ہڈیاں اور دوسرے کی راکھ۔ پر کیٹس کی محرومیوں پر دل زیادہ کڑھتا تھا کہ "حسرت اُن غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔" ستم کے نصیب میں کچھ بھی نہ تھا۔ محبوبہ کا پیار بھی نہیں کہ وہ بھی کم بخت بڑی دنیادار اور بے وفا نکلی۔

تو روم پہنچ کر دل کا وہاں جانے کیلئے مچلنا اور ہمکنا سمجھ آتا ہے کہ عاشقوں کی زیارت گاہ ہے۔

راہنمائی کیلئے راہگیر ہی دستیاب تھے۔ تندرست و توانا سے لوگ جنہوں نے سپینش سٹیپ زبارے یوں ہاتھ ہلا کر گلیوں گلیوں سے جانے کا بتایا کہ جیسے یہ گلی کٹی اور اُس گلی کا موڑ مڑوں گی تو محبوب کے در آستانے کا دیدار ہو جائے گا۔ ہاں البتہ ایک معقول سے بندے نے سمجھایا کہ میٹرو سے جائیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔

''ہائے ربا! اس میٹرو کے سیاپے نے جان نہیں چھوڑنی۔''

بہر حال نیچے اُتری۔ چیختی چنگاڑتی دنیا میں داخل ہوئی۔ زیادہ مشکل پیش

نہیں آئی۔ بڑی مہربان سی عورت نے ہاتھ تھام لیا تھا۔ تیسرے اسٹیشن پر اترنے کی تاکیدتھی۔ چلیے یہ معرکہ سر ہوا۔

سپگنا Spagna میٹرو اسٹیشن کے بل سے باہر نکلی تو خوشگوار مسرت بھری حیرت آنکھوں میں پھیل کر ہونٹوں پر بکھر گئی تھی۔ اتنا خوبصورت ماحول سامنے تھا کہ جی خوش ہو گیا۔

تھوڑا سا چلنے پر ہی میں spagna پیازہ سکوائر میں کھڑی اپنے چاروں طرف پھیلی رنگ رنگیلی دنیا دیکھتی تھی۔ موتی اڑاتے Bernin's فوارے کے تعمیری حُسن نے سحر زدہ کرتے ہوئے کھڑا کر دیا تھا۔

''بھلا اس کا نام "بدصورت کشتی والا" فوارہ کیوں رکھا گیا تھا۔ یہ تو بڑی انفرادیت والا ہے۔'' سوال جواب خود سے ہوئے تھے۔ شاہوں کے مزاج اگر موڈی اور متلون ہوتے ہیں تو مذہبی راہنماؤں کا حال بھی کچھ اُن سے کم نہیں ہے۔ پوپ اربن ہشتم کی خواہش پر اس کی تعمیر ہی ایسی ہوئی تھی کہ دریائے ٹیبر Tiber کے ایک سیلاب میں بہتی ایک بدرنگی بے ڈھبی سی کشتی یہاں آ گئی تھی اور پوپ اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔

ذرا سی نگاہیں اوپر اٹھیں۔ کیا نظارہ تھا۔ کشادہ سیڑھیوں کا ایک پھیلاؤ اپنے نقطہ عروج پر خم کھاتے ہوئے ایک اور دل ربا سے منظر کا راستہ کھولتا تھا۔ ایک Obelisk ٹرینٹا مونٹی چرچ کے دو بارونق سٹائل ٹاوروں کے سامنے بڑی آن بان سے کھڑی منظر کو عین درمیان سے کاٹتی تھی۔

چرچ دراصل فرانس والوں کا ہے۔ اللہ کی مخلوق اپنے من موہنے رنگوں کے ساتھ سارے میں بکھری ہوئی تھی۔ کہیں فوارے کے گرد پھیلیں ڈالتی، کہیں بینچوں کی لمبی قطاروں پر بیٹھی، کہیں سیڑھیوں پر ایک دوسرے کی بغلوں میں گھسی، کہیں سیڑھیاں چڑھتی، کہیں اوپر

سے نیچے اترتی، کہیں کیمروں سے کھیلتی اور کہیں بوس و کنار کے مزے لوٹتی۔ اتنے رنگوں کی افراط تھی کہ انہیں دیکھتے رہنا بھی ایک دلچسپ شغل تھا۔

یہ علاقہ تب انگلش گیتو Ghetto کہلاتا تھا کہ آرٹ سیکھنے کیلئے برطانیہ سے بہت سے آنے والے لوگ اسی علاقے میں رہتے تھے۔ روم تو یوں بھی مذہبی، تاریخی اور آرٹ کے حوالوں سے ایک خصوصی اہمیت کا حامل شہر کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ Eternal سٹی (ابدیت) کا نام اسی لیے تو اِسے دیا گیا ہے۔ شیلے اور بائرن بھی یہاں بہت آتے تھے۔

بہت سی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد رُک گئی ہوں۔ سستانا ضروری تھا۔ نظروں کو نظاروں کی تپش سے سیکنا اہم تھا۔ دل کو رجھانا لُبھانا بھی تو تھا۔ اور جب یہ سارے کام کر بیٹھی تو اب خود سے پوچھتی ہوں۔ مجھے جانا کہاں ہے؟ کیٹس کے میوزیم میں یا چرچ میں۔ ایک طرف خدا اور دوسری طرف اُسکا دلبر سا بندہ۔

''ارے بھئی Trinita Monti چرچ کو کیا دیکھنا۔ اللہ کے گھر تو کم و بیش ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ اس دلبر کے پاس چلتی ہوں جس کے لفظوں سے محبت کے سامنے رومن بادشاہوں کا جاہ و جلال، اُنکی تاریخ اور انکی عظمتوں کی داستانیں سب بے معنی ہو گئی تھیں کہ بنگالی لڑکے مستفیض الرحمٰن نے کلوزیم colosseum بارے پل بھر میں گڈے باندھ دیئے تھے۔ پر میرا من چلا دل مائل ہی نہیں ہوا تھا۔

تو میں چار منزلہ عمارت جو کہیں 1725 میں بنائی گئی تھی اور اس وقت کیٹس شیلے ہاؤس کے نام سے روم کی ایک اہم قابلِ دید جگہ ہے۔ اس کی دوسری منزل پر کیٹس میوزیم جانے کیلئے اٹھ جاتی ہوں۔ سیڑھیوں پر بیٹھ کر دل کا رانجھا تو راضی کر لیا تھا۔

اس کے نام کے ساتھ شیلے کے نام والا بڑا سا بورڈ عمارت کی پیشانی پر جگمگاتا ہے۔ کلاسیکل ڈیزائن کی کھڑکیاں بند ہیں۔ عمارت کے باہر سکوائر کا سارا منظر ہی بے حد

خوبصورت اور موہ لینے والا ہے۔اندر جانے کیلئے لمبی قطار ہے جسمیں شامل ہوجاتی ہوں۔مجھ سے آگے کھڑی لڑکی نما عورت بڑی ہنس مکھ سی ہے۔کینیڈا سے شوہر ہندا اور بچوں کے ساتھ آئی ہے۔اور میری طرح سب سے پہلے یہیں آئی ہے۔

26 کا ہندسہ پلیٹ پر چمکتا دُور سے نظر آتا ہے۔ایک چھوٹے سے دروازے کی گزرگاہ سے اندر داخلہ ہوتا ہے۔اس کی دل کو بھگونے والی نظم قدموں کے ساتھ ساتھ چلنے لگی ہے۔ہلکی سی نمی بھی آنکھوں میں اُتر رہی ہے۔

خوف وخدشات کے سائے جب مجھے گھیر لیں
اس سے پہلے کہ
میرا قلم میرے دماغ کی معذوری کا احاطہ کرے
اور کتابوں کے ڈھیر اور اُن کے اندر کی خوبصورتیاں
مجھے گرفت میں لے لیں
اس بھرے غلّے کی کوٹھڑی کی طرح
جو پکے اناج سے بھری ہوتی ہے
جب میں رات کے چہرے کو دیکھتا ہوں
جیسے ایک دلکش رومانس کے دبیز بادل ہوں
سوچتا ہوں کہ میں تو شاید
زندگی کے اِس رخ کو دیکھنے کے لئے زندہ ہی نہ رہوں
ان کے سائے اتفاق کے جادوئی ہاتھ کے ساتھ
جب میں محسوس کروں
صرف ایک گھنٹے کی خوبصورت تخلیق

اور میں اسے اس سے زیادہ نہ دیکھ سکوں

کبھی نہ منعکس ہونے والا پیار

تب ساحلوں پر

اس وسیع وعریض دنیا میں

میں اکیلا کھڑا ہوں اور سوچتا ہوں

محبت اور شہرت سب بیکار ہیں

پس مر جاؤ

اِدھر اُدھر جانے کی بجائے سب سے پہلے اُس کے اُس کمرے میں جانے کی خواہش مند ہوں جہاں اُسنے آخری سانسیں لیں۔ پانچ یورو کا ٹکٹ۔ Attendent لڑکیاں بڑی خوبصورت اور ہونٹوں پر شہد جیسی مسکراہٹ بکھیرے ہوئے ہیں۔

ایک ناقابل فہم ہیجان کی سی کیفیت طاری ہے کہ کبھی روم آنے اور اس زیارت گاہ کو دیکھنے کی خوش بختی کا تو کہیں تصور ہی نہ تھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے راہنمائی کر دی ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ میری دائیں بائیں کسی طرف کوئی توجہ نہیں۔ رک گئی ہوں۔ سانس کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔ سامنے وہ کمرہ ہے۔ جس پر پیتل کی بڑی سی پلیٹ پر لکھا ہوا پڑھنے لگتی ہوں۔

In this room,

on the 23rd of February 1821

Died

John Keats

آنسوؤں کو پلکوں سے نیچے نہ اُترنے میں تھوڑی سی نہیں بہت کوشش کرنی پڑی

ہے کہ رُک کر گردن کو پیچھے لے گئی تھی۔

یہ کمرہ اس کے زمانے میں دو حصّوں میں منقسم تھا۔ایک مالک مکان اپنا Angeletti کے تصرف میں اور بقیہ حصّہ جسکا چہرہ میدان کی طرف تھا کیٹس اور جوزف سیورن کے پاس تھا۔

میں نے مارگریٹ (نگران) سے چند لمحوں کیلئے کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت لی ہے۔وہ کمرہ جہاں وہ چھبیس سالہ خوبصورت آنکھوں، چہرے اور خوبصورت دماغ والا شخص موت کے ہاتھوں کی ظالم گرفت میں جکڑتا چلا گیا تھا۔شیشوں سے پار سکوائر میں زندگی کتنی خوش وخرم، ہنستے، مسکراتے، قہقہے لگاتے نظر آرہی ہے۔

میری تیسری آنکھ کھل گئی تھی جس نے ماہ نومبر کے کسی چمکتے خوشگوار سے دن کو سکوائر میں بھاگتی بگھیوں اور اُن میں جتے گھوڑوں کے سموں کی ٹھپ ٹھپ اُسے سُناتے اور شیشوں میں سے زندگی کو آج ہی کی طرح رواں دواں دکھاتے ہوئے یقیناً اُسے اپنی صحت کے حوالے سے ایک نوید دی ہوگی۔میٹھی سی اِس نوید نے پل بھر میں گنگناتے خوابوں کو اسکی آنکھوں میں بیدار کر دیا ہوگا۔وہ خواب جنہیں وہ جوان ہونے کے بعد سے دیکھتا چلا آیا تھا۔

مارگریٹ نے مجھے بتایا ہے کہ منظروں کی یکسانیت میں تب اور آج کے حوالوں سے کچھ زیادہ فرق نہیں۔میں نے دیکھا تھا۔بگھیاں تو اس وقت بھی سکوائر میں بعینہٖ اُن دنوں کی طرح بھاگتی دوڑتی پھر رہی تھیں۔

اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھنے والے سمجھدار اور ذہین لوگ اپنے تاریخی ورثوں اور اُن مخصوص روایات کو اسی ماحول سے ہم آہنگ کرتے ہوئے وقت کی چال کو اسی روپ میں نہلاتے ہوئے لوگوں کو مسرت وسرشاری سے نوازتے ہیں۔اب میں مقابلہ "من و تو" میں کہاں کھپتی اور اپنا خون جلاتی۔

کمرہ اس وقت کتنا چمکتا دمکتا ہے۔کھڑکی کے پردے کھینچے ہوئے ہیں۔ڈیتھ ماسک سامنے دیوار پر آویزاں ہے۔ساتھ ہی چھوٹا سا شوکیس سجا ہے۔ذرا فاصلے پر ایک بڑا شوکیس اور درمیان میں آتش دان ہے۔تب یہ کمرہ یقیناً ایسا شاندار تو نہ تھا۔عام سی دیواروں، چھت اور کھڑکی والا تھا۔

گلاب کے پھول بکتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا تھا۔پھول تو آج بھی ہیں۔یہ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے جوڑے اُس وقت بھی تھے جب نومبر کی سنہری اُترتی شاموں میں وہ اپنے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اُتر کر سیر کیلئے بورگیز باغ Borghese جاتا۔تب نیلے آسمان پر پرندوں کی اڑانیں دیکھتے ہوئے کبھی اس کا دل غم سے بھر جاتا اور کبھی امید اُسے خواب دکھانے لگتی۔

تصور کی آنکھ کھل گئی ہے اور منظر کسی نازنین کی نشیلی آنکھ کے خمار سے بھر گیا ہے۔میٹھی آواز کا جادو چاروں اور پھیل گیا ہے۔"A thing of Beauty" میرے لبوں پر آگئی ہے۔دنیا بھر میں حسن وخوبصورتی کے حوالے سے ایک مثالی محاورہ بننے والا یہ مصرع A thing of Beauty is a joy for ever اُسی شاعر کا ہی ہے۔جو لافانی ہونے کی تمنا رکھتا تھا۔

حُسن ہمیشہ رہنے والی ایک خوشی ہے
اس کی خوبصورتی بڑھتی رہتی ہے
یہ کبھی فنا نہیں ہوتی
ہمیشہ اپنے وجود کو قائم رکھتی ہے
جیسے یہ ہمارے لئے پھولوں کا کوئی پرسکون کنج ہو
یا نیند جو میٹھے خوابوں سے بھری ہو

جس میں تندرستی یا صحت اور خوشگوار

سانسوں کی مہک ہو

ایسے شعر کہنے والا میٹھے خوابوں کا مژدہ سنانے، صحت کا پیغام دینے اور مہکتے سانسوں کی روانی رواں رکھنے والا غموں کی بھٹی میں کیوں کر گر پڑا۔

اُسے فیئنی یاد آتی تھی جو لندن میں تھی۔ اسکی یاد اسکی آنکھیں بھگو دیتی۔ اُس کی محبت، منگنی اور پھر اسکی بیماری کا جان کر التفات بھرے اظہار میں اس کی بے رُخی اور بے نیازی جیسے رویئے۔

مجھے بھی فیئنی یاد آئی تھی۔۔بہت سی یادوں نے گھیراؤ کر لیا تھا۔

فیئنی ہمسائی تھی اس کی۔ بیوہ ماں کی پہلوٹھی کی اولاد۔ سترہ اٹھارہ سالہ مُٹیار اور تیئیس 23 چوبیس 24 سال کے جذباتی سے جوشیلے لڑکے کا پیار ہمارے وقتوں کے گلی کوچوں جیسا۔ سانجھی دیواروں سے تانکا جھانکی، چٹوں کی پھینکا پھینکائی اور چھوٹے بہن بھائیوں یا کزنوں کے ہاتھوں چوری چھپے خطوط کا تبادلہ۔ منگنی بھی کروائی تھی۔ پر یار دوستوں کا کہنا تھا کہ یہ خوبصورت لڑکی ناقابل اعتبار ہے۔ مگر اس کا دل تھا کہ بے طرح لٹو تھا۔ ہر دوسرے دن لمبا چوڑا خط لکھنا ضروری ہوتا۔ ہر تیسرے دن محبت کی تجدید چاہتا۔

میری پیاری فیئنی کیا میں امید کروں تمہارا دل کبھی نہیں بدلے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے پیار کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ دیکھو مجھے کبھی مذاق میں بھی دھمکی نہ دینا۔

ایک اور خط میں لکھتا ہے میں بہت حیران ہوتا ہوں کہ آدمی مذہب کیلئے مرتے ہیں تو شہید کہلاتے ہیں۔ میں تو سچی بات ہے اِس خیال اور نظریے پر ہی تھرّا اٹھتا ہوں۔ میرا مذہب محبت ہے۔ میں صرف اس کے لئیے مر سکتا ہوں۔ میں تمہارے لئیے جان دے سکتا ہوں۔

ایک اور خط دیکھیے ۔ محبت اور چاہت میں بھیگا ہوا۔ دنیا میں کیا کوئی چیز اتنی خوبصورت، چمک دار اور من موہنے والی ہے جتنی تم ہو۔

Bright Star یادداشتوں سے نکل کر لبوں پر آ گئی ہے۔

روشن ستارے

روشن ستارے کاش میں آرٹ کی طرح امر ہو جاتا

میں بھی فطرت کے کسی رسیا کی طرح

جاگتے رہنے والے کسی رشی منی کی طرح

رات کے خوبصورت جلووں میں کبھی اکیلا تو نہ ہوتا

اس ابدی حسن کو آنکھیں کھول کر دیکھتا

دھرتی کے انسانی ساحلوں کے گرد

رواں پانیوں سے وضو تو کسی پادری کا ہی کام ہے

کیسی خوبصورت شاہکار نظم ۔ ابدی چمکنے والے ستارے جیسا بننے کی تمنا۔ لافانی ہونے کی خواہش ۔ اپنی محبت اور چاہت کا دل آویز اظہار۔

اس نے اپنے جنون، اپنی وارفتگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی محبوبہ کے ساتھ ابدیت کی ایسی خواہش کی جسے وقت اور حالات کبھی تبدیل نہیں کرتے ۔ اس روشن ستارے کی طرح جو اپنی جگہ پر ہمیشہ ساکت رہتا ہے۔ وہ تنہائی سے خائف اس کی محبت اور رفاقت کیلئے بے قرار اور اس کے بغیر مر جانے کا خواہش مند۔ ستارے زمین اور پانیوں کے تشبیہاتی استعاروں والی یہ نظم اعلیٰ شاعرانہ ذوق کی حامل جسے پڑھتے ہوئے ہم ماں بیٹی نے لطف اٹھایا تھا۔

موت سے ایک سال قبل مئی 1820 کا خط ذرا دیکھیے ۔

تم کتنی خودغرض ہو، کتنی ظالم ہو۔ مجھے خوش رہنے نہیں دیتی ہو۔ میرے لیے تمہاری محبت کی استقامت کے سوا کسی چیز کی اہمیت نہیں۔ تمہیں فلرٹ کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ مسٹر براؤن سے بھی یہی سلسلہ ہے۔ کیا کبھی تمہارے دل نے میرے بارے میں ذرا سا بھی سوچا ہے۔ مسٹر براؤن اچھا آدمی ہے مگر وہ مجھے انچ انچ موت کی طرف لے جا رہا ہے۔

اس کے مہکتے خواب بکھر گئے۔ دہکتا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن رہا تھا۔ اس کے سانسوں کی ڈوری کتنی جلدی ٹوٹ گئی۔

بیماری تو وراثت میں ملی تھی کہ ماں اور بھائی ٹوم دونوں اسی سے مرے تھے۔

مجھے 1816 میں لکھی جانے والی اسکی پہلی First looking into chapman's Homer اور دیگر "ode to a nightingale" اور "ode on a grecian" دونوں یاد آئی تھیں۔

اس نے سارے سفر بڑی سرعت سے طے کیے تھے۔ صرف چھ سال کا مختصر سا وقت۔ جس میں حیران کن حد تک ہر دل عزیزی سمیٹی۔ شاعری، محبت، منگنی، بیماری اور موت۔ پہلے مجموعے Chapman's Hamer نے لوگوں کی توجہ کھینچی۔ مگر ساتھ ہی نک چڑھے نقاد اسے تباہ کرنے پر بھی تُل گئے تھے۔ 1818 میں اس کی ambitious زیادہ بہتر رہی۔ یہاں اُسے ہنٹ، ولیم اور بینجمن ہائیڈن نے بہت سراہا۔

1819 اسکی تخلیقی صلاحیتوں کا بہترین زمانہ تھا۔

وہ فینی کی محبت میں گرفتار رہا۔ Bright Star اور The Eve of St Angles جیسی شاہکار نظمیں تخلیق ہوئیں۔

میری نظریں بے اختیار اُس بیڈ پر جم گئی ہیں۔ نہیں جانتی ہوں کہ اس کی ترتیب

اُس وقت بھی یہی تھی جواب ہے کہ آخری دنوں میں وہ زیادہ تر اپنے بیڈ پر ہی رہنے لگا تھا۔یہی کھڑکی جواس وقت میرے سامنے ہےاس کی دلچسپی اور دنیا سے رابطہ کاواحد ذریعہ رہ گئی تھی۔اسی سے وہ سپینش سٹیپ ز اور برنینز Bernins کشتی کو دیکھتا۔آسمان،موسم،لوگ،درخت اور زندگی کے کچھ رنگ اسی سے اُسے نظر آتے تھے۔

منظر کسی فلم کے سین کی طرح بدل گیا تھا۔سکوائر میں فروری کے آخری دنوں کی صبح کتنی دُھند اور سردی میں لپٹی ہوئی تھی۔درختوں کی چوٹیوں پر دھرنا مارے بیٹھی برف دنوں پہلے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرتی رہی تھی۔سارے ماحول پر اُداسی اور تھکن کے سائے لرزاں تھے۔

کمرے میں کھڑے جوزف Severn نے اپنی تھکن کی لالی سے لبریز آنکھوں کو باہر سے اٹھا کر اندر پھینکا ہے۔چار راتوں سے جاگتا اُسکا جسم اسوقت پھوڑے کی طرح درد کررہا ہے۔کمرے کی فضا میں کسی نحوست کے سائے سے بکھرے نظر آتے ہیں۔دوسرے بیڈ پر گٹھڑی سی بنی ہڈیوں کی مٹھ میں سے ایک دل خراش سی آواز گندی مندی سی منحوس دیواروں سے ٹکراتی کمرے میں بکھرتی ہے۔

''سیورن''(Severn)

سیورن فوراً سے پیشتر اُس گٹھڑی کو کلاوے میں بھرلیتا ہے۔

''سیورن میں مر رہا ہوں۔میرا سر اوپر کردو۔ڈر کیوں رہے ہو؟سیورن ذرا سا اوراوپر کرونا۔''

چھبیس سالہ جوزف سیورن Severn یادداشتوں میں ابھر آیا ہے۔یہ سنہری گنگھریالے بالوں،خوبصورت خدوخال والا دلکش نوجوان آرٹسٹ بہت دن گزرے شاعر کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔اُن محفلوں میں اُس کا جانا اور شاعر کیلئے محبت کے جذبات رکھنے

کی پذیرائی نہ شاعر کی طرف سے ہوئی اور نہ اس کے دوستوں نے اُسے قابل توجہ گردانا۔ مگر وہ اس کے ایک خاموش پرستار کی صورت اُن محفلوں میں جاتا رہا جہاں شاعر اپنا کلام سُناتا تھا۔

سیورن اپنے فن کے مزید نکھار کیلئے روم جانے اور آرٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا بڑا خواہشمند تھا۔ موقع ملا تو اس کی تکمیل کیلئے روم چلا آیا۔ محبت اور عقیدت رکھنے والے نے تو کبھی شاعر کی نجی زندگی میں جھانکا ہی نہ تھا کہ اُسے دُکھ کون کون سے ہیں؟

وہ حیران رہ گیا تھا جب اُسے خط ملا۔ کیٹس بیمار تھا۔ اُسے تپ دق تھی۔ ڈاکٹروں نے اُسے روم جانے اور وہاں رہنے کا مشورہ دیا تھا کہ یہاں کی آب و ہوا اُس کیلئے صحت کی پیامبر بن سکتی ہے۔ وگرنہ لندن کی سردی اُسے مار دے گی۔ اُسے شاعر کیلئے روم میں گھر لینے اور اُسے اٹینڈ کرنے کی درخواست تھی۔

اور یہ سیورن تھا اور یہی وہ گھر تھا جہاں وہ اُسے لے کر آیا اور اُس کی نرس بنا۔ اُسے لانے اور اسکی خدمت گیری کرنے میں اس کی فیملی کے بہت سے لوگوں کی مخالفت تھی۔ سب سے بڑا مخالف تو باپ تھا جسنے بھناتے ہوئے اُسے کہا تھا۔

''تم پیشہ ور آدمی ہو۔ سیکھنے کیلئے روم گئے ہو۔ کیسے اُسے وقت دو گے؟ اپنا نقصان کر کے اور سب سے بڑی بات وہ بیمار ہے۔ چھوت کی یہ بیماری تمہیں لگ گئی تو کیا بنے گا؟ باز آؤ اس سے۔ مگر اُسنے نہ کچھ سُنا اور نہ کچھ سوچا۔

چار ماہ کا یہ وقت اگر کیٹس کیلئے تجربات اور دوستوں رشتوں کی پہچان کا تھا کہ کون سے ایسے کڑے وقت اس کے ساتھ کھڑے تھے اور کون سے کان منہ لپیٹ کر روپوش ہو گئے تھے۔ تو یہ بھی قابل ذکر بات تھی کہ سیورن اپنی شخصیت کی بھرپور خوبیوں کے ساتھ اُبھر کر اس کے سامنے آیا تھا۔ یہی سیورن جسے کیٹس نے کبھی اہمیت ہی نہ دی تھی۔

پہلی بار وہ اُس کے قریب ہوا۔دل کے قریب اور جانا کہ فینی براؤن Browne سے علیحدگی کے غم نے کیسے کیٹس کو غموں کے پاتال میں پھینک دیا تھا۔

وہ کبھی کبھی اُس سے کہتا تو جب میں ٹھیک تھا،تندرست تھا وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔اور جب میں بیمار ہوا اُس کی محبت کہاں گئی؟

کچھ باتیں پھر یادوں میں اُبھری ہیں۔اپنے کسی خط میں سیورن Severn جوزف نے لکھا تھا۔ابھی ابھی وہ سویا ہے۔میرے لیے ہر دن اُسے نمک کی طرح گھلتے دیکھنا کتنا تکلیف دہ ہے؟شاید اگلے ماہ بہت بُری خبر کے ساتھ طلوع ہو۔جب میں اُسے لیکر چلا تھا تو مجھے اس کی صحت یابی کا یقین تھا۔مگر اب؟

ہاں پیسے بھی ختم ہوگئے ہیں۔آخری چند کراؤن ہی رہ گئے ہیں۔بل واپس آگیا ہے۔بیکر نے چیزیں دینے سے انکار کردیا ہے۔میرے لیے باہر نکلنا اور دو گھنٹے کیلئے پینٹنگ سے کچھ کمانا ناممکن ہوگیا ہے کہ اُسے میری چند لمحوں کی دوری بھی برداشت نہیں۔کس امید کا پلّہ اُسے پکڑاؤں۔یہ بہت اذیت میں ہے۔اس کا خدا پر یقین اور ایمان تو پہلے ہی نہیں تھا۔چلو عقیدے کی مضبوطی اور توانائی بھی کہیں تکلیف کی شدت میں کمی کا باعث بن جاتی ہے۔اگر کچھ کہتا ہوں تو لعن طعن سنتا ہوں۔اب مجھے تو سمجھ نہیں آتی ہے کہ میں کیسے اس کے زخموں پر پھاہا رکھوں۔اور ہاں دیکھو نا زندگی کا کوئی فلسفہ،مذہب کی کوئی تھیوری کسی نہ کسی حوالے سے مطمئن کرنا اور مطمئن ہونا بھی کتنا ضروری ہے؟

آنکھیں پھر کہیں وقت کی تہہ میں گھس کر ایک اور منظر سامنے لے آئی ہیں۔نڈھال سا ایک جسم۔ایک کمزور شکستہ سی آواز کمرے کے سناٹے میں ذرا سا شور کرتی ہے۔

''میرا دل اس وقت کیفے Greco میں کافی پینے کو چاہ رہا ہے۔چلو وایا ڈی

کون ڈوٹی Via dei condotti چلتے ہیں۔''

سیورن نے جنوری کی اِس یخ بستہ شام میں اُسے دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُترنے میں مدد دی۔ یہ بھی محسوس کیا کہ اُس کی صحت بہتر ہونے کی بجائے زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیتے ہوئے اُس نے کھڑکیوں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''جانتے ہو شیلے اور بائرن جب بھی روم آئے اسی کیفے میں کافی پینے آتے ہیں۔ سیورن شیلے بھی کیا کمال کا شاعر ہے۔''

اور جب وہ بائرن اور شیلے کے ساتھ اپنی محبتوں کا ذکر کرتا تھا۔ اُس نے بہت سے اوراپنے گہرے دوستوں کے نام لینے سے گریز کیا تھا۔ اب ہانٹ کی بیوی کو تپ دق ہے۔ اس کے ڈھیر سارے بچے ہیں اور اس پر قرضوں کا بوجھ ہے۔ اُس نے اپنے خوبصورت سر کو مایوسی سے ''ہونہہ'' کے سے انداز میں ہلایا تھا۔ بچنے اور جان چھڑانے کے کتنے خوبصورت بہانے ہیں۔ لیکن یہی تو وہ کڑا مقام ہے جہاں پرکھ کی کسوٹی پر رشتے اور تعلقات پہچانے جاتے ہیں۔

اٹھنے سے قبل اسنے کہا تھا۔

''Leigh Hunt کی یاد نے مجھے مضطرب کر دیا ہے۔ مگر سیورن تمہیں تو میں جان ہی نہ سکا کہ تم کتنے عظیم ہو۔''

اس کی آنکھیں احساس جذبات نے بھگو دی تھیں۔

کیفے ہاؤس کا پرانا بوڑھا اب Saxo phone بجا رہا تھا اور وہ دھیمے دھیمے When I have fears کو گنگنانے لگا تھا۔

When I have fears that I may cease to be

Before my pen has glean'd my teeming brain

اُس کی صحت دن بدن گرتی جارہی ہے۔کتنا بدمزاج اور چڑچڑا ہوتا جارہا ہے۔گالیاں نکالتا ہے۔ہر بات کو شک وشبے کی نظر سے دیکھتا ہے۔

ابھی ایک نئے منظر نے دروازہ کھولا ہے کمرے میں شور ہے۔کیٹس ہاتھوں میں پکڑے تکیے کو کبھی بیڈ کی پائینتی،کبھی اسکے سرہانے اور کبھی کمزور ٹانگوں پر مارتے ہوئے اپنے حلق اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلاتے ہوئے کہتا ہے۔

’’تمہیں کیا تکلیف ہے آخر۔میرے لئے عذاب بن گئے ہو۔

مرنے دو مجھے۔لوڈنم Laudanum کی شیشی تم نے کہاں چھپا دی ہے؟ذلیل انسان کیوں نہیں دیتے ہو مجھے۔کیا کرنا ہے مجھے زندہ رہ کر۔‘‘

اُس کا سانس اکھڑنے لگا ہے۔بلغم حلق سے جیسے اُبلنے لگی ہے۔سیورن نے فوراً بڑھ کر اُسے کلاوے میں بھر کر اس کا سر جھکاتے ہوئے کہا ہے۔

’’چھینکو اسے،نکالو اندر سے۔‘‘

اس کے بازوؤں میں نڈھال سا وہ پھر ضدی بچے کی طرح کہتا ہے۔

’’مرنے دو مجھے۔‘‘

اور پھر وہ کسی کٹی شاخ کی طرح اس کے بازوؤں میں جھولنے لگا ہے۔اس نے دھیرے سے اُسے لٹا دیا ہے۔سانس کیسے چل رہا ہے۔آنکھیں بند ہیں۔چہرہ پسینے سے تر ہے۔سیورن اس کے بیڈ پر بیٹھا اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے سوچے چلے جارہا ہے۔

سوچے چلا جارہا ہے۔

بہت سے اور دن گزر گئے ہیں۔ہر دن اُسے موت کی طرف لے جارہا ہے۔ایسی ہی ایک غم زدہ اور المناک صبح میں وہ سیورن کو ہیجانی انداز میں کہتا ہے۔

''مجھے تھام لو۔ڈرو نہیں ۔دیکھو موت مجھے لینے کے لئے آ گئی ہے۔میرے جسم کی پور پور میں درد ہے۔مجھے لگتا ہے کہ سانس جیسے میری پسلیوں میں ٹھہر گیا ہے۔میرے اندر شاید اب کچھ نہیں ۔خون کا قطرہ بھی نہیں ۔

شیشوں سے باہر کی دُنیا میں کتنی چہل پہل ہے؟ کتنے رنگ کھلے ہوئے ہیں ۔یہاں اندر کتنا سناٹا اور کتنی خاموشی ہے؟

کچھ اور دن گزر گئے ہیں ۔موسم نے تھوڑی سی انگڑائی لی ہے۔لنڈ منڈ درختوں پر سرسبز روئیدگی پھوٹ رہی ہے۔سیورن بے چین اور مضطرب ہے۔اُسے محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کا سانس کہیں اٹکا ہوا ہے۔بس کسی لمحے کا منتظر ہے۔اور یہ لمحہ بالآخر تئیس (23) فروری کی شب کو جب سیورن نے اُسے اپنے کلاوے میں بھر کر چھاتی سے چمٹایا تو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب اُس کے اندر سے کوئی چیز نکلی اور پھر سے بند کھڑکیوں کی کسی چھوٹی سی درز سے باہر نکل گئی۔

خوبصورت کمروں کے ایک پھیلے ہوئے سلسلے میں گھستے ہوئے بے اختیار ہی میں نے سوچا تھا کہ زندگی میں جن چیزوں کیلئے بندہ ترستا ہوا مر جاتا ہے۔موت بعض اوقات کتنی فیاضی سے وہ سب کچھ اُسے دان کر دیتی ہے۔یہ سب جو یہاں بکھرا ہوا ہے اسکے لافانی ہونے کی خواہش کا عکاس ہی تو ہے۔

یہ سیورن کا کمرہ ہے۔اُن تصویروں کے پاس کھڑی ہوں جو کیٹس کے بھائیوں کے پورٹریٹ ہیں اور جنہیں سیورن نے بنائے۔فینی براؤن کے پورٹریٹ کو بہت دیر دیکھا ہی نہیں اُس سے باتیں بھی کیں۔

''کبھی تم نے اپنے مقدر پر رشک کیا۔تم عام سے گھر کی عام سی لڑکی جسے شاعر کی محبت نے کتنا خاص بنا دیا کہ انجانی سرزمینوں اور دور دیسوں کی لڑکیاں اور عورتیں شاعر کو

پڑھنے والے مرد اور لڑکے تم سے محبت اور نفرت کے ساتھ ساتھ تم پر رشک بھی کرتے ہیں۔

Leigh Hunt اور ولیم ورڈزورتھ کے پورٹریٹ۔ کیٹس کا لائف ماسک اور اس کی نظموں کے پہلے ایڈیشن یہاں ہیں۔

بڑے کمرے میں کرسیاں ،تصویریں، خوبصورت فرش، چھت کو چھوتی الماریاں، دنیا بھر کے رومانی لٹریچر کے خزانوں سے بھری ہوئیں۔ نادر و نایاب چیزوں سے سجی ہوئیں۔ چھوٹا سا دروازہ ساتھ کے کمرے میں کھلتا ہے۔شوکیسوں میں اسکے سکرپٹ، فریم کیے ہوئے خطوط، ڈرائینگو کیٹس کی مدح میں ایک سونیٹ، اسکے سنہری بال، فینی کی انگوٹھی، آسکر وائلڈ کی تحریر، والٹ وٹمین Walt Whitman کی ذاتی لکھائی میں لکھا گیا مضمون۔ ماسک جیسے بائرن نے venetian carnival پر پہنا۔ الزبتھ Barrett کا تعریفی خط اور خوبصورت سینریاں سب ماحول کو اس مخصوص فضا میں لے جاتے ہیں۔ مجسمے اور دیدہ زیب فرنیچر شان میں مزید اضافے کا موجب ہیں۔

اسے میوزیم بنا دینے کی داستان بھی بڑی عجیب ہے۔

وہ کمرے جن میں کیٹس اور سیورن رہے تھے اُن میں 1903 میں امریکی لکھاریوں کا ایک جوڑا ماں بیٹا جمیز وال کوٹ Walcott یہاں ٹھہرے اور انہوں نے یہاں کافی وقت گزارا۔ دونوں کو بڑا تجسّس تھا۔ کمروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ خاتون اسے خریدنا اور ایک یادگار کے طور پر محفوظ کرنے کی حد درجہ خواہش مند تھی۔ جذبے بڑے طاقتور تھے مگر پیسہ پاس نہیں تھا۔

انہی دنوں ایک امریکی شاعر رابرٹ انڈر ووڈ جانسن نے اسے دیکھا اس کی ابتر حالت نے اسے بہت متاثر کیا۔ روم میں رہنے والے بہت سے امریکیوں کو اس نے آواز

دی۔ان کاوشوں نے برطانوی ڈپلومیٹ رینل روڈ(Rennell Rodd) کی توجہ کھینچی۔اُس نے اس اجلاس کی صدارت کی۔جس نے گھر خریدنے اور اس ادبی ورثے کو محفوظ کرنے کی حکومتی سطح پر کاوشیں کی تھیں۔

1906میں اسے ایڈورڈ ہفتم کی مالی اعانت سے خریدا گیا۔

دوسری جنگ عظیم میں بھی اسے نازیوں کے ہاتھوں محفوظ کرنے کی حد درجہ کوششیں ہوئیں۔

چھوٹے سے سینما گھر میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔تھوڑی دیر ڈاکومنٹری دیکھی۔گفٹ شاپ میں کتابوں کی قیمتوں کا جائزہ لیا۔میرے حساب سے مہنگی تھیں۔تین دن میں نے روم میں رہنا تھا۔کتابوں کی دکانوں پر جانا بھی ضروری تھا تو جلدی کاہے کی ہے۔خود سے کہا گیا۔

دونوں لڑکیوں کو رخصت ہونے سے قبل خدا حافظ کہا۔اُن کی یہ بات کتنی اچھی لگی تھی۔

یہاں آنے والے کچھ لوگوں کو علم ہوتا ہے کہ وہ کہاں آئے ہیں۔مگر کچھ لوگ جب یہاں سے رُخصت ہوتے ہیں۔تب جانتے ہیں کہ وہ کہاں آئے تھے۔

اس کی قبر پر کیا عمدہ لکھا ہوا ہے۔مارگریٹ نے ہی بتایا تھا۔

یہاں وہ شخص لیٹا ہوا ہے۔جس کا نام پانیوں پر لکھا ہوا ہے۔

کاش وہ اپنی چھوٹی سی عمر میں جان سکتا کہ صدی کی اگلی نصف دہائیاں اُس کے لئے بے پناہ شہرت لے کر آنے والی ہیں۔

اور وہ وقت بھی آنے والا ہے جب وہ سب سے زیادہ پسندیدہ اور ریکارڈ کرنے والا شاعر بن جائے گا۔

☆☆☆

گوزیو کاردوسی

Giosue Carducci

اٹلی کا پہلا نوبل ایوارڈ یافتہ قومی شاعر

- اٹلی کے پہلے نوبل ایوارڈ یافتہ قومی شاعر کوزیو کاردوسی کی سوچ بڑی انقلابی تھی۔
- اُس کا کہنا تھا کہ شاعری ہی وہ ہتھیار ہے جو کسی بھی قوم کے شعور کی بیداری اور اُسے سیاسی بلوغت دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔
- شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھا استاد، بہترین نثر نگار اور تنقید نگار بھی تھا۔
- ملکی سیاست میں بھی وہ بڑا فعال تھا۔

شمال کی کہر آلود زمینوں کی دختر

یہ چھوٹا سا اظہارِ تحسین اُس کے لیے ہے
جو بربط کے تاروں کو کسی
ان دیکھے ہاتھ سے چھوتا ہے
اور کوئی قدیم سی دھن نکالتا ہے
نئی موسیقی میں سمونے کے لیے
معاف کرنا اگر کوئی تند و تیز سُر نکل آئے
تمہاری سحر آگیں موسیقی کی تانیں
جنھیں تمہاری اعلیٰ روح شاید ہی سمجھ سکے
لیکن تمہارا شہد جیسا میٹھا گلا
شاید اس کا کوئی سراغ پا جائے
قدیم اٹلی کے دیوتا اور سمندری دیویاں
دیکھو پہاڑ جنگل، گھاٹیاں اور وادیاں
تمہاری کاہلی، سُستی، تمہارا فخر و غرور
تمہارا جوش و اضطراب، تمہارا رشک و حسد
سب کھیل کو برابر کرتے ہیں
محبت اور پیار کو ان سب پر غالب آنے دو

گوزیو کاردوسی Giosue Carducci

پہلا تعارف روم میں ایزولیٹا کی زبانی ہوا تھا۔ اپنے قومی اور نوبل انعام یافتہ شاعر پر بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ خاصا پر غرور سا تھا۔ تفصیلی تعارف مسز ریٹا سمتھ کی سٹڈی روم میں ہوا۔ یوں یہاں دانتے Danta کانسی کے بڑے اور گوزیو کاردوسی Giosue Carducei ذرا چھوٹے دیدہ زیب مجسموں کی صورت موجود تھے۔ دانتے سے تعارف ڈیوائن کومیڈی کے حوالے سے پرانا تھا۔ مگر اس کی مخصوص طوطے جیسی ناک سے شناسائی یہاں اٹلی میں ہوئی۔

مگر یہ صورت۔ وجاہت برستی تھی۔ بنانے والے کی ہنر مندی کو بھی سراہنا پڑا تھا کہ دانشوری کا گھمبیر سا تاثر فنکار نے کمال فن کی صورت چہرے پر بکھیر دیا تھا۔ داڑھی اور مونچھیں بھی کمال کی تھیں۔ یہ صدی دو صدی پہلے کے بڑے بڑے لکھاری، دانشور، سائنس دان اور فنون لطیفہ کے ماہر اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود اتنی بڑی بڑی مونچھیں اور داڑھی رکھتے تھے۔ کیا ایسا کرنا تب معاشرے میں مردانگی کی علامت سمجھی جاتی تھی یا پھر ست الوجودی اور کاہلی کا کوئی مسئلہ ہوتا تھا؟

مسز ریٹا کے لہجے میں بھی چھلکتے فخر کا احساس اور اظہار بڑا زوردار قسم کا تھا۔

''ہمارے ملک اٹلی کا پہلا نوبل ایوارڈ یافتہ اور ماڈرن اٹلی کا قومی شاعر۔''

دراصل شدید خواہش کے باوجود مسز سمتھ کا سٹڈی روم میرے لئے ابھی تک شرلک ہومز جیسا اسرار لئے ہوا تھا۔ پہلے دن کی پہلی شام اس کے دروازے ضرور کھلے تھے مگر اندر جانے، وہاں بیٹھنے اور شیلفوں میں بند ہیروں کو دیکھنے کی حوصلہ افزائی نہ تھی۔ آج شام کو ان کے گھر جاتے ہوئے میں نے دل میں کہا تھا۔

''اب دم واپسی ہے۔ ڈھیٹ بن کر مدّعا ضرور گوش گزار ہوگا۔''

وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئیں۔ روم کے بارے باتیں ہوئیں۔ میرے تاثرات اور تجربات بڑے ہی دل خوش کن تھے۔ پیسا کے بارے بھی بتایا کہ کل وہاں جانے کا ارادہ ہے۔ مسرور ہوئیں۔ پھر درخواست کو بھی پذیرائی ملی۔ کتابوں، مجسموں اور پھول پتوں میں گھرے کمرے میں سانس لیتے ہوئے اپنے اندر سرشاری کی سی کیفیت روح تک میں اُترتے محسوس کرتے ہوئے میں فکر و آگہی کی دنیا میں داخل ہوئی تھی۔

میں شاعر سے تفصیلی متعارف ہونا چاہتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا جیسے شناسائی کی ساری منزلیں مسز ریٹا سمتھ خود طے کروانا چاہتی تھیں کہ شاعر سے بڑا عشق تھا۔ مگر میں بھی ایک نمبر کی کائیاں۔ میرے دل نے کہا تھا۔

''آپ کی محبت کا بہت شکریہ۔ مگر پلیز جانیے میرا تو رشتہ ہے اس سے۔ میرے قلم قبیلے کا فرد ہے۔''

مسز سمتھ کی مہربانی، اُن کی نوازش کہ انہوں نے بھاپ اڑتی کافی کا مگ مجھے پکڑایا۔ بھاپ کے مرغولوں میں سے جھانکتی، شیلف پر سجی بے حد ذہین آنکھوں نے مجھے دیکھا۔ مسکراتے ہوئے میں نے کہا۔

''کوزیو تمہاری زبان سے سننے کا تو اپنا ہی لطف ہوگا۔اور تمہیں تو انگریزی پر بھی بہت عبور ہے۔''

میں نے گھونٹ بھرا۔ایک بھاری سی آواز گونجی تھی۔ایک سوال ہوا۔

''تم لوکا Lucca دیکھا ہے؟''

''کل پیسا کے لئے روانگی ہے لوکا بھی جاؤں گا۔فلورنس کا بھی پروگرام ہے۔

میرے لہجے میں کہیں مسرت اور کہیں شوق کا اظہار تھا۔

''لوکا بہت خوبصورت جگہ ہے۔تمہارے اِس شاعر نے لوکا Lucca کے ایک چھوٹے سے قصبے والدی کیسٹلو Valdicastello میں 1835 کے سال جنم لیا تھا۔

ارے ہاں یاد آیا۔بتاتا چلوں تمہیں کہ اس جگہ سے قریب ہی وہ سمندر ہے جہاں انگریزی ادب کا وہ مشہور شاعر شیلے ڈوب کر مر گیا تھا۔''

''ہائے۔'' میرے اندر سے ہوک اُٹھی تھی۔کیا خوبصورت شاعر تھا؟

میرا گھرانہ قدیم فلورنٹائن روایات کا اسیر تھا۔میرے دادا کو اپنے وقت کی انقلابی تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ہاں اُسے اپنے ڈیوک سے بہت پیار تھا مگر میرے بابا میخائل کاردوسی جو ایک مائننگ کمپنی میں ڈاکٹر تھا۔بڑا انقلابی تھا۔اٹلی کے اتحاد کا سب سے بڑا داعی۔کاربونیری Carbonari (اٹلی کی خفیہ تنظیم آزادی) کے ساتھ منسلک ہونے اور ملکی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے کی پاداش میں وقت کے حکمرانوں کی آنکھوں میں کھٹکتا اور نتیجتاً خاندان کو ٹک کر ایک جگہ رہنا نصیب نہ ہوتا۔شاعر کا سارا بچپن اِدھر اُدھر گھومتے گزرا تھا۔اسی دربدری میں کچھ سال فلورنس میں بھی گزرے۔

اگر میں اپنے بچپن کی یادوں بارے کوئی بات کروں تو کہنا پڑے گا کہ دو واقعات ایسے تھے کہ وہ ہمیشہ اپنی پوری توانائی سے میرے اندر محفوظ ہوئے اور گاہے گاہے ان کی

جھلمل اپنی پوری آب وتاب سے سامنے آتی رہی۔

ابھی میں چھوٹا ہی تھا۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے باغ تھا۔ اب جگہ کیسی تھی اس کی خوبصورتی یا بدصورتی کا کوئی واضح تصور ذہن میں نہیں۔ مجھے موسم بھی یاد نہیں۔ یہ بہار کے دن تھے۔ کیا سردیاں تھیں؟ گرمیاں یا خزاں کے دن۔ بس اتنا سا یاد پڑتا ہے کہ جیسے زمین سے آسمان تک ہر چیز گیلی گیلی اور دھواں دھواں سی تھی۔ میری ہی عمر کی ایک لڑکی میرے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس کے رسے کا ایک کونا میں نے پکڑا ہوا تھا اور وہ ناپ رہی تھی۔ دفعتاً ایک بدصورت مینڈک نما چیز ہمارے پاؤں کے سامنے آ گئی۔ ایک خوفناک سی چیخ ہم دونوں کے حلق سے نکلی اور فضا میں بکھر گئی۔ دفعتاً عین سامنے والے گھر کا دروازہ کھلا۔ لمبی سیاہ داڑھی والا ایک مرد کتاب ہاتھ میں پکڑے دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کی نگاہوں میں غصے کی تپش تھی اور اس نے مجھے ڈانٹا تھا۔ رسہ پھینک کر میں اس کی طرف بھاگا چلاتے ہوئے۔

''دفع ہو جاؤ۔ تم بدصورت انسان۔ دفع ہو جاؤ۔''

وقت کا یہ کوئی فیصلہ کن لمحہ تھا جس نے میرے اندر یہ بیج بو دیا کہ میں نے زندگی بھر ہر اُس آدمی کو جس نے مجھے اخلاقیات کے نام پر لعن طعن کرنے کی کوشش کی۔ یہی کہا۔

ہاں اب دوسرا واقعہ بھی سنائے دیتا ہوں۔

گھر کا ماحول بے حد منظم اور سخت تھا۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی تھے۔ بچوں کی مجال نہ تھی کہ اپنی مرضی سے کوئی کام کر لیتے۔ مجھے جانور پالنے کا بہت شوق تھا۔ مگر اجازت ہی نہ تھی۔ اب کڑھنا اور احتجاج کرنا تو ضروری تھا۔ ماں کا سوالوں سے ناک میں دم کر دیتا۔ میڈر (ماں) آخر میں عقاب کو کیوں نہیں پال سکتا۔ مجھے اُلو بہت پسند ہیں۔ میں اُسے گھر میں رکھنا چاہتا ہوں۔ میڈر مجھے اجازت دو کہ میں بھیڑ کا بچہ رکھوں۔

وہ کام کرتے کرتے بیٹے کی اِن معصومانہ باتوں کو سُنتی اور دھیرے سے کہتی۔

""تمہارا باپ پسند جو نہیں کرتا۔""

پھر یوں ہوا کہ میں بھائیوں سے سازباز کرکے اُلّو گھر لے آیا۔ جیب خرچ جمع کرتا رہا اور چھوٹا سا عقاب خرید لیا اور پھر بھیڑیا کا بچہ بھی پالنے لگا۔

بھانڈا ایک دن پھوٹ گیا۔ گھر کے پچھواڑے رکھے ہوئے پرندوں میں اُلّو مار دیا گیا، عقاب کو اڑا دیا گیا اور بھیڑیے کے بچے کو بھگا دیا گیا۔

اور جب میں سکول سے گھر آیا۔ میرے پچھواڑے کا مال متاع لٹ چکا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نہ تھمتے تھے۔

ایسا دل شکستہ اور مایوس سا کہ گھر سے بھاگ کر جنگل میں چلا گیا۔ درختوں سے لپٹ کر روتا رہا۔ ساحل سمندر کے کنارے پر بیٹھا رہا، آنسو بہاتا اور خود سے باتیں کرتا رہا۔

بچپن کا یہ دکھ مجھے ہمیشہ یاد رہا۔ میری شاعری میں بھی اس کا اظہار ہوا۔

ادب میں ناموری مقدر کیوں نہ بنتی کہ مطالعہ کا شوق بچپن سے ہی جڑوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ یوں استاد بننا اور پڑھانا بہت پسند تھا۔ ہاں البتہ مطالعہ کرنا میرا بہترین مشغلہ تھا۔ واحد خوشی ہر موضوع پر کتاب پڑھنا اور شاعرانہ خیالات اور سوچوں میں گم رہنا ہوتا تھا۔ میرے امیر دوست میرے اِس شوق سے آگاہ تھے۔ انہیں ہمارے مالی حالات کا بھی علم تھا۔ وہ ہمیشہ کتابوں کا تحفہ دیتے۔ جنہیں میں خرید نہیں سکتا تھا۔

ایک اور خوبصورت یاد حافظے میں محفوظ ہے۔ گھر کے ماحول میں بہت سے رنگ گھلے ہوئے تھے۔ والد کے دوست آتے تو زوردار سیاسی بحثیں ہوتیں۔ ادب پر گفتگو، تاریخ کے حوالے، طب، فلسفہ غرض کونسا موضوع تھا جس پر بات چیت نہ ہوتی۔ تو اِن سب کا اثر یہی تھا کہ میرے اندر انقلاب، جمہوریت اور تاریخ کے حوالوں سے بہت کچھ باہر نکلنے کے

لیے مضطرب رہنے لگا تھا۔

اس کا پہلا بھرپور اظہار ہماری کھیلوں میں ہوا جو میں اور میرے دوست کھیلتے تھے۔ ڈرامے شروع ہو گئے۔ سکرپٹ لکھا جاتا جو میں لکھتا۔ ملک کے موجودہ حالات کی نمائندگی طوفانی قسم کی میٹنگز سے ہوتی جن میں اختلاف رائے پر پتھر اور ڈانگ سوٹے چلتے۔ اور آخر میں ہم ایک بہترین سالائحہ عمل روم کی حکومت کو دینے کے قابل ہو جاتے۔

تاریخی کرداروں خاص طور پر رومن سیزر اور اُن میں بھی جولیس سیزر اور رو داس کا سگا بھتیجا نیرو۔ کبھی کبھی ہماری یہ ڈرامہ بازی اپنے کرداروں کی زبانی اتنا شوروغوغا برپا کر دیتی کہ میرے والد باہر نکلتے۔ مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لاتے اور میز پر رکھی تین کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے۔

"انہیں پڑھو۔ اور اپنی رائے کا اظہار کرو۔"

یہ کیتھولک اخلاقیات پر مبنی کتابیں ہوتیں۔ میں نہیں جانتا تھا میرے باپ کا انہیں پڑھانے سے مجھے کیا سبق دینا مقصود تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ مجھے نفرت تھی ایسی سب کتابوں سے۔ میں سمجھتا تھا کہ انہوں نے انسانی آزادی کو سلب کیا۔ جنگ وجدل کے رجحانات کو ہوا دیتے ہوئے قتل وغارت اور لڑائیوں کو راستہ دکھایا۔ تازہ ہوا سے محرومی اور بھوک ننگ دیا۔

مجھے انہیں پڑھنے اور ان پر وقت ضائع کرنے کی بجائے کمرے میں کھڑے ہو کر کھلی کھڑکی سے فطرت کے نظاروں کو دیکھنا اور باپ کی طرف سے عائد کی ہوئی سب سزاؤں کو بھگتنا بہتر لگتا۔

آغاز میں ادب میں سب سے زیادہ متاثر یونانی اور رومن ادیبوں سے ہوا۔ ابھی کالج میں قدم رکھا ہی تھا کہ سنجیدہ کلاسیکل ادب کی طرف بھی رجحان ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا

جب میرے سرہانے لاطینی شاعر ہورس Horace اور ورجل Virgil رہتے تھے۔ دن رات انہیں پڑھتا اور ان کے عشق میں ڈوبا رہتا۔ یہی وہ دن تھے جب میں نے ہومر کی ایلیڈ Iliad کی کتاب 9 کو اطالوی میں ترجمہ کیا۔

1856 میں گریجوایشن سے فارغ ہونے کے ساتھ ہی میں نے درس وتدریس کا آغاز کر دیا۔ اٹلی سے بے پناہ محبت مجھے وراثت میں ملی تھی کہ میرا ڈاکٹر باپ پاگلوں کی طرح اٹلی سے پیار کرتا تھا۔ لاطینی میں نے اپنے باپ سے سیکھی تھی۔

یہی وہ سال تھا جو ہمارے چھوٹے سے خاندان پر کسی قہر کی طرح ٹوٹا۔ میرے چھوٹے بھائی دانتے نے خودکشی کر لی تھی۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ ہمیں تو معلوم ہی نہ ہوا کیسا جان لیوا صدمہ تھا؟ میں دیکھتا تھا۔ میرا باپ اس غم سے کتنا شکستہ ہو رہا تھا؟ اس کی شکستگی نے اندر ہی اندر اُسے گھول دیا۔ چند ہی ماہ گزرے تھے کہ وہ بھی ختم ہو گیا۔

میں نے اپنی ماں کو دیکھا وہ کس قدر اجڑی بجڑی نظر آئی تھی۔ میں نے اُسے بانہوں میں سمیٹا۔ اس کے بالوں کو چوما اور بڑے بیٹے کی طرح اُن ذمہ داریوں کو اٹھالیا جو میرے اوپر عائد ہوتی تھیں۔ ہم اس وقت بہت غریب تھے۔ باپ نے جو ورثہ چھوڑا تھا وہ چند شیلنگ تھا۔

غموں کے اِس ہجوم میں میرے پہلے مجموعے Rim کی اشاعت نے مجھے ان کربناک دنوں میں اُس مسرت سے ہم کنار کیا جو کسی شاعر یا ادیب کو اپنی پہلی تخلیق سے حاصل ہوتی ہے۔ اِس مجموعے کی بہت سی نظمیں میرے ہیروشپ جذبات، جنگ وجدل کی کہانیوں اور قدیم تاریخ کے ظالم اور مہربان کرداروں، تلخ وشیریں واقعات، کھیلوں، خاص طور پر ضلعی ٹورنامنٹوں اور کام سے بے پناہ لگن اور محبت کے حوالوں سے خاصی طویل تھیں۔

اس مجموعے کی ایک خوبصورت نظم "Love and Death" بہت اثر انگیز

تھی۔ میرے لڑکپن کے بھی کے سُنے ہوئے پسندیدہ عجیب وغریب سے واقعات، فاتح نائٹ کا کوئین آف بیوٹی کو لے جانا، ہیروئن کے بھائی کا تعاقب کرنا، نائٹ کا قتل، اس کا پاگل پن اور پھر موت کے منہ میں چلے جانا جیسے تاریخی واقعہ کا بیان، حب الوطنی اور انقلابی خیالات نے بھی اِن میں اپنے ہونے کا بہت کھل کر اظہار کیا۔ یہ مجموعہ ایک ایسے معاشرے میں تہلکہ مچانے کیلئے کافی تھا جو ابھی تک پوپ اور پادری کی گرفت میں جکڑا ہوا تھا۔

میں اس کی شادی، اس کی بیوی بچوں اور ازدواجی زندگی کے بارے جاننے کی بھی بڑی خواہش مند تھی۔ مسز ریٹا سمتھ نے اپنی کافی ختم کر لی تھی۔ وہ کوزیو کو تھوڑا سا ریلیکس کرنے کے موڈ میں تھیں۔ اُن کی میٹھی مدھم اور مہربان سی آواز کمرے کی فضاؤں میں خوشبو کی طرح بکھری۔ وہ اس کی ایک نظم گنگنا رہی تھیں۔

شمال کی کہر آلود زمینوں کی دختر

یہ چھوٹا سا اظہار تحسین اُس کے لیے ہے
جو ربط کے تاروں کو کسی
ان دیکھے ہاتھ سے چھوتا ہے
اور کوئی قدیم سی دھن نکالتا ہے
نئی موسیقی میں سمونے کے لیے
معاف کرنا اگر کوئی تند و تیز سر نکل آئے
تمہاری سحر آگیں موسیقی کی تانیں
جنہیں تمہاری اعلیٰ روح شاید ہی سمجھ سکے
لیکن تمہارا شہد جیسا میٹھا گلا
شاید اس کا کوئی سراغ پا جائے

قدیم اٹلی کے دیوتا اور سمندری دیویاں

دیکھو پہاڑ جنگل، گھاٹیاں اور وادیاں

تمہاری کاہلی، سُستی، تمہارا فخر و غرور

تمہارا جوش و اضطراب، تمہارا رشک و حسد

سب کھیل کو برابر کرتے ہیں

محبت اور پیار کو ان سب پر غالب آنے دو

کمرے میں سناٹا تھا۔ بہت دیر ہم دونوں اس کے سحر میں ڈوبی رہیں۔ پھر مسز سمتھ نے بولنا شروع کیا۔ وہ اُس کی شادی کا احوال سنا رہی تھیں۔

شادی اس نے 1859 میں ایلویرا Elvira Memicucci سے کی۔ ایلویرا اس کے ایک دوست کی بیٹی تھی۔ شادی اس کی پسند اور خواہش سے ہوئی۔ اپنی ماں اور بھائی کو ایلویرا کے ساتھ ہی وہ اپنی نئی جائے ملازمت پر لے آیا تھا۔ ازدواجی زندگی خوشگوار تھی۔ کامیاب بھی رہی۔ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا خاندان میں شامل ہو گئے تھے۔

بلوگنا Bologna میں پروفیسر ہونا بھی کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ یونیورسٹی میں دھوم مچ گئی تھی کہ زمانوں پرانی عمارت میں خوشگوار اور معطر ہوا کا جھونکا آیا ہے۔ زنگ آلود اور تھکی ہوئی روحوں کے درمیاں ایک نئے خیال اور نئے رجحان رکھنے والی شخصیت کا ورود ہوا ہے۔

دھیرے دھیرے ادب کے اونچے مقام پر فائز، شہرت کے اعتبار سے ملک میں ہی نہیں بیرون ملک بھی مشہور ہو چکا تھا۔ ایک اچھے استاد کے ناطے اپنے طلبہ میں ہر دلعزیز اور اُن کے اندر کی پوشیدہ صلاحیتوں کو کھوج کرنے والا تھا۔ یہاں اس کے طلبہ میں سے ایک Pascoli پاسکولی بہت نمایاں ہو کر سامنے آیا اور اس نے شاعری میں بھی بڑا نام

پیدا کیا۔وہ اچھا استاد ہی نہ تھا بلکہ بہترین اور تند نقاد بھی تھا۔ادب اور سوسائٹی دونوں کے چھیتڑے اڑاتا۔پکا دہریہ تھا۔اس کے سیاسی نظریات کی گولہ باری عمومی طور، پر عیسائیت اور کیتھولک چرچ کی سیکولر طاقتوں پر خصوصی طور پر مستقل رہتی۔

ایک بار اس نے کہا۔

''میں نہ تو خدا کی سچائی کو جانتا اور مانتا ہوں اور نہ ہی پادریوں اور رومن کیتھولک والوں کی جانب سے امن پر میرا اعتبار ہے۔یہی اٹلی کے حقیقی اور نہ بدلے جانے والے دشمن ہیں۔''

1850 سے 1860 تک کی شاعری "Juvenilia" کے ٹائیٹل کے تحت منظم ہوئی۔تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ اس مجموعے میں شاعر اپنی بہترین کاوشوں سے حیرت انگیز نتائج حاصل کرتا نظر آتا ہے۔اِن میں کچھ نئی نظموں کا اضافہ تھا۔ان میں بھی کچھ خاصی طویل نظمیں تھیں۔وکٹر ایمونیل کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔سارڈینا sardina کا بادشاہ جو اس وقت اٹلی کی آخری امید تھی۔اس کے جوشیلے جذبات اور خیالات نے ان نظموں میں کھل کر اپنے ہونے کا اظہار کیا تھا۔یہ کلیات اس کے بے باکانہ شاعرانہ وجدان کا خوبصورت اظہار تھی۔

Confessions and Battles میں بھی اگرچہ یہ ذرا مشکل ہے کہ اسے ثابت کیا جائے کہ اس نے اپنے دفاع میں کیا کہا۔تاہم بڑی بات یہ ہے کہ اس جیسے حساس شاعر کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ کیتھولک چرچ نے لوٹ مار اور لوگوں کو احمق بنانے کے جو طریقے اپنا رکھے تھے۔ان سب کا حقیقی چہرہ لوگوں کے سامنے پیش نہ کرے اور اس مکروہ چہرے کی پوری تصویر کشی نہ ہو۔

وقت کے ساتھ ساتھ شاعرانہ صلاحیتیں نکھرتی گئیں۔وسعت اور گہرائی میں

اتر تی گئیں۔ Rime nuove یعنی The new lyrics اور Bar barian odes بھی میرے خیال میں وہ بہترین مجموعے ہیں۔جو 1877 میں چھپے اورجنہوں نے بہت ہی مقبولیت حاصل کی۔اس کا کہنا تھا کہ شاعری ہی وہ ہتھیار ہے جو کسی بھی قوم کے شعور کی بیداری اور اُسے سیاسی بلوغت دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔اِن مجموعوں کی کلاسیکل نظمیں، دانشورانہ آہنگ کے ساتھ ساتھ متوازن اور شاعری کے وضع کردہ پیمانوں پر پوری اترتی ہی نہ تھیں بلکہ فی الفور دل میں گھر کرتی تھیں۔

ایسے جوشیلے، ترقی پسند خیالات والا اپنی ہر دل عزیزی سے گھبراتا بھی بہت تھا۔Cross if savoy ایک ایسی خوبصورت ڈرامائی پیش کش تھی کہ اِسے جب پرگولا Pergola تھیٹر میں پیش کیا گیا اور ناظرین نے اس کے مصنف سے ملاقات کرنی چاہی تو وہ بھاگ گیا۔دوست تعارف کروانے کے لئے اُسے جگہ جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔

1870ء کا سال بھی بڑا دکھ بھرا تھا۔پہلے والدہ فوت ہوئیں۔ایک محبت کرنے والے بوڑھے وجود سے گھر خالی ہو گیا تھا۔ابھی اِس صدمے سے باہر نہیں نکلنے پایا تھا کہ میرا اکلوتا بیٹا دانتے فوت ہو گیا۔تین سال کا خوبصورت بیٹا جس سے وہ بہت پیار کرتا تھا۔شاعر نے ایک جگہ لکھا۔

''وہ میری امید تھا، میری محبت اور میرا مستقبل تھا۔غم کی اس اندوہناک کیفیت سے نکلنے کے لئے میں نے خود کو کام میں ڈبونا چاہا۔مگر نہیں۔مجھے لگتا تھا جیسے میرا اندر چھلنی ہو گیا ہے۔مجھے خود پر حیرت ہوتی کہ میں نے اُسے قبر میں کیسے اُتارا؟ کس قدر غم انگیز نظمیں تخلیق ہوئیں جنہیں اعلیٰ معیار کے نوحے کہا جا سکتا ہے۔''

حسن فطرت سے بے پناہ عشق تھا اور اسکا اظہار بھی اس کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ode to Queen کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔

کہہ لیجیے وہ بہر حال ایک سیاسی دانشور کے طور پر بہت نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔

اپنے باپ کی زندگی اور اس کے بعد کچھ وقت تک جمہوریت کا زبانی کلامی یا تحریر کے حوالے سے حامی رہا۔ تقریباً 1859ء سے عملی طور پر اور شاعری کے ذریعے دونوں طرح اس کا حصہ دار بنا۔ ملک کے اتحاد اور اس کے روشن مستقبل سے وابستہ امیدوں کے خون ہوتے حالات نے اسے اپوزیشن کے کیمپ میں پھینک دیا۔

وکٹر ایمونیل کی موت نے ردعمل دکھایا۔ نوجوان بادشاہ اور ملکہ کے لئے ہمدردی کے جذبات اس کے سیاسی نظریات پر اثر انداز ہوئے۔ ایک نظم ode to Queen بھی کہی۔ جس پر یار لوگوں کی خاصی لے دے ہوئی۔ رنگا رنگ قسم کی باتیں، کہیں سیاسی اور مالی فوائد کے حصول کے لئے اور کہیں اونچا عہدہ حاصل کرنے کی خواہش جیسے تبصروں کی بازگشت خاصی واضح تھی۔

یہ سال 1878ء تھا جب نوجوان بادشاہ ایمبرٹو Umberto اور ملکہ مارگیریٹا Margherita نے بلوگنا کے دورے کا پروگرام بنایا۔ شاہی جوڑے کے استقبالیہ کے لئے شہر کے معززین کا انتخاب کرتے ہوئے ریکٹر اور دیگر لوگوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ استقبالیہ میں اپنی شمولیت یقینی بنائے کیونکہ ملکہ اس سے ملنے کی خواہش مند ہے۔ وہ اس کی شاعری کی مداح ہے۔ یہاں میں شاعر کی ہی تحریر کے کچھ ٹکڑے سناتی ہوں۔

تاہم میں سنجیدہ نہ تھا۔ میرے بچپن کی کہانیوں کی ملکہ جن کے بارے میں پڑھتا، سوچتا، بڑے ہو کر اُن کے کرداروں کو ڈرامائی تشکیل دیتا اور رزمیہ نظموں میں انہیں مجسم کرتا چلا آیا تھا۔ میں تو ملکاؤں سے بڑا مانوس تھا۔ مجھے زندہ ملکہ دیکھنے کا قطعی کوئی شوق نہ تھا۔ اس ملکہ کو بھی نہیں جسے شاعری اور آرٹ میں دلچسپی تھی۔

پھر وہ آئے۔

یہ اُن دنوں میں سے ایک ایسا دن تھا کہ جو بلوگنا میں شاید ہی کبھی آتے ہوں۔ آسمان اور زمین سب گرد آلود سے تھے۔ کچھ یوں لگتا تھا جیسے گرد کا یہ طوفان سا گھروں کی چھتوں سے بہہ رہا ہے۔ جیسے یہ دیواروں سے چمٹ رہا ہے۔ جیسے اس کا یہ پھیلاؤ ہر آن گھروں پر بڑھ رہا ہو اور ہر چیز میں سرایت کرتا جا رہا ہو۔ روح تنگ پڑتی اور طبیعت کوفت اور بیزاری میں اُلجھتی ہے۔ جب بندے کا جی خواہ مخواہ ہی کسی راہ چلتے کو ٹانگ مارنے کو چاہے۔ تو میں بھی کچھ ایسے ہی جذبات کی گھمن گھیریوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

یہ شام تھی۔ چار نومبر کی شام۔ میں وایا گلیر یا Via Galliera کے محرابی راستے کے رش میں پھنس گیا تھا۔ اسی ہنگامے میں میں نے دیکھا ملکہ میرے پاس سے گزری۔ سفید خوبصورت ایک رومانوی سا وجود جو حقیقت نگاری کے بین بین موجود ہو۔ کچھ ہی دیر بعد پیازہ سینٹ پیٹرونیا Petronio میں قدیم سرخ اینٹوں والے محل کی کھڑکی کھلی اور بادشاہ اور ملکہ بالکونی میں نمودار ہوئے۔ پس منظر میں روشنیوں کی آب و تاب کی ناقابل بیان جگمگاہٹ تھی۔ باہر کی تاریکی اور سبز سفید اور سرخ روشنیوں کے امتزاج میں ایک خوبصورت چہرے کو زیوارت اور بہترین ملبوسات میں دیکھنا ایک تحیر کن تجربہ تھا۔

اور اگلی صبح جب میں اٹلی کے شاہی جوڑے سے ملنے جا رہا تھا۔ میری چھوٹی بیٹی نے کہا۔

"ملکہ کو میرا پیار کہنا۔ اُس کا نام لیبرٹا Liberta ہے۔ جو اچھا شگون ہے۔"

میں نے چیمبر میں داخل ہوتے ہوئے شاہ کو دیکھا۔ وہ لوگوں سے ہاتھ ملا رہا تھا جو دائرے میں کھڑے تھے۔ اور ملکہ اٹلی کے متوسط طبقے کے مضحکہ خیز ملبوسات پہنے لوگوں کے درمیان کھڑی اپنے پہناوے، اطوار اور رویے کی شائستگی کے ساتھ میٹھے اور مہربان لب و لہجے میں بات کرتی ایک ماورائی شے نظر آئی تھی۔ بچپن کی مہربان اور حسین پری جیسی۔

یہ ملکہ ہے۔بس ایسے ہی میرے تاثرات تھے۔میں نے بلوگنا Bologna شہر کی خواتین کی جانب سے سپاس نامہ لکھنے سے انکار کر دیا۔وہ قصیدہ جو میں نے پہلے ہی اپنے خیالات اور بیازہ کے تاثرات سے متاثر لکھا تھا بس اسی کو مکمل کرنے کا ارادہ کیا۔اور ایک دن جب میں اس کی آخری لائنیں لکھ کر فارغ ہوا ہی تھا میری بڑی بیٹی بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی اور اس نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

''شاہ کو نیپلز میں گولی ماردی گئی ہے۔''

پچپن برس کی عمر میں وہ اینا Anni Vivanti سے ملا جو مستقبل کی ایک خوبصورت لکھاری اور شاعرہ بنی اور جس سے اُسے محبت ہوگئی تھی۔پاگلوں جیسی محبت۔

وہ ہمیشہ جب بھی سفر کرتا تھا اس کے پاس ایک سوٹ کیس ہوتا جسمیں وہ اینا کی ایک بڑی سی پینٹ رکھتا۔دوران سفر وہ سوٹ کیس کھولتا۔پینٹ نکالتا،اسے سونگھتا اور مدہوش سا ہو جاتا۔دونوں کے درمیان جو محبت نامے لکھے گئے وہ بھی کیا شاہکار ہیں؟

اٹلی کی وہ پہلی شخصیت ہے جسے 1906 میں ادب کا نوبل انعام ملا۔نوبل انعام ملنے تک وہ دنیا بھر سے شاعری کے میدان میں خود کو منوا چکا تھا۔سینیٹر کے طور پر بھی وہ نامزد ہوا۔اگرچہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہی ہے تاہم نثر میں بھی اس کا کام اعلیٰ معیار کا ہے۔ادبی تنقید میں اس نے نئی جہات کا تعارف کروایا۔بائیوگرافی،تقاریر اور مضمون نویسی کا کام ہی تقریباً 20 والیوم پر مشتمل ہے۔

نو بج رہے تھے۔جب جب بھی میں مسز ریٹا سمتھ سے ملنے آئی۔

میری اُن کے ساتھ نشست کا دورانیہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہ ہوتا۔آج پہلی بار دو گھنٹے ہو چکے تھے۔وہ بھی تازہ دم تھیں اور میں بھی۔

"بہت شکریہ آپ کا مسز سمتھ۔ شام بہت اچھی گزری۔"

"ہاں کوزیو آپ کی بھی ممنون ہوں۔"

☆☆☆

محمود درویش

فلسطین کی انسانیت کا پیغمبر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

- وہ ساری زندگی، اپنے گھر، اپنی دھرتی کے لیے بھٹکتا رہا مگر پناہ گزینی کا کرب اس کے نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔
- تیرہ سال کی عمر میں اس کی پہلی نظم ایک سوال تھا اسرائیل سے، ایک احتجاج تھا انسانیت کی علمبردار طاقتوں سے۔
- اسرائیل کے وزیر تعلیم یوسی سارو نے اس کی پانچ نظمیں اسرائیلی اسکولوں میں اختیاری مطالعے کے طور پر شامل کرنی چاہیں مگر حکومتی ارکان نے سخت مخالفت کی۔

لوٹ آؤ

تم اب جہاں بھی ہو جو کچھ بھی بن گئی ہو
میرے بدن
اور میرے چہرے کی تپش
میرے گیتوں اور رزق کا نمک
مجھے لوٹا دو
زیتون کی کوئی شاخ مجھ سے لے لو
میرے لمحے کی کوئی سطر
میرے خیال کا کوئی سلسلہ
میرے بچپن کا کوئی کھلونا
مصائب کی اس چہار دیواری سے کوئی اینٹ
کہ ہمارے بچے اور ان کے بچے رستے کا پتہ رکھیں
اور لوٹ آئیں

محمود درویش

عورت نے آسمان کو دیکھا
اور چلائی
او بادل میرے محبوب کو ڈھانپ لے
کہ میرے کپڑے
اس کے خون سے شرابور ہو گئے ہیں

زندگی میں خوش قسمتی کبھی کبھی آپ کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ یہ آپ کا مقدر ہے کہ اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے اندر چلی جائیں یا پھر اسے بند کر دیں۔ فلسطین اور اسرائیل جانا اور بیت المقدس کو دیکھنے کا موقع ملنا خوش قسمتی ہی تھی نا۔

بات ہے بہت سالوں پہلے کی غالباً 1993ء کی۔ عمان میں اپنے قیام کے

دوران ہوٹل والوں نے اسرائیل کے لئے چند گھنٹوں کا ٹرانزٹ ویزہ دینے کا پوچھا۔ پہلے تو بھونچکی سی ہو کر گردوپیش کو دیکھا۔ایک ہاہا کار سارے میں مچی تھی۔

آنکھوں میں بے یقینی کی ابھرتی لہروں نے مخاطب کو دیکھا۔اندر نے جیسے مسرت بھری کلکاری بھری اور سرگوشی کی۔

''ہائے یروشلم جیسے خوابوں کا شہر۔پہلی للک نے دھمال ڈالی۔کہیں اس کے کوچہ بازار میں پھرتا وہ بے مثل شاعر محمود درویش مل جائے۔دوسری جذباتی للک نے گدگدی کی۔ سفر میں امکانات اور ممکنات دونوں کی بہتیری گنجائش۔ڈرامائی موڑوں کا ایک نام زندگی بھی۔''

جیسے یہاں کھڑے اس پیشکش کا ملنا۔تو خوش بختی کی اِس آواز کو ان سنی کیوں کیا؟پکار پر توجہ نہ دی اور خود کو اس نعمت سے محروم کیوں کر لیا جس سے میں نوازی جانے والی تھی؟

یہ کیا حادثہ تھا؟

آج خود سے پوچھتی ہوں،تب میرے انکار کی وجہ کیا تھی؟پیسے زیادہ مانگے تھے انہوں نے۔یا اسرائیل کا خوف تھا؟کچھ سمجھ نہیں آتا۔سوچتی ہوں تو جذبات گڈمڈ سے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

تب دہشت گردی کا بھی آج جیسا دور دورہ نہ تھا۔اسرائیل اور فلسطین میں معمول کی جھڑپیں ضرور ہوتی تھیں۔خاص طور پر انتفاضہ کے بعد سے۔مگر اس کے ساتھ ہی دوستانہ تعلقات رکھنے والی عرب ریاستوں سے سیاحتی معاہدے بھی تھے کہ سیاحت اسرائیل کے لئے ایک اہم صنعت کا درجہ لے چکی تھی۔

اب کھیسے میں پیسوں کی تو کوئی کمی نہ تھی۔رہا خوف ووف کا مسئلہ۔خوف والے

دن تو میں جمی ہی نہیں۔تو پھر کیا تھا؟ یہی سمجھنے سے قاصر ہوں۔

پھر کوئی پانچ سال بعد کی بات ہے۔مصر اپنی سیر کے دوران ایک تو فلسطین کے موضوع پر عام لوگوں سے کھل کر باتیں ہوئیں۔مختلف آراء سننے کو ملیں۔تند و تیز اور تلخ تلخ کہ اِن فلسطینیوں کو بھی ہابڑے پڑے ہوئے تھے۔مہنگے داموں اپنی زمینیں بیچنے کے۔ بیروت میں جائیدادیں خریدنے کے ہوکے تھے۔خیر سے اب بھگتیں۔محمود درویش کی شاعری بارے بھی سنا۔محمود درویش سے دلیس میں بھی چاہتوں، محبتوں اور عقیدتوں کا رشتہ پالے بیٹھی تھی۔جہاں کہیں خونِ جگر میں ڈوبی شاعری کا کوئی ٹکڑا پڑھنے کو مل جاتا دنوں تڑپتی رہتی۔

اس سیر سپاٹے کے دوران صحرائے سینا(Sinai) کے ریگ زاروں سے گزرتے ہوئے خلیج عقوبہ(Gulf of Aqaba) کے ساحلی شہر ایلات اور اسرائیلی شہر رفہ(Rafah) سے ظالم اسرائیل کو شروع ہوتے دیکھنا بڑا تلخ تجربہ تھا۔یہ سرحدی علاقہ افقی صورت میں چلتا چلتا بحیرہ روم کے مشرقی ساحلوں پر واقع غزہ سے جا ملتا ہے جو ایک چھوٹی سی مستطیل پٹی ہے۔

یہیں وہ بد قسمت اور مظلوم قوم جس کا نام فلسطینی ہے محصور ہوئی پڑی ہے۔مصر کے ساتھ جڑے اس چھوٹے سے حصے میں جیالوں نے سرنگیں بنا ڈالی ہیں۔ایک ظالم اسرائیل، دوسری ظالم مصری فوجی حکومتیں غزہ کے مجاہدین اور مصر کے اخوان المسلمین سے خائف۔اوپر سے دلیر اور جیالے فلسطینی مجاہد جنھوں نے سوجھتوں اور حربوں سے یہ غیر قانونی راستے بار بار تباہ کیے جانے کے باوجود پھر بنانے ہیں۔ان سے گزرنا ہے۔چھاپے پڑنے پر پکڑے بھی جانا ہے۔سزائیں بھی کاٹنی ہیں اور رباز پھر بھی نہیں آنا۔

میں نے بھی جی جان سے اُس سرنگ کے راستے فلسطین جانے کا سوچا۔خرچہ کچھ

زیادہ نہ تھا۔لالچی طبیعت نے اب ساری توانائی اس میں جھونک کر اس مقصد کو حاصل کرنے کی اپنی سی کوشش کرنی چاہی۔گو یہ آدم خور شیر کے کچھار میں سر دینے والی بات تھی۔پر اس وقت خواہش کے منہ زور اور تند و تیز ریلے کے سامنے بڑی مجبوری محسوس کر رہی تھی۔فلسطینیوں سے ملنے اور محمود درویش کو دیکھنے کی خواہش چین نہیں لے رہی تھی۔جی اڑ کر اس زمین پر جانا چاہتا تھا۔

پر برا ہوا یا اچھا۔میری ساتھی نے ایڑھی نہ لگنے دی۔زمانے بھر کی ڈرپوک اور دبّو سی۔

اُسے کون سی کتاب لکھنی تھی جو وہ اس جھمیلے میں پڑتی۔یوں بھی چسکے مارے میرے ساتھ آ گئی تھی۔میرا کیا تھا؟ کھاٹ بیٹھی تھی۔نانی دادی جو بالعموم کاٹھ کباڑ کا سامان بن کر کھڈے لائن لگی ہوتی ہے۔اندر بھی ہو جاتی تو خیر صلا۔

انہیں دنوں ایک اور واقعہ بھی ہوا۔میری خلیری بہن ڈاکٹر رضیہ حمید جو عرصہ چالیس سال سے امریکہ میں مقیم، وہاں کی شہری، امریکہ میں کام کرتی، انسانی حقوق کی مختلف تنظیموں سے وابستہ Peace Now کی طرف سے تین ماہ کے لئے اسرائیل گئی۔تین ماہ بعد واپس آ کر اس نے فلسطین کے شہروں غزہ، رملہ، ویسٹ بینک اور اسرائیل کے حیفہ، عکا، یروشلم اور بیت اللحم کے جو قصیدے پڑھے۔

غزہ کی بوڑھی عورت کے زیتون کے باغ میں زیتون کے درختوں پر چڑھنے، انہیں توڑ کر گھر لانے اور دستی مشین سے تیل نکالنے کے قصے سنائے۔اسرائیل کی ظالمانہ کہانیاں، اس کے ظالمانہ ہتھکنڈے، حماس کی خدمت خلق، ان کے جذبات کی شدتیں، الفتح کی سیاست، اور سب سے بڑھ کر محمود درویش سے ملاقات۔اس کی شاعری کے ٹکڑے اس کی اپنی زبان میں سنوائے تو میری حالت قابل دید تھی۔حسرتوں کا دھواں تھا جو مجھے سلگا

سُلگا کر مارے جا رہا تھا۔ مگر ہو کیا سکتا تھا قہرِ درویش بر جانِ درویش والا معاملہ تھا۔

مصر پر جو کتاب لکھی تھی۔ "مصر میرا خواب۔" جب چھپی تو سوچا کہ اس کی کچھ تقریب کا ہی اہتمام کروں۔ سچی بات ہے کتاب لکھ کر اُس کی رونمائی کروانا بھی اب بیٹی کو بیاہنے کی طرح ایک مجبوری بن گئی ہے۔ سوچا کہ بھئی مصر پر لکھا ہے تو مصر والوں کو بھی خبر کرو۔ یہ کیا کہ سوتے ہوئے بچے کا منہ چوم رہی ہوں، نہ ماں کو خبر نہ پیو کو پتہ۔ تھوڑی سی ہل جل کرو۔ کتاب سفیر صاحب کو بھیجی اور ساتھ ہی انہیں لاہور آنے کا سدّا بھی بھیج دیا۔ جواب آیا۔

بڑے مشکور ہیں ہم کہ آپ نے ہمارے دیس پر لکھا۔ اب حق تو ہمارا بنتا ہے۔ پچاس لوگوں کی بارات لے کر جولائی کے پہلے ہفتے ہمارے گھر اسلام آباد تشریف لے آئیں۔ اب اس البیلی داستان کی روئیداد کی تفصیل کا کیا ذکر کہ من آنم و من دانم۔ بہر حال سفارت خانے کی اِس نوازش کا بہت شکریہ کہ بہتیری عزت دے ڈالی جس کا ہمیں گمان تک نہ تھا۔

تقریب کا اہتمام سفارت خانے نے اپنے قومی دن کے موقع پر کیا۔ میری خوش قسمتی کہ مشرق وسطیٰ کے بھی ممالک کے سفیر اور ان کی بیگمات تشریف لائیں۔ یہیں تقریب کے اختتام پر ایک اُونچے لمبے نوجوان نے اپنا تعارف ابوشئیب الہیثم سفیر فلسطین کی حیثیت سے کرواتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ملک فلسطین پر لکھیے نا۔"

لو میاں۔ ہمارے تو نتھنے پھولے۔ جی باغ باغ ہوا۔ سالوں پرانی خواہش کی تکمیل کے آثار نمودار ہوئے۔ فلطسیین پر بھلا کس کافر کا جی لکھنے کو نہ چاہے گا اور فلسطین کی سرزمین پر اُترنے کی تمنا کون نہ کرنے گا؟ اور محمود درویش سے کون ملاقات کرنی نہ چاہے گا؟

اب پاسپورٹ اور درخواست فوری بھیجنے کو کہا گیا۔ چلو بھیج کر انتظار میں بیٹھ گئی۔

شوق و اضطراب بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ چند بار رابطہ کیا۔ لہجے کی بیتابی اور شتابی پر صبر اور حوصلے کی تلقین کی گئی۔ کارگزاری کی رپورٹ بلاشبہ بڑی مسرور کن تھی۔ اس بے چاری نمانی سی عورت کا ذکر صدر فلسطین جناب محمود عباس سے ہوا تھا۔ انہوں نے کہا۔ اھلاً و سہلاً، جم جم آئیں سو بسم اللہ، سر متھے سر آنکھوں پر۔ پاکستان اور پاکستانی ہمیں بہت پیارے۔ وہاں کی وزارت اطلاعات کی چیف سیکرٹری ہماری آمد کی تہہ دل سے منتظر اور اسرائیل خانہ خراب کے ہاں بھی تذکرہ ہو گیا تھا۔

روز خواب مچتی۔ ہائے محمود درویش سے ملوں گی۔ توفیق زیاد سے کہوں گی کہ تمہاری شاعری دل تڑپاتی ہے۔

دو تین بار فون کر کے صورت حال جاننا چاہی۔

''کوشش ہو رہی ہے۔ گھبرایئے نہیں۔'' جواب ملا۔

ایک دن جب میں جنگ اخبار کی ریفرنس لائبریری میں بیٹھی ''سری لنکا'' کی فائل دیکھ رہی تھی۔ ماحول کی خاموشی اور سناٹے کو فلسطینی سفارت خانے سے آنے والی آواز نے توڑا۔ ابو شعیب بول رہے تھے۔

''اسرائیل نے آپ کو او کے کر دیا ہے۔ پر ساتھ ہی چند شرائط بھی عائد کر دی ہیں۔ سن لیجیے۔''

میں دھڑکتے دل کے ساتھ سنتی تھی۔ کڑی شرائط میں سب سے اہم فلسطین کے مسئلے پر نہ لکھنے کا وعدہ تھا۔ یروشلم میں داخلے کی کوئی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔ چند اور بھی ایسی ہی بے تکی باتیں تھیں۔ فون بند ہو گیا تھا۔ اب خود سے پوچھنا ضروری تھا تو میں نے وہاں کرنے کیا جانا ہے؟ اگر لکھنا نہیں؟ پھر چند لمحوں کی چپ کے بعد میرا اندر جیسے پھڑک اٹھا

تھا۔

"ہے مالعتی۔ یہ اسرائیل بھی۔"

اب یہ بھی کہیں ممکن تھا کہ فلسطین پر جس انداز سے بھی لکھا جائے اسرائیل کا ذکر نہ آئے۔ اس کے وجود کا کینسر اور اُس کے بغیر ہی۔ یعنی افسانہ آئیں بائیں شائیں سے بھر جائے اور اصل قصے سے رہ جائے یا شاعر کے خوبصورت لفظوں میں کہ وہ بات جس کا سارے فسانے میں ذکر نہ تھا وہ بات ہو۔

گھر واپس آ کر میں نے خود پر لعن طعن اور پھٹکار کا پٹارہ کھولا جس میں اس سے پہلے بھی بیسیوں بار میں اُسے غوطے دیتی رہتی ہوں۔

خیر سے میری امیدوں پر جلد ہی پانی پھر گیا۔ ابوشعیب نے ایک دن بتایا کہ ظالم اسرائیل جو مشکل سے پٹڑی پر چڑھا تھا ایک گڑگڑاہٹ سے نیچے اتر گیا ہے۔ اب ٹھنڈی ٹھار ہو کر بیٹھ جانے والی بات تھی۔

پھر یونہی ادھر اُدھر کہیں کسی پرچے، کہیں نیٹ پر اس کی شاعری پڑھتے پڑھتے ایک دن میں نے بھی ہزاروں پاکستانیوں کی طرح اِس خبر کو بوجھل دل سے سنا اور ٹی وی پر دیکھا کہ وہ بے خانماں شاعر جسے بے شمار ملکوں اور تنظیموں کی طرف سے بے شمار ایوارڈز اور انعام دیئے گئے مگر جس کا سب سے بڑا انعام وہ بے پایاں محبت اور پیار تھا جو اُسے فلسطینیوں نے اپنا قومی شاعر قرار دینے کی صورت دیا۔

لاکھوں عربوں نے اُسے دل کی مسند پر بٹھایا اور اُسے فلسطین کی انسانیت کا پیغمبر کہا۔ وہ جو اول آخر فلسطینی تھا۔ حیات میں بھی اور موت میں بھی۔ وہ جو عربوں کی نمائندہ ثقافتی شخصیت کی چلتی پھرتی تصویر تھا۔ خوبصورت سوز و گداز سے لبالب بھری شاعری کا خالق ہوسٹن کے ہرمن اسپتال میں فوت ہو گیا تھا۔ فلسطین میں دفن ہونے کی اس کی آخری

خواہش پر اُسے فلسطین لایا گیا۔ فلسطینی صدر محمود عباس نے تمام تدفینی رسومات میں حصہ لیا اور راملہ میں اُسے قومی شاعر کے طور پر پورے اعزاز سے دفنایا گیا۔ قومی سطح پر تین روز اس کا سوگ منایا گیا۔

تو اس کی حیاتی بارے کوئی ورق کھولنے سے پہلے میں اس کی ایک نظم پڑھتی ہوں۔

دو سے آٹھ شہیدوں
اور دس زخمیوں
بیس گھروں
اور پچاس زیتون کے پیڑوں کا
قتل عام ہمارا روزانہ کا نقصان ہے

یہ اوائل بہار کا خوشگوار چمکتا روشن دن 13 مارچ تھا۔ سن 1942ء جب وہ مغربی گلیلی کے بالائی علاقے کی سرسبز پہاڑی پر واقع گاؤں البروہ Al-Birwa کے رہائشی سلیم اور حوریہ درویش کے ہاں ان کا دوسرا بچہ محمود پیدا ہوا۔ زمیندار گھرانہ تھا۔ ماں گو اَن پڑھ تھی۔ مگر دادا صاحب علم تھا۔ بہو کو لکھنا پڑھنا اُسی نے سکھایا تھا۔

چھ سال کا تھا جب اُسے اپنے سرسبز وشاداب گاؤں سے بھاگنا پڑا۔ جون 1948ء کی وہ رات اس کی یادوں میں اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ ساری زندگی جھانکتی رہی تھی۔

اُس کی آنکھوں میں خواب تھے اور ماں جھنجھوڑے چلی جاتی تھی۔ ساتھ ساتھ اونچے چلاتی تھی۔

''اٹھو اٹھو میرے بچے، کمبخت صیہونیوں نے حملہ کر دیا ہے۔''

کچے خواب دیکھتی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلتے، معصوم سی یادوں کی گٹھڑی اٹھائے وہ ماں کا ہاتھ تھامے سینکڑوں لوگوں کے ساتھ کھائیوں، ٹبوں، جنگلوں میں ننگے پاؤں بھاگتا تھا۔تعاقب میں گولیاں تھیں۔

پتہ نہیں ماں قافلے سے بچھڑ کیسے گئی اور دن طلوع ہو گیا تھا۔وہ اُسکا ہاتھ تھام کر قریبی کھیت میں چھپ گئی۔سورج کی گرمی، بھاپ چھوڑتے ڈھنٹھل اور بھوکا پیاسا وہ۔رونے لگتا تو ماں ہونٹوں پر انگلی رکھ دیتی کہ آواز نہ نکلے۔

پھر ایک موٹا تازہ فوجی ایک ہاتھ میں بندوق تھامے اور دوسرے ہاتھ سے ڈھنٹھلوں کو ہٹاتا ان کے سر پر آ کھڑا ہوا۔اونچی آواز میں پوچھا تھا اُس نے۔

”پروا سے ہو؟“

ماں کی خوبصورت آنکھوں کی پتلیوں میں خوف جیسے ٹھہرے ہوئے پانیوں کی طرح ساکت تھا۔اُس سے بولا تو گیا ہی نہیں۔بس سر ذرا سا اثبات میں ہلا۔

”بھول جاؤ اُسے۔پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھنا ورنہ گولیاں چھلنی کر دیں گی۔“

ماں اسکی انگلی پکڑے بھاگتی گئی۔اور یہ بھاگنا اُس کی زندگی کا وہ تلخ ترین حادثہ تھا جس نے اُسے ساری زندگی مضطرب رکھا اور وہ ساری زندگی یہاں وہاں گھر کیلئے، اپنی زمین کے لئے بھاگتا اور بھٹکتا رہا۔

پہلی پناہ گزینی لبنان میں ہوئی۔کس درجہ المناک اور دکھ بھرے احساسات میں وہ محصور رہتا تھا۔In memory of forgetfulness میں وہ لکھتا ہے۔

مجھے اپنا ہرا بھرا گاؤں یاد آتا۔اپنا بڑا سا گھر۔اُس کا وسیع و عریض آنگن، اس کی کیاریوں میں چنبیلی اور گلاب کے بوٹے، زیتون کے پیڑ، چھوٹے بہن بھائی اُن کی

شرارتیں اور لڑائیاں۔مردان خانے کا بڑا کمرہ اور اس کا آنگن جہاں میرے دادا کے پاس اردگرد کے علاقوں کے معززین اور گاؤں کے لوگ آتے۔قہوہ اور کافی کی سروس چلتی۔کوئی کتاب پڑھتا اور باقی سب سنتے۔کبھی قدیم اور کبھی جدید شاعری سنی جاتی۔اس پر حاشیہ آرائی ہوتی۔یہ عرب روایات تھیں جن سے ہم محروم ہو گئے تھے۔نئے ماحول کا دن اگر تکلیف دہ تھا تو راتیں اُس سے سوا تھیں کہ آنسو گالوں پر بہتے جاتے اور میں کبھی خود سے اور کبھی اپنے ہم عصر مقامی بچوں سے ایک ہی سوال بار بار پوچھے چلا جاتا کہ

’’آخر ہمارا گھر ہم سے کیوں چھن گیا؟‘‘

یہاں کوئی چیز اگر مانوسیت رکھتی تھی تو بس یہی زبان تھی۔اِس جبراً جلاوطنی کے یہی شب و روز تھے جنہوں نے اُسے ایک چھوٹے معصوم بچے سے بڑے میں بدل دیا۔اس کے سب خواب اور بچپنے کی چہلیں جیسے کہیں اڑ پڑ گئی تھیں۔کھانے کے لئے لمبی قطار میں لگنا پڑتا تھا۔جو سرکاری امدادی محکمہ تقسیم کرتا تھا۔کتنے ہی ایسے نئے لفظ اس نے پہلی بار سنے۔وطن، مہاجرین، جنگ، سرحدیں۔جنہوں نے آنے والے دنوں میں بہت کچھ سمجھایا اور سکھایا اور اُس سے اس کا رہا سہا بچپن بھی چھین لیا۔

جیزن Jezzin اور دیمور Damour میں ایک سال رہنے کے بعد واپسی کا فیصلہ ہوا۔وہ رات انہوں نے چوری چھپے وطن واپسی کی تو گاؤں ملیا میٹ ہو کر اسرائیل کے نئے منصوبے کی آماجگاہ بن رہا تھا۔

بدقسمتی کہ وہ اسرائیلی علاقوں میں رہ جانے والے فلسطینی عربوں کی مردم شماری میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔خاندان عکہ میں دیرالاسد میں قیام پذیر ہوا۔مگر اپنی جنم بھومی میں آ کر وہ ہجرت اور پناہ گزینی کے ایک اور کرب سے گزرا جو اُس کے حساس ذہن پر ہمہ وقت کچوکے لگاتا تھا۔

مدرسے میں ہوتا تو اچانک کسی اسرائیلی فوجی افسر کے آنے پر اُسے چھپا دیا جاتا۔ جب پولیس گاؤں آتی تب بھی یہی عمل دہرایا جاتا۔ کسی الماری میں، کسی بیڈ کے نیچے، کسی غسل خانے میں، کسی مجرم کی طرح چھپا وہ سوچوں کے دہکتے جہنم سے گزرتا۔ گھر کے بڑوں کی تاکید تھی کہ گفتگو میں لبنان کا کبھی ذکر نہ آئے کہ وہ حملے کے وقت وہاں چلے گئے تھے۔

میں ذہین اور ہونہار طالب علم تھا۔ شاعری کے ساتھ مصوری بھی میرا شوق تھا۔ میں کوئلوں سے دیواروں پر ایسی تصویریں بناتا کہ یقین سے ماورا ہوتیں۔ میرے والد، میرے عزیز اور ملنے جلنے والے حیرت کا اظہار کرتے۔ میری یہ مشق بس دیواروں اور ردی کاغذوں تک ہی محدود رہی کہ والد کے پاس رنگوں اور برش کے لئے پیسے ہی نہیں ہوتے تھے۔ اپنی غربت کا مجھے شدید احساس تھا۔ مصوری کے شوق کے پورا نہ ہوسکنے نے مجھے شاعری کی طرف مائل کیا کہ یہ سہولت اور مفت میں ہوجانے والا ہنر تھا۔ میرے اساتذہ نے میری نثر کی بھی بڑی حوصلہ افزائی کی۔

پہلی نظم جو اُسنے تیرہ سال کی عمر میں پڑھی وہ ایک صدائے احتجاج تھی۔ وہ ابھی مدرسے کا طالب علم تھا اور اسرائیل اپنی آٹھویں سالگرہ منا رہا تھا۔ عرب رہائشی علاقوں میں جلسے، جلوس، ریلیاں اور سکولوں میں تقریری مقابلے ترتیب دیئے گئے۔ اُس نے بھی اپنے سکول میں ہونے والی تقریب میں حصہ لیا۔ مائیکروفون کے سامنے کھڑے ہوکر اس نے اپنے دلی جذبات کا اظہار ایک نظم کی صورت میں کیا۔ یہ نظم ایک احتجاج تھی اُس کے اندر کے جلتے کرب کا اظہار تھی۔

ایک عرب لڑکے کے اسرائیلی لڑکے سے سوال تھے۔

تمہارے پاس گھر ہے

میرے پاس گھر کیوں نہیں؟

تم جیسے چاہو جس طرح چاہو
سورج کے نیچے کھیل سکتے ہو
میں کیوں نہیں؟
خوشیاں تمہارے لئے ہیں
میرے لئے کیوں نہیں؟
میں ایک پناہ گزین کیوں ہوں؟
تم اور میں اکٹھے مل کر کھیل کیوں نہیں سکتے؟

اگلے ہی دن اُس لڑکے کو مجد الکروم کے فوجی دفتر میں بلا کر اِس قدر ڈرایا دھمکایا گیا۔ فوجی انچارج کا لہجہ اِس درجہ دہشت اور توہین آمیز تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا اور خود سے سوال کرتا رہا کہ آخر اُس کا جرم کیا تھا؟ اپنے اس سوال کا جواب پوری فصاحت کے ساتھ اُسے بہت بعد میں ملا۔

تاہم کفریا سیف کے ہائی سکول کے دوران میں اُس کی زندگی میں ایک یہودی شخصیت نے بڑا مثبت کردار ادا کیا۔ وہ اس کی اُستاد سوشنہ تھی۔ اس کے اندر ممتا تھی۔ وہ نیک سیرتی کی علامت تھی۔ اُس نے نفرت کی آگ سے اُسے نکالا۔ ہائم بیالیک جیسے شاعر کی شاعری پڑھنے پر اُسے اُکسایا۔ یہ وہ روشن کردار تھا جو ہمیشہ اس کی یادوں میں جھلملاتا رہا۔

In memory of forgetfulness اس وقت میرے سامنے کھلی پڑی ہے۔ اُن محرومیوں پر میں اشک بار ہوں جو اُس ذہین بچے کی جھولی میں وقت نے ڈالیں۔ جنہوں نے اُسے پل پل تڑپایا اور سوالوں کے کٹہرے میں کھڑا کیا۔ وہ اپنے ایسے ہی دنوں کی تلخ یادوں میں سے گزرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میری یادوں میں وہ بوڑھا ہمیشہ کسی لو کی طرح دمکتا ہے۔ اسرائیلی ریاست کے

قیام کے بعد کی پہلی مردم شماری کے وقت ہم لبنان میں تھے۔ جب دو سال بعد واپس آئے تو گویا ہم infiltrators (بھگوڑے) تھے۔ یعنی صدیوں سے اپنی ہی دھرتی پر رہنے والے سنگینوں کی نوکوں پر نکالے جانے والے دو سال بعد infiltrators بن گئے تھے۔ یہ ہمارے پرکھوں کا وطن اُن کا ملک بن گیا تھا۔ دیر الاسد Dayr-Al-Asad میں کوئی سوچ سکتا ہے یہ کیسا نفسیاتی کمپلیکس تھا۔

اور وہ بوڑھا بھی تو ایسے ہی مسئلے کا شکار تھا جو ہر رات کو قریبی گاؤں سے آتا۔ اُس کی آواز میں کیا درد اور سوز تھا۔ رباب پر وہ اپنی کہانی گاتا۔ کیسے اس نے گھر چھوڑا اور کیسے باڈر پار کیا؟ اور کیسے وہ واپس آیا؟ رات ہوتی۔ آسمان پر چاند ہوتا یا گھپ اندھیرا اور ہر دل کو مٹھی میں بھینچنے والی یہ شاعری اور موسیقی ہوتی۔ یہیں مجھے احساس ہوا کہ درد کیسے لفظوں کو احساس دے کر انہیں باہر نکالتا ہے اور آرٹ کیسے عام چیزوں کی کوکھ سے ہی نکل آتا ہے۔ اب کیسے نہ وہ سارے منظر میری یادداشتوں میں ابھرتے جو میں اپنے گاؤں البروہ میں دیکھتا تھا جو میری یادوں کا حصہ تھے۔

یادوں کے اِسی ہجوم میں گھرا وہ کچھ اور منظروں کے چہروں سے پردہ اٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں شاعر بن کر اپنے اندر کے اُس بچے کو کھوجتا رہا جو اس کے اندر تو تھا۔ پر جسے وہ کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ شاعر تو بڑا ہوتا گیا مگر وہ بچہ جسے اُس نے بڑا ہونے نہیں دیا۔

سچ تو یہ ہے کہ میری اور میرے مادرِ وطن کی کہانی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ کم عمری میں ہی گھر چھوڑ دیا۔ شاید مجھے احساس تھا کہ میں اپنے خاندان کا ایک نظر انداز کیا ہوا ناکارہ اور غیر ذمہ دار لڑکا ہوں۔ کم از کم اپنی ماں سے مجھے ہمیشہ یہی تاثر ملا۔ بہت ڈانٹ ڈپٹ اور لعن طعن کرتی تھیں اور شاید سمجھتی تھیں کہ گھر کے ابتر حالات میں کچھ میرا بھی ہاتھ ہے۔

1956ء میں غزہ پر قبضے اور مصر پر حملے کے خلاف ہڑتالوں اور احتجاج کی

صورت جیل میں تھا۔ جب میری ماں جیل آئی اور انہوں نے میری پیشانی چومی۔ میرے لئے وہ پھل اور کافی لائیں۔ یہ وہ پہلا دن تھا جب میں نے جانا کہ میں غلطی پر تھا۔ وہ مجھے پیار کرتی ہے۔ کیسی ناقابل بیان مسرت تھی۔ جیسے میرے اندر قندیلیاں سی جل اٹھی ہوں۔ جیل نے مجھے ماں کی محبت کا احساس دلایا تھا۔ جیل میں ہی میں نے اپنے احساسات پر وہ نظم لکھی۔

"I long for my mother's bread"

اپنی ماں کے ہاتھوں کی کافی
ماں کے ہاتھوں کی پھینٹی ہوئی
بچپن میرے اندر عود کر آیا ہے
دنوں نے اپنی تہیں کھول دی ہیں
اور یہ مجھے کتنے عزیز ہیں
کیونکہ اگر میں مر جاؤں
میری ماں کے آنسو مجھے شرمندہ کریں گے
اگر میں کسی دن واپس آؤں
تمہاری پلکوں پر کسی شال کی طرح
اپنا ہاتھ
میری ہڈیوں پر پھیرنے دو
اپنے بالوں کے کنڈلوں سے ہمیں باندھ لو
اپنے لباس کی ڈوریوں سے ہمیں اپنی پشت پر کس لو
اگر میں تمہارے دل کی گہرائیوں کو

چھولوں

تو میں خدائی دیوتا کا روپ دھار لوں

اپنی ماں کے ہاتھوں کی روٹی

میری دلی تمنا

مجھے سنبھال لینا اگر میں کبھی واپس آؤں

اپنے اوون میں ایندھن کے طور پر

جو تمہارے پکانے میں مدد کرے گا

اپنی چھت پر پھیلائے کپڑے کی طرح

جسے تم ڈالتی اور سمیٹتی ہو

میں تمہاری روزانہ کی دعاؤں میں

شامل ہونا اور رہنا چاہتا ہوں

میں بڑا ہو گیا ہوں

مجھے میرا وہ بچپن لوٹا دو

ہجرت کرنے والے پرندوں کے ساتھ واپس آؤں

تمہارے گھر میں جہاں میری واپسی کا انتظار ہو

یہ کیسی اثر انگیز نظم تھی۔ آنسو میرے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ جانے کتنی دیر میں پسرانہ اور مادرانہ جذبات کے اِس نوسٹلجیا میں کھوئی رہی۔

شاعر نے پھر کہیں متوجہ کیا تھا۔

1960ء میں اُس نے ہائی سکول مکمل کیا اور حیفہ چلا گیا۔ یہاں اسرائیلی کمیونسٹ پارٹی راکھا Rakah اور پارٹی کے ترجمان اخبار الاتحاد اور ہفتہ وار الجدید کے عربی سیکشن کا

انچارج بنا۔ 1970ء میں وہ ماسکو تعلیم کے لئے چلا گیا۔ ایک سال بعد اُس نے قاہرہ میں ''الاہرام'' میں ملازمت کر لی۔ کچھ عرصے بعد پی ایل او میں شامل ہوا۔

شاعری اُس کے خمیر میں رچی تھی۔ اس کی شاعری کا پہلا دور ہجرت کے اُن دکھ بھرے تجربات پر ہے جو اُس نے دیکھے، جن سے وہ گزرا اور جو اُس نے سہے۔ دوسرا فیز ایک بڑے کینوس کی صورت میں سامنے آیا جس میں لبنان جیسے خوبصورت ملک پر اسرائیل کی وحشیانہ بمباری، بیروت پر جیٹ فائٹرز کی چیختی دھارتی آوازوں نے گلوکاروں کی میٹھی آوازوں اور موسیقی کے سروں کو نگل لیا۔ شیلنگ نے شہر کا حُسن گہنا دیا۔ آگ اور خون نے انسانیت کو قتل کر دیا۔ صابرہ اور راشتیلہ کے کیمپوں کی حالت زار اور اسرائیل کی جا جا بربیت اور ردعمل کے طور پر انتفادہ۔

درویش کی شاعری ہمیشہ اس کے انفرادی اور اجتماعی رویوں، سیاسی نا انصافیوں اور وطنی دکھوں کے گرد گھومی تاہم جب وہ اسرائیلی چالبازیوں ان کے خود ساختہ وضع کردہ دہرے معیاروں کی کھینچا تانی میں لڑھکتا اپنا خون جگر پیتا تھا۔ تب ذاتی احساسات پر مبنی بہت کچھ لکھا گیا۔

زیتون کی شاخ

اس کی چھاتیوں پر شام پھول کی طرح کھلتی ہے
وہ پرندے کا خواب دیکھتا ہے
اور لیمن کے پھولوں بارے بات کرتا ہے
اس کے لئے مادر وطن وہ کہتا ہے
جیسے ماں کی بنائی ہوئی کافی پی جائے
جیسے رات پڑنے پر گھر واپس آیا جائے

اور میں نے دھرتی بارے پوچھا
اس نے کہا تھا
میں کچھ نہیں جانتا

اُسے اسرائیل میں رہنے والے بیشتر یہودی دانشوروں کا رویہ ناقابل فہم لگتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ میں سمجھ نہیں سکتا وہ کیسے ادیب ہیں جو دنیا میں کہیں بھی یہودیوں پر گزرنے والے کسی حادثے یا تکلیف پر مضطرب ہو اٹھتے ہیں؟ وہ اسرائیل میں رہنے والے عرب فلسطینیوں کے لئے بے چینیاں کیوں محسوس نہیں کرتے؟

وطن کی جیل زیادہ خوبصورت ہے
جلاوطن ملکوں کے باغوں سے
انہوں نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا
مسکراتے ہوئے، ہنستے ہوئے
اور دریاؤں کے کنارے اگے گلابوں پر
اندھا دھند گولہ باری کردی تھی
وہ تو ہر بات اور ہر معاہدہ بھول جاتے ہیں
گزرتے دنوں کے ساتھ ان کی انگلیاں موٹی ہوتی جائیں گی
زنگ آلود آئینوں پر انہیں
اپنے چہرے نظر نہ آئیں گے
یوں یہ اچھا ہے باغ پھیلتا جائے گا
خزاں سے پہلے جب وہ واپس آئیں گے
ہم ابھی تک کون ہیں

ہمیں صحرا میں کون واپس بھیجے گا

اُس کے یہی جذبات تھے کہ اُس نے اپنے ہر ادارئیے میں اس مسئلے کو چھیڑا اور اپنے اسرائیلی ہم وطنوں سے سوال کیا۔قوموں کے درمیان بنیادی تضادات کیوں پیدا ہوں اگر ان کے باہمی تعلقات مساوات اور انصاف کی بنیادوں پر قائم ہوں۔

''گیارھویں سیارے'' میں وہ کہتا ہے۔

میں دو جنتوں کا وہ آدم ہوں
کہ جن سے دوبار نکالا گیا ہوں
مجھے بہت آہستگی سے نکالو
مجھے آرام سے مارو
گارشیا لورا کے ساتھ
میرے زیتون کے پیڑ کے نیچے دفن کردو

اب اس کی ایک اور نظم لبوں پر ہے۔

یہاں پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر
شام کے دھندلکوں میں
وقت کی توپ
اِن ڈوبتے سایوں کے ہجوم کو نگل رہی ہے
ہم وہی کرتے ہیں
جو قیدی کرتے ہیں
اور جو بے کار لوگ کرتے ہیں
ہم امیدیں کاشت کرتے ہیں

محمود درویش کا کہنا ہے کہ میں باوجود ان دکھوں اور تکلیفوں کے جو ظلم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور جو ہمیں متاثر کرتی ہیں خود کو منفی نہیں ہونے دیتا۔ انسانیت کا اہم عنصر اپنے اندر زندہ رکھنا چاہتا ہوں اور رکھتا بھی ہوں۔

میری محبت اگر تم بارش نہ بن سکو
تو درخت بن جاؤ
زرخیزی سے لبالب بھرا ہوا
درخت بنو
میرے پیارا اگر تم درخت نہ بن سکو
تو پتھر بن جاؤ
نمی سے پور پور بھیگا ہوا
پتھر بنو
میرے محبوب اگر تم پتھر نہ بن سکو
تو چاند بن جاؤ
ایک چاہنے والی عورت کے خواب میں فروزاں چاند

میں جن حالات میں رہتا ہوں اس پر جھنجھلاتا نہیں ہوں۔ ہر شام اپنے کمرے میں بیٹھا یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں کہ میرا رشتہ صرف آفتاب سے ہے کیونکہ رات کو میں اسرئیلی قانون کے تحت باہر نہیں نکل سکتا۔ خود سے کہتا ہوں کہ انہوں نے مجھے کیسی عزت بخشی ہے کہ میرا ناطہ روشنی سے جوڑ دیا ہے۔

ہر روز چار بجے مجھے تھانے جا کر اپنے وجود کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ میں دل میں کہتا ہوں ہم نے دن رات کو چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اُن کیلئے رات میرے لیے

دن ۔ہم جانتے ہیں کہ رات سے دن زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔زیادہ پر اُمید ہوتا ہے۔تو میں فائدے میں ہوں اور اسرائیلی پولیس نقصان میں۔

میں ہمیشہ چاہتا ہوں کہ قومی تعصب سے بالاتر رہوں ۔اور یہی وجہ ہے کہ جب میں نے A Soldier dreams white lilies لکھی اور مجھ پر دو تین شامی ادیبوں نے تنقید کی کہ یہ میری محض خیالی کردار نگاری ہے۔میں نے ان کی بات کو رد کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انسانوں کو ایک ہی پلڑے میں نہیں رکھا جا سکتا۔اِس خطے میں رہنے والے یہودیوں کے ساتھ بطور انسان تو کوئی لڑائی نہیں ۔لڑائی تو صرف عرب قومیت اور صیہونیت کے ساتھ ہے۔یہاں وہ اپنے یہودی دوستوں سے کہتا ہے۔

میرے وجود میں ایک دل کی ضرورت ہے
ایک بندوق کے میگزین کے وزن کی ضرورت نہیں
میں مرنے سے انکاری ہوں
اپنی بندوق کو محبت میں بدلتا ہوں

وہ سوال اٹھاتا ہے کہ آخر ہم کیوں یہ چاہتے ہیں کہ جذباتی اور جانب درانہ احساسات کی شاعری ہی تو ڑ ہے ۔نہیں یہ عقل سلیم کو قائل نہیں کرتی ۔ضرورت ہے کہ اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کیلئے اعلیٰ فنی معیار اپنایا جائے ۔جیسی میری نظموں نے دنیا میں میرے موقف کی بھرپور تائید کی ہے ۔"شناختی کارڈ" کو ہی دیکھیں۔

رجسٹر میں لکھو میں ہوں عرب
کارڈ کا نمبر ہے اکاون ہزار
میرے بچے آٹھ ہیں
اور نواں آنے کو ہے گرما کے بعد

تم نے ہی چھینے ہیں مجھ سے
باغ تھے جتنے میرے اجداد کے
اور چھینا ہے زمین کا وہ قطعہ
ہاں تو پہلے صفحے پر لکھو
مجھ کو انسانوں سے کوئی بغض یا نفرت نہیں
لیکن اتنا ہے کہ میرا رزق اگر چھن جائے گا
غاصبوں کا گوشت بھی کچا چبا جاؤں گا میں
بس ڈرو تم بھوک سے میری ڈرو
اور میرے غیظ و غضب سے ڈرو

یہی وہ نظم تھی۔ بیتا وقت ہوایا (شناختی کارڈ) جو نظارت کے سینما گھر میں پڑھی گئی اور جس پر خوفناک ردِ عمل سامنے آیا۔ دنوں میں یہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ایک احتجاجی گیت کے طور پر پوری عرب دنیا اور ترجمہ ہو کر یورپ میں پھیل گئی۔

سلام+شلوم بھی ایک ایسی ہی نظم ہے

تم جو دروازے میں کھڑے ہو
اندر آؤ
ہمارے ساتھ عرب قہوہ پیو
تمھیں احساس ہوگا
کہ تم ہماری طرح کے ہی انسان ہو
تم جو گھروں کے دروازوں میں کھڑے ہو
ہماری صبح کے اوقات میں

باہر تو نکلو

ہمیں بھی یقین آئے

کہ ہم بھی تمہاری طرح کے ہی انسان ہیں

محمود درویش نے دو شادیاں کیں اور دونوں نا کام ہوئیں۔ پہلی بیوی رعنا قبانی رائٹر تھی۔ دوسری شادی ایک مصری مترجم سے ہوئی۔ حیات ھینی۔ بچہ کوئی نہیں تھا۔ درویش کی نظموں کی دنیا ریٹا کون تھی؟ ریٹا کو ایک مفروضہ بھی کہا جا سکتا ہے جو ایک خاص عورت کی اشارے کنایئے میں عکاسی کرتا ہے۔ یہ نام ایک شدید خواہش، طاقت، ذہانت، کمزوری، دوری الغرض بہت سی علامتوں کے مظہر کے طور پر بھی اس کی شاعری میں ظاہر ہوا ہے۔ ایک جگہ اس کا اظہار دیکھیے کیسے ہوا۔

میں تو تم سے محبت کرنے پر

مجبور ہوا ہوں

اس لئے تھوڑی

کہ تم بہت ہی حسین ہو

بلکہ اس لئے

کہ تم بہت گہری ہو

خوبصورتی سے محبت کرنے والا

بالعموم بیوقوف ہوتا ہے

لیکن وہ دراصل ایک خوبصورت یہودی عورت تھی۔ جس سے وہ محبت میں اس وقت مبتلا ہوا جب وہ حیفہ میں رہتا تھا۔ یہی تعلق فلم "شناختی کارڈ" کا موضوع بنا جسے فلم ساز ابتسام مارانہ نے بنائی جو خود مسلمان تھی اور جسے ایک یہودی سے شادی کی تھی۔

شاید اس میں کہیں جھگڑے کا کوئی تاثر اُبھرتا ہو۔ جب قومی اختلاف جسم کو محبت کرنے اور محبت بھری کہانی بننے سے روکتا ہو۔ میری نظموں میں ریٹا وہی یہودی خاتون ہے۔ کیا یہ ایک راز ہے؟ یہ راز جسے میں کھولتا ہوں۔

ریٹا اور میری آنکھوں کے
درمیان رائفل ہے
وہ جو کوئی ریٹا کو جانتا ہے
وہ گھٹنے جھکاتا اور دعا مانگتا ہے
اُن شہد جیسی رنگت والی آنکھوں میں
الوہیت کے سائے ہیں
ہمارے درمیان ملین
چڑیاں اور خواب ہیں
اور بہت ساری ملاقات کی جگہیں
رائفل نے نشانہ لیا
لیکن اُس سے پہلے رائفل میری آنکھوں کو
تمہاری آنکھوں سے ہٹاتی
ایک یا دو لمحوں کی جھپکی
یا شہد رنگے بادل
اِن شہد رنگی آنکھوں کی
طرف بڑھ جاتے ہیں

اُس کی شاعری کے کوئی تیس 30 والیوم چھپ چکے ہیں۔ نثر کی تقریباً آٹھ

کتابیں ۔ پہلا مجموعہ "زیتون کی پتیاں" اور آخری "گیارہ سیارے" ہیں ۔ نو مجموعوں پر مشتمل کلیات بھی بہت بار چھپی اور لوگوں سے خراج حاصل کر چکی ہے ۔ اُس کے انٹرویوز اُس کے اہم مضامین بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں ۔

ایک جگہ درویش اپنے خیالات کا اظہار اس پیرائے میں کرتا ہے ۔ میں گلوکار میکیش تھیوڈوراکس سے بہت محبت کرتا ہوں ۔ وہ مجھ جیسا ہی ہے ۔ ایک دن میں نے پڑھا کہ اُسے گرفتار کر لیا گیا ہے ۔ میں نے اُس کی گرفتاری سے متاثر ہو کر Love me Rita لکھی ۔ نظم کے تعارف میں میں نے لکھا تھا کہ میکیش کی گرفتاری دراصل انتہاپسندی کی طرف اسرائیل کا بڑھتا ہوا رجحان ہے جو صحت مند نہیں ۔

اگلے چند دنوں میں میں بھی گرفتار ہو گیا تھا ۔ اُس کی روزمرہ کی ڈائری میں جو اُس کے درج کردہ واقعات ہیں ۔ وہ بھی کسی چھوٹے موٹے افسانے سے کم نہیں ۔ یہ اُس کے وہ دکھ ہیں جو ہیجان برپا کرتے ہیں ۔

اُس کی شاعری میں ، اُس کی نثری تحریروں میں فلسطین ایک استعارہ ہے ۔ اس کی محبوبہ ، اس کی جنت کا جو چھن گئی ۔ جلاوطنی اور گھر بدری کا غم اور اندر کے دکھ کا اظہار ۔ وہ جب جلاوطنی بارے لکھتا ہے تو گویا پوری دنیا کا نمائندہ بن جاتا ہے ۔

اُس کی شہرہ آفاق طویل نظم "عاشق من الفلسطین ہے ۔" نظم کی جو محبوبہ ہے وہ دراصل سرزمین فلسطین ہے ۔ شاعر نے کیسے اپنا دل چیر کر اپنا درد اس میں سمو دیا ہے ۔

ہمارا ملک وہ ملک ہے جس کے ہم ملک بنتے ہیں
اس کے پرندے ، اس کے پھل پھول
اس کی سب جان دار اور بے جان چیزیں
ہمارا ملک ہماری جائے پیدائش

ہمارے آبا و اجداد کی
ہماری آنے والی نسلوں کی
ہمارا ملک تو وہ ہے
جہاں ہمارے لوگ
آگ اور راکھ سے
اس کے گرد بنفشی باڑ بناتے ہیں
اس انداز سے
کہ ایک جنت
اور ایک جہنم

اُسے فلسطین کی انسانیت کا پیغمبر کہا گیا۔

ایک اور جگہ دیکھیے۔

میں نے تمہارا چہرہ پانیوں میں دیکھا
چاند کی طرح خاموش اور ساکن
کھیتوں میں تمہیں پایا
لہولہو میں ڈوبے ہوئے

اسرائیلیوں کیلئے محمود کا نام فلسطینی قوم پرستی کا دوسرا نام ہے۔ حالانکہ اس کی شاعری تعصب سے بہت بلند ہے۔ مگر اس کے لفظ ہی اس کا ہتھیار بن گئے تھے۔ وہ کہتا ہے۔

"ہمیں لفظ لکھنے کی ضرورت ہے۔ ہر سوچ اور نظریے سے اوپر اٹھنا ہے۔ سیاسی پارٹیاں ہوں یا اسلامی جہادی تنظیمیں۔ اتحاد کے لئے لفظ لکھنے ہیں۔ دنیا کو بتانے کے لئے،

ان کا سویا ہوا ضمیر جگانے کے لئے ، ذہنوں کو متاثر کرنے کے لئے۔ مدلل تحریر ذہن میں کھلبلی مچا دیتی ہے۔ہم جیسے لوگوں کو قلم کی تلوار اٹھائی ہے۔سادہ مگر گرفتار کرنے والے لفظ جو یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی ثقافتی بنیادوں کے ڈھانچوں پر کھڑے ہوں۔"

دنیائے عرب میں گزشتہ نصف صدی کی نسل میں محمود درویش ایک عظیم شاعر کے طور پر جانا اور مانا گیا ہے۔عربی کے چوٹی کے سات آٹھ شعرا میں سے وہ ایک ہے جس نے اپنی زندگی میں بہت سارے ایوارڈز کے ساتھ افریشیائی اہل قلم کا ادبی ایوارڈ" لوٹس" بھی حاصل کیا۔اُس کی نظموں کے ترجمے دنیا کی ہر اہم زبان انگریزی، فرنچ، روسی، اطالوی، جرمن، بلغارین کم از کم بیس زبانوں میں ہو چکے ہیں۔جنہیں بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

وہ المتنابی اور خلیل جبران سے بہت متاثر تھا۔جدید شاعروں میں نظار قبانی، گارشیالورکا، پابلونرودا، Yeats اور ڈیرک والکوٹ کا عاشق تھا۔

اسرائیل کے وزیر تعلیم نے محمود درویش کی پانچ نظمیں اسرائیلی سکولوں میں اختیاری مطالعے کے طور پر چاہا کہ شامل کی جائیں۔یوسی سارد کا کہنا تھا کہ ایک دوسرے سے لاتعلق اچھے پڑوسیوں کے زمرے میں نہیں آتی۔مگر حکومتی ارکان نے سخت مخالفت کی۔

اِس خوبصورت شاعر کا کلام اس کے اندر کے کرب کا غماز ہے۔اس نے اپنے کام سے عشق کیا۔اِسے عبادت جانا۔اُس کی شاعری اُسکی تاریخی ،اجتماعی اور ذاتی ماضی کے اثاثے پر مبنی ہے۔یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُس کے مادر وطن کے عکس نظر آتے ہیں۔"قید او رمحاصرے میں"

ذرا دیکھیے۔

زمین ہمارے اوپر تنگ ہو رہی ہے

ہم کہاں جائیں گے
اس آخری سرحد کے بعد
پرندے کہاں اُڑیں گے
اس آخری آسمان کے بعد

1988ء میں اس کی ایک نظم Passing between the passing words نے بڑا طوفان اٹھایا۔ یہ اسرائیلی کنیسٹ Knesset میں بھی زیر بحث آئی۔

ہماری زمین کو چھوڑ دو
ہمارا ساحل، ہمارا سمندر
ہماری گندم اور ہمارا نمک
اور
ہمارے زخم

☆☆☆

سلمیٰ اعوان
0301-4038180
www.salmaawan.com